عورت

زبانِ خلق سے زبانِ حال تک

عورت سے متعلق ۲۶ موضوعات پر منفرد تحقیقی مضامین

کشور ناہید

انتخاب و ترتیب : کشور ناہید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

305.4 Kishwar Naheed
Aurat : Zubaan-i Khlq Say Zubaan-i Haal Tak/ ed. by Kishwar Naheed.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2010.
356pp.
1. Urdu Literature. 2. Aurat - Samaaji Masail. I. Title.

2010
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-0309-0
ISBN-13: 978-969-35-0309-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 37220100-37228143 Fax: 37245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ترتیب

دوست اور بزرگ اختر حمید خان کے نام

ابتدائیہ

جب میں پیدا ہوئی اس وقت سے یہ کتاب میرے بطن میں تھی کہ عمر کی کوئی سیڑھی بھی چڑھتی تھی اور تجربے کی کوئی کھڑکی بھی میں کھولتی تھی۔ وہاں ایک سا منظر نظر آتا تھا' بہت ظالم اور روح فرسا منظر' آپ کے ساتھ کوئی بحث کر کے اور دلائل دے کر قائل کر دے تو یہ بات کو سمجھنے اور سمجھانے کا منطقی استدلال ہوتا ہے۔ مگر جہاں آپ کو سرے سے نظر انداز کرنے اور ممکن ہو تو (مشرقی تہذیب میں خصوصیت سے) تمسخر اڑانے کی اساس ہر زاویے سے کارفرما نظر آئے تو سوچ' بھنا اٹھنے اور غصے کی دہلیز سے آگے نکل جاتی ہے۔

یہ کتاب دہلیز سے آگے کا حصہ ہے۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ یہ پوری کتاب میں خود تحقیقی مواد کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کروں گی۔ کتاب کا خاکہ بھی تیار کر لیا' لکھنا بھی شروع کر دیا۔ جیسے جیسے آہستہ آہستہ بات آگے بڑھی تو پھر معترضوں کے چہرے ابھرنا شروع ہوئے۔ میری تحقیق کردہ کتاب میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اتنے حوالے ہوتے کہ میری اپنی تحریر اور اس سے نکالے گئے نتائج کتاب کو بہت ضخیم کر دیتے۔ ویسے بھی موضوع اور استدلال صرف ایک شخص کی زبانی سامنے آئے تو قبول کرنے کی سطح اور ہوتی ہے اور اگر ہر ملک اور ہر سر زمین پہ سوچنے والوں کی موضوعاتی تحریروں کو یکجا کیا جائے تو سملاز اور طرح کا بنتا ہے۔

میں نے مضامین منتخب کرتے ہوئے' موضوعات اور متن کو زیادہ اہمیت دی۔ صنف یا ملک کو کم۔ میرا ارادہ صرف عورتوں کے موضوع پر عورتوں کی تحریروں کو یکجا کرنا نہیں تھا۔ معاشرتی رویوں میں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کرنا' صرف ایک جنس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر سنجیدہ فکر شخص' معاشرتی توازن کے فقدان کو انسانی وجود کے لئے رد تخلیق کے مترادف سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہ کتاب یک رخی مطالعہ یا بے بسی کی چیخ نہیں ہے۔

اسلام اور مذہب کے موضوع پر ایک سے زائد مضامین ہیں۔ اسلامی ممالک میں جس طرح گزشتہ پندرہ برسوں میں بنیاد پرستی کو ابھارا گیا اور اب اسی بنیاد پرستی کو معتوب قرار دینے کے لئے سیاسی سطح پر مسلمانوں کی باہمی آویزش کو جس طرح ہوا دی جا رہی ہے اور عورتوں کے خلاف مذہب کی تفسیر کو ڈھال بنانے کا جو عمل چودہ سو سال سے جاری ہے۔ اس پر روشن دماغ محققین کی رائے

سامنے لانا ضروری تھا۔

منتخبہ مضامین کا ترجمہ کراتے ہوئے بھی یہ التزام رکھا گیا کہ ترجمے یا اصلاحات کے انتخاب میں منطقی پہلو اوجھل نہ ہو جائے اور پوری کتاب اس سوال کے جواب کے لئے راستہ بنا سکے کہ ساری دنیا کی تحقیق و ترقی، محض 50 فیصد آبادی کی نفسیات اور ضرورتوں کا حصار کرتے ہوئے کیوں اس نکتے پر غور نہ کر سکی کہ ساری دنیا کے معاشروں کو مرد محافظ اور عورت محفوظ کے دائرے سے نکال کر، جیتے جاگتے انسانوں کے اجتماعی مسائل اور نفسیات کی شکل میں مدون کیا جائے۔

اس مجموعے میں کچھ مضامین کتابوں سے لئے گئے ہیں اور کچھ خاص موضوعات پر تحقیق کے ذریعے لکھوائے گئے ہیں۔ چند مضامین میں برصغیر کے بنیادی حوالے ہیں، دیگر مضامین میں بین الاقوامی منظر کے توسط، عورت اور مرد کے مقام کا تجزیہ کیا گیا ہے اور تضادات کو سامنے لایا گیا ہے۔ بیشتر مضامین کی فضا ایک ہی ناآسودگی کا اظہار ہے کہ عمرانیات سے لے کر میڈیسن تک کسی بھی شعبے میں رائج تعصبات تحلیل نہ ہو سکے اور اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔

اس مجموعے کی اشاعت میں ہالینڈ کے شعبہ سفارت پاکستان اور ادارہ سنگ میل نے بہت تعاون کیا۔ یہ ان دونوں اداروں کی محبت تھی کہ میں اتنا طویل سفر طے کر سکی۔ مجھے اپنے دوستوں کا بھی بہت شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان کی تحریروں نے اس کتاب کو موثر مسودہ بنا دیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے مسعود اشعر اور شفقت تنویر مرزا نے اپنا وقت دیا۔ ترتیب میں موضوعات کے تخصیصی عنوانات لکھے گئے ہیں۔ ان موضوعات پر مضامین لکھتے ہوئے چند مصنفین / مترجمین اور محققین نے اپنے طور پر عنوانات متعین کئے۔ ہم نے وہ بھی قائم رکھے کہ یوں لکھنے والے کے موڈ کا آپ کو بھی اندازہ ہو سکے۔

یہ 26 مضامین، ہزاروں سال کی موجود تاریخ کی حق تلفیوں کا مداوا تو نہیں کر سکتے البتہ لغت اور استعارے کی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

کشور ناہید

8 مارچ 1993ء

عورت کے خلاف جنگ —— ہر محاذ پر

میریلین فرنچ

انسانی تاریخ کے بارے میں مقبول تصور یہی ہے کہ انسان کی ابتدا وحشت و بربریت سے ہوئی' عہد وحشت میں مرد عورت کو بالوں سے گھسیٹ کر غاروں میں لے جاتے تھے انسان اسی عہد سے ترقی کرتے ہوئے موجودہ تہذیبی دور میں آیا' جب مرد احتراماً عورتوں کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ اصل حقیقت اس کے الٹ ہو۔ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساڑھے تین کروڑ سال پہلے انسان امداد باہمی جیسے معاشروں میں رہتے تھے' عورت اور مرد برابر تھے' بلکہ عورت کو مرد کے مقابلے میں زیادہ مرتبہ اور تکریم حاصل تھی۔ دس ہزار سال پہلے کے آثار قدیمہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دیویوں کی پوجا کرنے والے معاشرے کے لوگ مساوی بنیادوں پر مکمل ہم آہنگی سے رہا کرتے تھے اور خوشحال بھی تھے۔ ہو سکتا ہے جنگوں کا آغاز بھی دس ہزار سال پہلے ہی ہوا ہو لیکن ان کا اصل آغاز حضرت عیسیٰ کی وفات سے چار ہزار سال پیشتر اس وقت ہوا جب پدر سری یا پدری معاشرہ تھا جس میں زور اور طاقت کی بنا پر مرد کی بالادستی قائم کی جانے لگی اور غالباً ایسا معاشرہ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ میں قائم ہُوا۔ مردوں نے خود کو "مرد عظیم" بنانا شروع کیا اور دوسروں کے وسائل اور محنت پر قبضہ جمانے لگے۔ دیویوں کی جگہ دیوتاؤں کو لینے کے لئے ہزاروں سال لگے اور مذہبی پروہتوں نے ایک طرف خود مختار معاشروں کو زیر کرنا شروع کیا اور دوسری طرف دنیا پر غلبہ پانے لگے۔ ریاست کے وجود میں آنے کے بعد زرعی معاشروں میں سب سے زیادہ ٹیکس کسانوں کو دینا پڑا جو اہم پیداکار تھے۔ یعنی ریاست کے ٹیکسوں کا بوجھ بھی ان پر پڑا اور ریاست کی اشرافیہ (مفت خورے) بھی انہی کی محنت کے حاصل پر عیش کرنے لگی' ان کسانوں سے سرکاری زمینوں اور کاموں پر جبری بیگار بھی لی جاتی

تھی ان پر ظلم و ستم سپاہی کرتے تھے اور ان کسانوں کو ان سپاہیوں اور ان کے ہتھیاروں کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔

تب سے عورتوں کے لئے یہ ترقی معکوس تو مسلسل چلی آ رہی ہے۔ غالباً سب سے پہلے غلام عورتیں ہی بنی تھیں۔ قدیم معاشروں میں عورتوں کی اشرافیہ بھی تھی۔ عورتیں بڑے اختیارات کی مالک تھیں مگر ان کو انہی کے طبقے کے مردوں نے زیر کیا۔ اسی وقت سے اب تک عورتوں نے نہ صرف یہ کہ ترقی نہیں کی' الٹا ان کو بے اختیار کیا گیا' ان کی تذلیل ہوئی اور انہیں محکوم بنا لیا گیا۔ یہ رجحان گذشتہ چار سو سال سے بڑی تیزی سے بڑھا۔ جب مرد خصوصاً مغرب کے مردوں کو فطرت اور دوسرے مظاہر فطرت' یعنی رنگ دار لوگوں اور عورتوں پر غلبہ پانے کا بے پایاں جنون ہو گیا۔ یورپی مردوں نے چودھویں صدی میں ہی ایسے بڑے بڑے جہاز بنائے جو دنیا کا چکر کاٹ سکیں' اور پھر سو برس بعد پندرھویں صدی کے آخر میں انہیں استعمال کیا جانے لگا۔ ان کے سفر دریافت کے پیچھے ایک تجسس بھی تھا اور دولت اور شہرت حاصل کرنے کی ہوس بھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کے چند ایک انتہائی المناک باب تحریر کئے۔ تخریب اور طاقت کے زور پر انہوں نے افریقہ' ایشیاء' مشرق وسطیٰ اور جنوبی بحرالکاہل کے علاقوں اور امریکہ (شمالی جنوبی اور وسطی) کے لوگوں کا استحصال کیا' لوگوں کو قتل کیا' غلام بنایا یا محکوم کیا اور ان علاقوں کے وسائل پر قبضہ جمایا۔

اس سے اگلی صدی میں انہوں نے چرچ کی طرف سے عائد پابندیوں کو ایک طرف رکھ کر تجرباتی سائنس کا آغاز کیا اور جواز یہ دیا کہ بائبل میں درج ہے کہ انسان فطرت اور اس کے مظاہر کو مسخر کرے۔ یوں مرد عقل و دانش میں کچھ اور آگے نکلے۔ ان کی اس کارکردگی سے ٹیکنالوجی کو نئی بنیاد ملی' جو ان کی نظر میں انسان کے لئے بہت سودمند ثابت ہونا تھی اور آخرکار اسی کی کوکھ سے صنعتی انقلاب نے جنم لیا۔ صنعتیانے سے یقیناً فائدے ہوئے' خصوصاً ایک چھوٹے سے گروہ کو۔ مگر اس عہد نے انسانوں کی اکثریت کو ذلتوں اور محرومیوں کی گہری پستیوں میں گرا دیا۔ انگلینڈ میں یہ ہوا کہ جاگیرداری آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ اور سرمایہ داری اس کی جگہ لینے لگی۔ زمینوں سے کسانوں اور مزارعوں کی وسیع

پیمانے پر بے دخلی ہوئی اور وسائل پر قابض اشرافیہ نے ان بے گھروں اور بے دروں کو معاشرے کے نئے محاصل اور فوائد میں سے حصہ نہیں لینے دیا۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب لانے میں ان غریبوں کا بھی خاصا حصہ ہے۔ اسی طبقے کو بعد میں مارکس نے پرولتاریہ کا نام دیا تھا۔ مختلف وجوہ کی بنا پر پورے یورپ میں بے شمار لوگ زرعی معیشت سے الگ کر دیئے گئے۔ جو بے چہرہ اور بے وسیلہ پرولتاریہ کا حصہ بنے' ان میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی۔

جنہوں نے سرمایہ دارانہ معیشت کو اپنایا' وہ ایک نئی قسم کی اشرافیہ بن گئے۔ متحرک اور چوکس طبقہ ——— افراد کو عزت و اختیار میں عروج اور زوال آتا رہتا ہے مگر یہاں عروج مسلسل تھا اور وہ بھی صرف سفید فام مردوں پر مشتمل اشرافیہ کا ——— اس طبقہ سے منسلک عورتیں مردوں کی دولت سے فیضیاب ہوئی ہوں گی' مگر وہ اپنے مردوں کے اقتدار میں شریک نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی تک پوری دنیا کے لوگ اس چھوٹی سی اشرافیہ کے کارکن یا وفادار محکوم بن چکے تھے اور تقریباً ساری ہی عورتیں مردوں کی محکوم ہو چکی تھیں۔ مرد صدیوں کی انتھک کوششوں کے سبب عورت کو قعرِ مذلت میں دھکیل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ عورتیں تقریباً سبھی انسانی حقوق ——— سیاست کا حق' ترکے میں حصے کا حق' جائیداد رکھنے کا حق' یا اپنے طور پر کاروبار کرنے کا حق گویا تمام حقوق ——— سے محروم ہو گئیں' حتیٰ کہ انہیں اپنے جسم پر بھی مکمل حق اور اختیار حاصل نہ تھا۔

محکوم اور مطیع بنانے کے عمل میں نفرتیں پیدا ہوتی ہیں اور گذشتہ دو صدیاں اسی نفرت سے جنم لینے والے انقلابوں سے بھری پڑی ہیں۔ چنانچہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع میں یورپ اور امریکہ میں کارکنوں اور خواتین کے حقوق کی تحریکیں سمندری موجوں کی طرح پھیل گئیں جن کے سبب ایشیا اور افریقہ میں بیسویں صدی کے وسط میں قوم پرستانہ بغاوتوں اور جدوجہد کو تقویت حاصل ہوئی۔

مزدوروں اور کارکنوں نے دنیا کے وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور استحصال کے نظام کے خلاف آوازِ بلند کی اور مطالبہ کیا کہ جو وہ پیدا کرتے ہیں اس میں سے انہیں ان کا حصہ ملنا چاہیے۔ تب بھی اور آج بھی زیادہ تر وسائل پر ایک چھوٹی سی اشرافیہ کا قبضہ

ہے اسی سبب سے سیاسی کنٹرول بھی اس کے ہاتھوں میں ہے۔ مزدوروں کی تحریک پر سوشلسٹ تصورات کا غلبہ تھا جو انیسویں صدی میں وسیع پیمانے پر مقبول ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں (Owenite) اوینائٹ علاقوں میں پہلے سوشلسٹ تجربے ہوئے اور ان میں عورتوں کے حالات کار بہتر بنانے پر خاص توجہ دی گئی۔ لیکن یورپ میں ابتدائی طور پر سوشلزم کا مقابلہ کاریگروں کی گلڈوں سے منسلک رہا جن کو صرف اپنے حقوق و اختیار سے مطلب تھا۔ تاہم جب تک سوشلزم پر مارکسزم کا غلبہ رہا تب تک سوشلسٹوں نے بھی عورت کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی اور عورت تن تنہا یا کبھی خاوند کی مدد سے' ان مسائل' یعنی بچے پالنے' گھرداری اور گھر کو چلانے کے لئے محنت کرنے کے تین فرائض سے نمٹ رہی تھی ——

معاشی تنگی اور سیاسی طور پر بے نوائی کے سبب انیسویں صدی میں درمیانے طبقے کی عورتوں نے تحریک نسواں کے حوالے سے اور کارکن عورتوں نے ان مزدور تحریکوں کے ذریعے آواز اٹھانا شروع کی جو کہیں انتشار پسندانہ' کہیں اشتراکی' کہیں اشتمالی اصولوں پر کھڑی ہوئی تھیں' اس زمانے میں عورتوں کا سرعام بولنا یا تقریر کرنا بھی مردانہ ضوابط کو گوارا نہ تھا۔ اگرچہ یہ مزدور عورتیں تحریک نسواں کو نہیں مانتی تھیں مگر وہ اپنی باتوں اور افعال سے تحریک کا ہی کام کر رہی تھیں۔

بیسویں صدی میں سوشلزم وسیع پیمانے پر نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ بعض ممالک میں سوشلسٹ انقلاب آئے اور آمروں کے تختے الٹ کر "پرولتاریہ کی آمریت" قائم کر دی گئی۔ سوشلزم کے خوف کے باعث اور اسے روکنے کے لئے اشرافیہ نے بعض ممالک میں جابر آمروں کی امداد کی۔ جنہوں نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کیا۔ فوج اور زرداروں کے مفادات کو تقویت بخشی۔ جمہوری نام کی ریاستوں میں خوفزدہ حکمران طبقے نے مزدوروں کے مطالبات پر بات چیت جاری رکھنے کے لئے قانونی طور پر ٹریڈ یونینیں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

سوشلسٹ ریاستوں میں عورتوں کے خلاف قانونی امتیازات ختم کر دیئے گئے' مگر مردوں کو یہ سکھانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ نئی نسلوں کی پرداخت اور خانہ داری کی ذمہ داریوں میں بھی شریک ہوں۔ فاشسٹ حکومتوں نے تو خواتین کے مسئلے کا یہ حل تلاش

کیا کہ عورتوں پر مردوں کا کنٹرول اور بھی سخت کر دیا' اور ان کے فرائض کو گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا۔ سرمایہ دار حکومتوں اور مردوں کی بالادستی والی ٹریڈ یونینوں میں اس مسئلے پر مفاہمت رہی کہ عورتوں کو حقیر معاوضہ دیا جائے اور ان سے انتہائی معمولی کام لئے جائیں۔ ہر کہیں عورتوں کو باعزت معاوضہ پر کام دینے سے اس لئے انکار کیا گیا کہ ان کے مرد ہی اصل میں ان کے کفیل ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ سارے مرد اپنی عورتوں اور اہل خانہ کے کفیل نہیں ہوتے اس لئے ایسی عورتیں اور ان کے بچے افلاس کی طغیانی میں گھرے رہے۔

عورتوں کے حقوق کی حمایت میں فکر و خیال کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ کرسٹین ڈی پیان میری وولسٹونیکرافٹ' جارج سینڈ اور بیسیوں دوسری لکھاری خواتین نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا اور پھر انقلاب فرانس میں سے حقوق نسواں کی تحریک بھی پھوٹ پڑی۔ تاہم سیاسی حلقوں میں بڑے پیمانے پر یہ تحریک 1848ء سے اور امریکہ کی سینیکافالز تحریک سے شروع ہوئی۔ مزدوروں کی تحریک کے مقابلے میں خواتین کی یہ تحریک چھوٹی بھی تھی اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی بھی مگر یہ زیادہ خطرناک بھی تھی۔ اس تحریک سے صرف اشرافیہ کے مرد ہی نہیں' تمام مرد زچ ہونے لگے کیونکہ اس سے گھروں میں عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہونے لگا' مزدوروں کی تحریک کے برعکس اس تحریک نے مردوں کو اس پہلو سے جا لیا جہاں وہ کمزور تھے۔ اس صدی میں حقوق نسواں کی تحریک نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انہیں تعلیم' سیاسی حقوق اور ملازمتوں تک رسائی حاصل ہوئی' دوہرے معیار قائم کرنے والے قوانین کو ختم کرایا جو زیادہ تر صنعتی اور سوشلسٹ ممالک میں رائج تھے۔ اس تحریک کی اتنی صورتیں اور ان میں اتنا تنوع ہے کہ بعض دانشور اسے تحریک کی بجائے تحریکیں کہتے ہیں —— یعنی فیمینزم نہیں فیمینزمز۔ بہرطور حقوق نسواں کی تحریک سے اپنی وابستگی کی بنا پر میں اس کی تعریف یوں کروں گی زنانہ پس منظر میں خواتین کے اتحاد کے ذریعے کسی بھی گروپ کی عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے کا نام تحریک نسواں یا Feminism ہے۔ اگر عورتوں کے خلاف صف آراء طاقتوں کے اتحاد و اتفاق کے حوالے سے عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے میں ہونے والے کام کو دیکھا جائے تو یقیناً اسے انتہائی تابناک کامیابی قرار دیا جائے گا۔

بالائی طبقے منظم مزدوروں کو شکست دینے کے لئے مختلف حربے آزماتے ہیں۔
کبھی کارخانے ایک علاقے سے ایسے دوسرے علاقے میں اور کبھی ایک ملک سے دوسرے ایسے ملک میں منتقل کرتے رہتے ہیں جہاں مزدور منظم نہیں ہوتے۔ ٹرانسنیشنل (کثیرالقومی) کارپوریشنیں بناتے ہیں اور ان کے ذریعے ایسے ملکوں میں کارخانے لگاتے ہیں جہاں زیادہ پابندیاں بھی نہیں اور جہاں پر سستا خام مال ملتا ہے۔ یہ کارپوریشنیں اتنی بڑی اور کارگر ہوتی ہیں کہ حکومتوں تک پر کنٹرول حاصل کرلیتی ہیں۔ (ان میں سے بعض خصوصاً امریکہ اور انگلستان کی کارپوریشنوں نے تو یونینوں کو برباد کرنے کی کوشش کی) چنانچہ یہ مزدوروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ میں مزدوروں اور کارکنوں (مردوں) کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا' اور حالات کار بہتر ہوئے' 1955ء میں ان کی اوسط آمدنی پندرہ ہزار چھپن (15056) ڈالر تھی جو 1973ء میں بڑھ کر چوبیس ہزار چھ سو اکیس (24621) ہوگئی۔ مگر 1987ء میں افراط زر کے حوالے سے ان کی اصل اوسط آمدنی انیس ہزار آٹھ سو انسٹھ (19859) ڈالر رہ گئی یعنی اصل آمدنی میں انیس فیصد کمی ہوئی۔ 1980ء تک متعدد شادی شدہ عورتوں نے کنبے کی آمدنی میں اضافہ کی خاطر ملازمت اختیار کرلی مگر 1988ء میں دو تنخواہوں کے باوجود 1973ء کی ایک تنخواہ کے مقابلے میں صرف چھ فیصد اضافہ ہوا۔ بزنس پالیسیاں اس قسم کی بن رہی ہیں کہ جو زیادہ تنخواہوں والی اسامیاں تھیں اور جو ٹریڈ یونینوں کے ساتھ معاہدوں میں شمار کی گئی تھیں وہ آہستہ آہستہ ختم کی جا رہی ہیں۔ ایک معاشی ماہر نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا ہے۔ "ذرا مشکل کام مگر زیادہ تنخواہ والی ایک اسامی سے جس کے ساتھ صحت کی انشورنس بھی لازم ہے' بہتر ہے کہ دو ایسی اسامیاں رکھی جائیں جن پر مراعات (از قسم ہیلتھ انشورنس) کوئی نہ ہوں۔"

سرمایہ دار بالائی طبقہ محنت کشوں خصوصاً سوشلزم کو شکست دینا چاہتا تھا مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ انہی حکومتوں نے سوشلزم کو شکست دے دی جن سے توقع تھی کہ وہ سوشلزم کو مستحکم اور پرمایہ بنائیں گی۔ کیونکہ سرمایہ داریوں کا جانشین سوشلسٹ بالائی طبقہ بھی اتنا ہی جابر اور استحصال کرنے والا تھا۔ بیسویں صدی نے ہمارے عہد کی مزدور تحریکوں کی اس شکست کا بھی تماشا کرلیا جو حتمی اور آخری لگتی ہے۔ کیونکہ لگتا ہے کہ

سوشلسٹ حکومتوں کے خاتمہ نے سوشلزم کا اعتبار بھی گنوا دیا ہے۔ اس کے باوجود کارکنوں کی جدوجہد جاری ہے۔ مزدور تحریک تباہ نہیں ہوئی۔ اگر یہ دنیا بھر کی معاشی چالوں کو جان گئی تو پھر ہم توقع کر سکتے ہیں کہ کشمکش جاری رہے گی۔

بعینہ مرد —— اشراف یا کارکن —— بطور ذات' خواتین کی کامیابیوں (اسقاط حمل کی قانونی اجازت) کو بے معنی بنانے کے لئے مختلف حربے اختیار کر رہے ہیں مثلاً عورتوں کو کم تنخواہوں والی اسامیوں پر محدود رکھنا (پیشہ ور عورتوں پر بھی کوٹے کے ذریعے پابندی لگانا) اور عورتوں کو کم تر درجہ پر لے جانے کے لئے ایسی تحریکیں (بنیاد پرستانہ یا مذہبی) شروع کرنا۔ مشترکہ خاندان اور برادری کے کنٹرول کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہر جگہ مرد اپنے بچوں کی پرورش وغیرہ میں اکثر ناکام ہو رہے ہیں اور عورتوں —— بیٹیوں' بیویوں' معشوقاؤں' ماؤں' بہنوں اور مہمان یا ناواقف عورتوں —— پر تشدد کرتے ہیں۔ مرد اپنے دیرینہ مقاصد کو پورا کرنے کے لئے نئے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً حمل کے تھوڑی دیر بعد یہ پتہ کرا لیا جاتا ہے کہ ہونے والا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی اور اگر لڑکی ہے تو حمل گرا دیا جائے' پھر حمل کی نئی تکنیک کہ ایسے بچے پیدا کریں جن کو وہ مکمل طور پر اپنا کہہ سکیں (یعنی دوسری عورت کے بطن میں اپنا مادہ تولید رکھ کر بچے پیدا کرنا ہے' (وقتی بیویاں بنانا) یہ حرکتیں دراصل عورتوں کے خلاف عالمی جنگ کے مترادف ہیں۔

اس جنگ کا مدعا یہ ہے کہ مردوں کا عورتوں کے جسم پر کنٹرول دوبارہ زیادہ موثر اور سخت ہو' خصوصاً اس کی جنسی اور پیداواری صلاحیتوں اور اس کی محنت پر کنٹرول ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ نہ تو تمام عورتیں مائیں ہیں اور نہ ماں بننا چاہتی ہیں مگر اکثر عورتیں مائیں ہیں اور صرف عورتیں ہی مائیں ہوتی ہیں۔ ماں بننے کا مطلب ہے ذمہ داری قبول کرنا اور عورت نے روز ازل سے ہی انسانی نسل کی بقاء اور بہتری کی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ یہ ان کا من مرضی کا انتخاب ہے وہ یہ فریضہ اس لئے سرانجام نہیں دیتیں کہ وہ ہارمونز یا جینیز کے حوالے سے اس کے لئے وضع کی گئی ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ کام لازمی ہے۔ اس ضرورت کی نوعیت سمجھنے کے لئے نومولود بچے پر صرف ایک نظر ڈالنا ہی کافی ہے۔ اگر صنعت کاری' برابری اور آزادی کے افکار عام ہونے گے اور ٹیکنالوجی کی بنا پر عورتوں کے لئے اس بے مزد یا بے مروت فعل سے بچنا ممکن ہو گیا' تو اب زیادہ سے

زیادہ عورتیں اس فعل سے اجتناب کر رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مرد پریشان ہوگئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی نہ کسی کو یہ کردار ادا کرنا ہے۔ ورنہ ان کی نسل تباہ ہوجائے گی۔ انہیں متبادل طریقے اختیار کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ وہ خود یہ کردار ادا کریں (ناقابل برداشت) وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لئے عورتوں کو مناسب صلہ دینا ہوگا (ناگوار) یا وہ ہر دستیاب طریقہ آزما کر یعنی عرض گزار کر، مطالبہ کرکے اور مجبور کرکے عورتوں سے یہ کردار ادا کروائیں اور انہیں اپنے زیر نگیں رکھیں؟

اکثر مرد آخری طریقہ اختیار کرتے مگر اس کی قیمت پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ جس طرح مرد دور رس نتائج کو ملحوظ رکھے بغیر دوسری قوموں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ وہ عورتوں پر یہ جانے بغیر ظلم کرتے ہیں کہ اس طرح وہ انسانی نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔ مرد یہ بات یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ عورتیں بچے پیدا کرنے ان کی پرورش اور معاشی اور ذاتی اعتبار سے ان پر توجہ دینے کا کردار جاری رکھیں۔ (یہ بیان ان مردوں کو ناگوار گزر سکتا ہے جو معاشی طور پر اپنے خاندانوں کے کفیل ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ صنعتی اور غیر صنعتی ممالک میں مردوں کی کثیر تعداد ایسا نہیں کرتی یعنی اپنے کنبے کی معاشی مدد نہیں کرتے۔ (اس تحریر میں انفرادی طور پر کسی مرد کے خلاف کوئی بات نہیں کی جا رہی۔ یہ باتیں عالمی سطح پر اکٹھی کی گئی باتوں پر مبنی ہیں مگر یہ اس معاشرے کا جرم ہے جو مرد نے بطور ذات یا قوم ایجاد کیا اور اسے قائم رکھا ہے۔)

میرا یقین ہے کہ پدر سری معاشرے کا آغاز اور پھیلاؤ دراصل عورتوں کے خلاف ایک طرح کی جنگ ہے۔ شروع میں بچے پیدا کرنے میں مرد کے کردار کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور معاشرے میں مردوں کی حیثیت بہت کم تھی ـــــ سب کچھ عورتیں کرتی تھیں جیسا کہ مختلف معاشروں میں وہ اب بھی کر رہی ہیں۔ وہ بچے پیدا کرتی تھیں پھر انہیں پالتی پوستی تھیں، غذا اکٹھی کرتی تھیں یا پیدا کرتی تھیں اور غالباً اجتماعی فیصلوں میں ان کی رائے غالب ہوتی تھی۔ یہ صورتحال تقریباً بیس لاکھ سال تک جاری رہی ہے کہ نیزہ بھالا ایجاد ہوا اور شکار کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدائی زمانے میں انسان اجتماعی طور پر شکار کیا کرتے تھے بعد میں آہستہ آہستہ مردوں نے سارا کام خود سنبھال لیا۔ دست و بازو میں زیادہ زور ہونے کے باعث وہ بہتر شکاری تھے پھر وہ اس پر زیادہ توجہ دے

سکتے تھے جبکہ بچوں میں مصروف عورتیں اتنی توجہ نہیں دے سکتی تھیں' حتیٰ کہ لوگوں نے ماننا شروع کیا کہ مرد بچوں کا باپ ہے اور وہ بچوں کو پالتا بھی ہے (یہ نشاندہی نو سے سات ہزار سال قبل مسیح اناطولیہ کے آرٹ ورک میں کی گئی ہے) اس کے باوجود معاشرتی انتظام و انصرام ویسا ہی رہا۔

شواہد اور عقل سلیم متذکرہ مفروضوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بے شمار بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ لوگوں (غالباً عورتوں) نے خوردونوش کی اشیاء اکٹھا کرنے کی بجائے فصلیں اگانا شروع کیں جس سے آبادی بڑھنے لگی' آبادی بڑھ کر دنیا پر پھیلنے لگی تو شکار کے مواقع کم ہوتے گئے' شکار کے ذریعے غذا حاصل کرنا غیر یقینی ہوگیا۔ مردوں کی واحد اہمیت کم ہونا شروع ہوئی۔ اپنا مرتبہ اور مقام بحال کرنے کے لئے انہوں نے شکار کے گروہ قائم کئے عورتوں کو ان حلقوں سے باہر رکھا گیا (اگرچہ وہ اس وقت مانتے تھے کہ حیات انسانی کا سرچشمہ عورتیں ہی ہیں مگر غالباً ان کے بارے میں یہ خیال بھی تھا کہ وہ شکار کم کرسکتی ہیں یا ان کی وجہ سے شکار کم ہوتا ہے) پھر آہستہ آہستہ دیوتاؤں کو پوجنا شروع کیا (شکار پر انحصار کرنے والی تمام سوسائٹیوں میں شکار کے حلقے' گروہ بنے ہوئے تھے) مگر جو لڑکے بطور شکاری نہیں بلکہ بطور کاشتکار سامنے آئے۔ ان میں پرانے مردانہ اتحاد کا جذبہ کم تھا۔ لڑکیوں کے بلوغت کو پہنچنے کی نقل کرتے ہوئے مردوں نے لڑکوں کے بالغ ہونے پر بھی رسومات وضع کیں تاکہ انہیں مردانہ اتحاد کا احساس دلایا جائے۔ آسٹریلیا کے بعض قدیم باشندوں کے گروپوں کو چھوڑ کر خوراک اکٹھا کرنے یا شکار کرنے والے معاشرے میں لڑکوں کو اجتماعی طور پر اپنے کام کا آغاز کرانے کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ یہ کام باغبان اور زراعت پیشہ گروپوں میں ہوتا تھا۔ جب سامان خوردونوش اکٹھا کرنے کی بجائے زراعت یا باغبانی کا سلسلہ چلا تو مردانہ اتحاد کو خطرہ لاحق ہوا۔ اس لئے کہ ہر مرد صرف اپنی زمین یا پلاٹ پر کام کرتا تھا اور یہ اتحاد ختم ہوجاتا اس لئے اسے جاری رکھنے کی تدبیر بہرصورت کرنی ضروری تھی چنانچہ اسے زندہ رکھنے کے لئے مردوں نے لڑکوں کو مردانہ پن سکھانا شروع کیا انہیں مرد ہونے کا احساس دلانا شروع کیا۔

چونکہ مردوں کی یک جہتی کی بنیاد عورتوں کی مخالفت ہے اور چونکہ اس کا اصل مقصد ماں سے اپنا رشتہ توڑنا ہے کیونکہ عورت ہی پیدا کرتی ہے' پرورش

کرتی ہے' پیار دیتی ہے اور نرمی و نزاکت کا احساس پیدا کرتی ہے' اس لئے مردوں کی یک جہتی میں ہمیشہ جبروتشدد کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔ لڑکوں کے بلوغت میں قدم رکھنے پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں ان میں اسے سکھایا جاتا ہے کہ اپنے اندر کی نسوانیت ختم کر کے سختی اور مضبوطی پیدا کرے۔ اپنے سے بڑے مردوں کی بالادستی کو تسلیم کرے اور ان کی فرماں برداری کرے۔ یہ رسوم لڑکوں کے اندر محبت کے بجائے دوسرے مردوں کے ساتھ ایک اور رشتہ کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ یہ رشتہ ہے طاقت اور اقتدار کا رشتہ۔ ان رسوم میں بعض ایسی رسمیں بھی شامل ہوتی ہیں جن میں انہیں اپنی ماؤں کو رد کرنے اور عورتوں کی دنیا سے رشتہ توڑنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

عورتوں نے ایک طبقے کی حیثیت سے کبھی اپنے آپ کو مردوں کا مخالف نہیں مانا اس لئے مرد کی طرح عورتوں کی کوئی برداری نہیں بن سکی۔ ان کا رشتہ صرف اپنے بچوں کے ساتھ ہی رہا۔ اور چونکہ وہ جانتی ہیں کہ زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے انہوں نے مردوں کی یک جہتی سے کبھی خطرہ بھی محسوس نہیں کیا۔ انہوں نے تو اس قسم کی رسوم کی حوصلہ افزائی کی۔ تاکہ ان کے لڑکے زندگی میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرد پروہتوں کی ہدایت پر ہی مردوں نے بچوں کی پیدائش میں اپنے کردار کو دریافت کیا اور اس دریافت کے بعد اصرار کیا کہ بچوں کو ان کے ساتھ منسوب کیا جائے اور ان کے گروہ یا قبیلے کے ساتھ اس کا تعلق قائم کیا جائے۔ اولاد کا سلسلہ برقرار رکھنے کے لئے بعض مقامات پر (جیسے افریقہ میں) مردوں نے عورتوں کو غلام بنانا شروع کیا تاکہ جو بچے پیدا ہوں ان سے عورت کے قبیلے کا کوئی تعلق نہ رہے۔ سارا تعلق اور رشتہ مرد کے ساتھ ہی رہے۔ بچوں کی ولدیت یقینی بنانے کے لئے عورتوں کو چہار دیواری میں بند کردیا گیا۔ مردوں نے یہ پابندی لگائی کہ شادی کے بعد عورت اپنے شوہر کے گھر رہے گی۔ اس طرح اسے اپنے خاندان اور اپنے قبیلے سے علیحدہ کردیا گیا اور اسے اپنی نگرانی میں گھر کے اندر بند کردیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مرد کا اپنا سلسلہ نسب جاری رہے۔ اس کے بعد کی عورت پر مرد کے ظلم و

تشدد کا آغاز ہوا۔ یہ اقدام مختلف طریقوں سے اور مختلف ادوار میں کیئے گئے۔ لیکن پانچ ہزار سال پہلے قریب قریب ہر جگہ یہ نظام رائج ہو چکا تھا۔

عورتوں نے ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد بھی کی۔ بائبل اور دوسری قدیم کتابوں میں مرد اور عورت کے درمیان ہونے والی اس کشمکش کے حوالے ملتے ہیں جو صدیوں جاری رہی۔ لیکن عورت کی شکست مرد کی شکست بھی تھی کیونکہ اس طرح وہ بھی قبیلے کی اجتماعی زندگی سے محروم ہوگیا تھا۔ سمیرین زبان میں آزادی کے لئے جو لفظ ہے وہ ہے "امارگلی" جس کا مطلب ہے "ماں کی طرف مراجعت"۔ بالادستی کے تصور نے بعض مردوں کو وسیع علاقوں پر قبضہ کرنے پر اکسایا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے جنگیں شروع کیں' مال غنیمت چھینا اور محکوموں پر ٹیکس لگائے پھر انہوں نے دو نئے جرائم بھی اختراع کئے۔ ایک غداری اور دوسرے عورتوں کے ساتھ بدکاری۔ پہلے اکثر قبیلوں میں عورتیں بھی سپاہی ہوتی تھیں لیکن پھر یہ کام بھی مردوں نے ہی سنبھال لیا۔ اس کی وجہ وہی تھی جو شکار کی تھی۔ فاتح لوگ مفتوح لوگوں کو گرفتار کرلیتے' ان کا مال و اسباب چھین لیتے حتیٰ کہ ان کی زمینوں پر بھی قبضہ کرلیتے۔ اس طرح ریاست یا مملکت پیدا ہوئی۔ ابتدا میں عورتیں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتی تھیں لیکن صرف وہ عورتیں جن کا حکمران طبقے کے ساتھ خونی رشتہ ہوتا تھا یا وہ بیاہ کر اس طبقے میں جاتی تھیں۔ ابتدائی ریاستوں میں یہ قانون تھا کہ عورت مرد کی ملکیت ہے چنانچہ عورت کے لئے کسی قسم کی جائیداد یا املاک کا مالک ہونا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

پدری نظام یعنی مردوں کی قانونی بالادستی —— غالباً" چار ہزار سال قبل مسیح میں مسوپوٹیمیا میں شروع ہوا۔ اور پھر بتدریج یہ نظام ساری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔ حکمراں اشرافیہ کے خلاف بغاوتیں پہلے بھی ہوئیں لیکن حقوق نسواں کی پہلی تحریک ہے جس نے مردوں کی اس بالادستی یا پدری نظام کو چیلنج کیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں عورتیں اپنے حق کے لئے اکٹھی ہو رہی ہیں اور سیاسی مجلس عمل قسم کی تنظیمیں بنا رہی ہیں۔ وہ خود مختار اور آزاد انسان کی حیثیت سے اپنا حق مانگ رہی ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں اپنی تنخواہ اپنے پاس رکھنے کا حق دیا جائے' طلاق

کے بعد بچے اپنے پاس رکھنے کا حق دیا جائے' ملکیت' حصول تعلیم اور اس طرح روزگار کا حق دیا جائے جس میں وہ آزادانہ طور پر عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ وہ اپنے فیصلوں کا برملا اعلان کر سکیں' اپنی مرضی سے شادی کر سکیں اور انہیں اپنے جسم پر مکمل اختیار حاصل ہو۔ وہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ مردوں کو یہ کھلی آزادی نہ ہو کہ وہ عورتوں کو ماریں' زنا کریں اور جب چاہیں انہیں قتل کر دیں۔ حقوق نسواں کی نظریہ ساز رہنما' پدری نظام کے موجودہ طریقہ کو چیلنج کر رہی ہیں جس میں سماج کی اس طرح درجہ بندی کی گئی ہے کہ کچھ طبقوں کو معاشرتی وسائل تک زیادہ رسائی حاصل ہے' بعض طبقے مراعات یافتہ ہیں' اور بعض پیدائشی طور پر محروم ہیں اور بالادست طبقے کی پرستش کی جاتی ہے۔ عالمی امن اور ماحولیاتی پاکیزگی کی مہم میں بھی خواتین مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ وہ سب سے آگے آگے ہیں۔ امداد باہمی کی بنیاد پر خواتین نے اپنی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ خواتین اپنی ایک نئی تعریف و تشریح کر رہی ہیں۔ وہ انسانی فطرت اور انسانی تجربات کو بھی نئے معانی پہنا رہی ہیں۔

مرد اپنے پدری اقتدار کے نشے میں اس چیلنج کو شکست دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں جو معاشرتی اور سیاسی تحریکیں چلیں ان کے نتیجے میں روشن خیالی کے وہ انقلاب آئے جنہوں نے موجودہ اشرافیہ کو جنم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشرافیہ ان اصولوں سے انکار نہیں کرتی اور ثقہ لوگ کھلے عام یہ کہتے گھبراتے ہیں کہ عورتیں' مزدور اور کسان کمتر مخلوق ہیں جنہیں مشیّت نے خدمت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ نجی محفلوں میں ایسی بات کرتے ہیں لیکن فطری طور پر کمتر ہونے کا نظریہ بیسویں صدی میں اپنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔

لیکن پدری نظام نے تو کسی وقت بھی اپنے اصل مقاصد کھلے عام بیان نہیں کئے۔ کم سے کم تاریخ کے صفحات پر ایسا کوئی اعلان نہیں ملتا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر تہذیبوں کی دیومالاؤں میں عورتوں کی بالادستی کے خلاف مردوں کی جارحیت کی خوب تعریف و توصیف ملتی ہے۔ مردوں نے عورتوں کو جب بھی اپنا دست نگر بنایا انہوں نے اس کا جواز فطرت اور قدرت سے ہی حاصل کیا۔ انہوں

نے کہا کہ فطری طور پر قدرت نے ہی عورت کو کمتر بنایا ہے۔ اس نے عورتوں کو نہیں صرف مردوں کو چند خصوصیات (جیسے قوت استدلال' منطقی دماغ' عقل و حواس اور روح) عطا کی ہیں اور عورتوں کو ہی بعض خاصیتیں دی ہیں (جیسے جذباتی انتشار' بے مہار جنسی خواہش) جو انسانی بھلائی اور معاشرتی امن و امان کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مرد نے عورت کو ہمیشہ معاشرہ کے لئے ایک غیرضروری شے جانا اور زندگی کی دوڑ میں برابر کا حصہ دار کبھی قرار نہیں دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حقوق نسواں کی علم بردار خواتین نے مردوں کو اپنی بات سننے پر مجبور کیا تو سیاست دانوں نے عورتوں کو "خاص مفادات کا گروپ" (Special interest group) قرار دیا جیسے عورتیں آبادی کے ایک بہت ہی چھوٹے سے طبقے یا گروپ سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ تمام عورتوں اور ان بچوں سے تعلق نہیں رکھتیں جن کی ذمہ داری وہ سنبھالتی ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اکثر ملکوں میں عورتیں آبادی کا 51 فیصد ہیں۔

آج حکومتیں اور مذہبی رہنما عورتوں کو نقصان پہنچانے والی پالیسیاں وضع کرتے ہیں تو براہ راست عورتوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ خوبصورت الفاظ کا لبادہ پہنا کر وہ دوسرے مسائل کے ساتھ انہیں منتھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً" ایسے قوانین کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ "خاندان کے تحفظ" کے لئے بنائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ عورتوں کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آخر خاندان کی دیکھ بھال اور اس کی حفاظت عورت نہیں کرتی تو اور کون کرتا ہے؟ اکثر مردوں کو تو اس لبادہ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے پاس سیاسی طاقت ہوتی ہے یا پھر ان کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے حصے میں عورتیں اور بچے (جو ہمیشہ عورتوں کے ساتھ ہی ہوتے ہیں) ایسی مخلوق بن گئے ہیں جو خطرے سے دوچار ہے۔ شارلٹ بنچ لکھتی ہیں کہ اگر ایک قبیلہ یا گروہ دوسرے قبیلے یا گروہ پر حملہ کرے اور عورتوں اور مردوں کا قتل عام شروع کر دے تو اسے ہنگامی حالت قرار دیا جاتا ہے اور اس کے خلاف جنگ تک شروع کر دی جاتی ہے لیکن گھروں میں عورتوں پر جو تشدد ہوتا رہتا ہے اور جو ایک منظم جنگ کی حیثیت

رکھتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا جاتا۔

مرد چونکہ عورتوں کے خلاف اپنی جنگ میں کھلے عام اپنی نیت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اسے ریشمی لفظوں میں لپیٹ کر کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کے بیانوں پر نہیں جانا چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکل رہا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کوئی نتیجہ اتفاق سے یا حادثاتی طور پر بھی نکل سکتا ہے لیکن یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں ہے کہ دنیا بھر میں ایک جنس دوسری جنس کو اتنے وسیع پیمانے پر مسلسل نقصان پہنچا ہے کہ اس جنس کے عقل و ہوش پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جس میں ایک جنس برابر دوسری جنس کو اپنا شکار بناتی رہتی ہے۔ مرد کا دعویٰ ہے کہ اس کے اندر کی درندگی اس کی سرشت میں شامل ہے اس کی جین اور اس کے ہارمون اسی طرح بنائے گئے ہیں کہ وہ عورت کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ ایسا دور بھی تھا جب دونوں اصناف زیادہ ہم آہنگی کے ساتھ رہتی تھیں۔ غالبا" پدری نظام عورتوں پر بالادستی قائم کرنے کے ہی لئے تشکیل دیا گیا ہوگا۔ لیکن جب عورتیں قبیلوں کی سردار ہوتی تھیں تو انہوں نے مادری نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اسے قانونی ادارہ نہیں بنایا۔ انہوں نے مردوں کی جنس پر کوئی پابندی نہیں لگائی یا اس کے دماغ کو کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاریخ میں ایسا کوئی ذکر نہیں آتا کہ جب عورتیں سردار ہوتی تھیں تو انہی نے مردوں کے خلاف اپنے آپ کو منظم کیا ہو۔ مردوں کو عورتوں کو اپنا دست نگر بنانے کی ضرورت شاید اس لئے پیش آئی ہوگی کہ انہیں خود غیراہم اور غیرضروری ہونے کا احساس ہوگیا ہوگا۔ بہرحال ہمیں نہیں پتہ اس کی وجہ کیا تھی یہ کام تو مردوں کا ہے کہ وہ اس کی وجہ تلاش کریں۔ تاہم آج مردوں نے عورتوں کے خلاف جو منظم جنگ شروع کر رکھی ہے وہ عورتوں کی تحریکوں کا ردِّعمل ہے۔ وہ اسے زیادہ شدومد کے ساتھ چلا رہے ہیں۔

دنیا بھر میں مرد بچوں کی پرورش اور گھربار سنبھالنے کی ذمہ داری عورتوں پر ڈال دیتے ہیں لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ وہ اسے کام میں

شمار نہیں کرتے اس لئے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں دیتے۔ اقتصادی طور پر مسلسل محروم رہنے کی وجہ سے عورتیں سیاسی تفریق کا شکار رہتی ہیں۔ گھریلو کام کاج کی وجہ سے عورتیں اپنے آرام کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتیں اسی لئے۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتیں۔ چنانچہ دنیا کے معاملات چلانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس صورت حال نے مرد کو موقع فراہم کیا کہ سیاسی اور اقتصادی امور اپنی مرضی سے چلائے۔ اس طرح عورت اقتصادی اور سیاسی طور پر مرد کی دست نگر بن گئی۔ عورتوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کے لئے مرد ان کے کردار کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں تاریخ سے ہی خارج کردیتا ہے۔

عورتوں کو محکوم بنانے میں مذہب کو بھی ایک موثر آلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ عورت کو سیاسی اقتدار سے دور رکھنے کے لئے مذہب صرف عورت کے جسم کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ وہ عورت کے جسم کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے ساری نسل انسانی کے اخلاقی زوال کا سبب یہی جسم ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ عورت کے لباس اس کی چال ڈھال اور اس کی شکل پر خاص توجہ دیتے ہیں جیسے انسانی نیکیوں کا انحصار اسی پر ہو (مردوں کے لباس اور چال ڈھال کو غیر متعلق مانا جاتا ہے) اور کچھ لوگ عورت کی ماں بننے کی صلاحیت کو اچھالتے ہیں جیسے عورت تنہا نسل انسانی چلانے کی ذمہ دار ہو۔ مذاہب مردوں کو یہ ہدایت نہیں کرتے کہ اس کام میں وہ عورتوں کی مدد کریں یا نہیں اس کا معاوضہ ادا کریں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مرد عورت کو قابو میں رکھے۔

عورتوں کے خلاف جو مذہبی جہاد شروع کیا گیا ہے اس نے بعض حکومتوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ مذہبی اداروں کی مدد سے یا خود ہی ایسے قوانین نافذ کردیئے جائیں جن سے مردوں کو عورتوں کے جسم پر کنٹرول کا اختیار بھی مل جائے۔ چونکہ خیال کرلیا گیا ہے ہے کہ عورت میں شہوانی خواہش بے مہار ہوتی ہے اس لئے کئی معاشروں میں عورتوں کے ختنہ کرنے کی رسم بھی رائج کی گئی اور کسی نہ کسی طرح اسے مذہبی طور پر جائز بھی قرار دیدیا گیا۔ اندازہ ہے کہ دنیا میں دو کروڑ عورتیں ایسی ہیں جو اس عذاب سے گزر چکی ہیں۔

عورتوں کے جسم اور اس کی گھریلو زندگی پر حملے دنیا بھر میں روزانہ کا معمول بن چکے ہیں۔ زنا' عورتوں کی پٹائی' بیویوں کے قتل بچوں کے ساتھ مردوں کی زیادتی کو ذرائع ابلاغ محض انفرادی فعل قرار دیتے ہیں لیکن جس وسیع پیمانے پر یہ جرائم ہو رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام منظم طریقے سے کیا جارہا ہے۔ عدالتوں اور پولیس جیسے اداروں کی چشم پوشی یا حمایت کے بغیر عورتوں پر مردوں کا یہ تشدد اتنے منظم پیمانے پر کبھی جاری نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلے میں جو نفسیاتی جائزے لئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ میں ایسے جرائم کرنے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں "نارمل انسان" کہا جاتا ہے۔ اس لئے کسی فرد کا مجرمانہ حملہ اس معاشرہ کے تہذیبی ڈھانچہ اور تہذیبی سوچ کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ بعض ملکوں میں مردوں کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ جو عورت ان کی ملکیت میں ہے اسے وہ مار سکتے ہیں۔ قید کر سکتے ہیں' حتیٰ کہ قتل بھی کر سکتے ہیں بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جہاں بیسویں صدی کے آغاز تک مردوں کو یہ حق حاصل تھا۔ جو حکومتیں' مذہبی ادارے اور تہذیبی گروپ کھلے عام مردوں کے اس تشدد کی اجازت دیتے وہ بھی اسے انفرادی فعل کہہ کر معاف کر دیتے تھے۔ وہ اسے اپنے دائرہ اختیار سے باہر گردانتے تھے۔

آج بھی ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ اس تشدد کو سیاسی اور عدالتی اداروں کا تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے ادارے جیسے ایمنیٹی انٹرنیشنل وغیرہ عورتوں کو زنا' تشدد' قتل اور قید وغیرہ سے بچانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ یہ کام گھروں کے اندر کئے جاتے ہیں اور جب تک قانونی طور پر ان کی ممانعت نہ کی جائے ان میں مداخلت نہیں کی جاسکتی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو انسانی حقوق کی تحریک سے وابستہ ہیں یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انسانی حقوق میں عورتیں بھی شامل ہیں ـــــ عورتوں پر مردوں کے جبر و تشدد کے مجموعی اعداد و شمار اکٹھے نہیں کئے جاتے بلکہ ہر جرم کو الگ خانے میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح اس حقیقت کو چھپا لیا جاتا ہے کہ عورتوں پر مردوں کا تشدد ایک منظم مہم کا حصہ ہے۔ میرے پاس ایسے وسائل نہیں ہیں کہ

میں اس مہم میں شامل تمام اداروں کے بارے میں تفصیل سے بات کر سکوں۔ لیکن میں ان عام آدمیوں کی بات ضرور کروں گی جنہوں نے عورتوں کے خلاف جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اگر ان اداروں کی حمایت کے بغیر انفرادی تشدد ہوتا تو دنیا بھر میں اتنے وسیع پیمانے پر یہ سب کچھ نہ ہو رہا ہوتا۔

افسوس کی بات ہے کہ صرف خواتین تجزیہ نگار ہی عورتوں پر تشدد کو ایک عالمی بحران قرار دیتی ہیں۔ اخبار نویس، سوشل سائنٹسٹ اور سوشل ورکر کو اس مہم کے پس پشت چلنے والی سیاست کو چھپا جاتے ہیں۔ وہ اسے انفرادی فعل قرار دیتے ہیں، وہ مردوں کی صفائی پیش کر کے اس اصل مسئلے پر عام بحث و تمحیص کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ جب تک کھلے عام اس پر بحث مباحثے نہیں ہوں گے اس وقت تک ہم مرد کی اس نفسیات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گے کہ وہ عورتوں کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب کیوں سمجھتا ہے۔ اس کے بغیر ہم انسانی اخلاقیات پر بحث بھی نہیں کر سکتے۔

عورتوں کے ملکیتی حقوق پر زد پڑنے سے اس کی معاشی قوت ہی متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی سیاسی قوت اور اسکی جسمانی طاقت بھی متاثر ہوتی ہے۔ جن معاشروں میں صرف مردوں کو ملکیت کا حق حاصل ہے (جیسے افریقہ کے بعض ملکوں میں) وہاں عورت زندہ رہنے کے لئے شادی کرتی ہے اور اپنے شوہر کا کھیت جوتتی ہے یا پھر نوکری کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتی ہے۔ اکثر افریقی عورتوں کو شادی کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد بچے ہوتے ہیں لیکن اکثر افریقی مرد اپنے خاندانوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے۔ اگر شوہر کی زمین خاندان کے گزارے کے لئے کافی نہیں ہے تو عورت کو خود کہیں نوکری کرنا پڑتی ہے۔ اس طرح اگر اسے طلاق ہو جائے تو بچوں کی پرورش بھی خود اسے ہی کرنا پڑتی ہے۔ مرد بالکل ذمہ داری نہیں لیتا۔ اگر ذمہ داری لیتا بھی ہے تو بہت کم۔

بچوں کی وجہ سے عورت نوکری کی تلاش میں ماری ماری بھی نہیں پھر سکتی۔ وہ انہیں اکیلا ہی نہیں چھوڑ سکتی۔ افریقہ میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے بہت کم عورتیں پڑھی لکھی ہیں کہ وہ کہیں ملازمت کر سکیں۔ پھر کارخانے دار عورتوں کو

ملازم بھی نہیں رکھتے۔ اس لئے عورت چھوٹے موٹے کام کرتی ہے۔ وہ گھریلو ملازمہ بن جاتی ہے' یا چھوٹی موٹی دوکان کرلیتی ہے یا پھر طوائف بن جاتی ہے۔ چھوٹے کاروبار بھی قانونا" ممنوع ہیں اسی طرح عصمت فروشی بھی جرم ہے۔ (جب سے پدری نظام کی داغ بیل پڑی ہے عصمت فروشی ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس میں مرد عورت کو اتنا کچھ دیتا ہے کہ وہ آرام سے زندگی گزار لیتی ہے)۔ لیکن اس میں بھی عورت زیادہ نہیں کما سکتی پھر وہ بیمار بھی پڑ سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کے بچے بھوکے مرتے ہیں۔ اگر بچہ بیمار ہو جائے تو ماں کو اس کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے جس کی وجہ سے وہ کام پر نہیں جاسکتی۔ سماج اس کا الزام بھی ماں کو دیتا ہے۔ وہ صدمے اٹھاتی اور اپنے آپ کو ہی کوستی ہے۔ یہ عام صورت حال ہے۔ معاشی عوامل عورت کے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عائلی قانون (مرد کے نہیں) عورت کے جسم پر قابو پانے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ یہ قوانین معاشی حالت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اور جب بھی عورت کو تکلیف ہوتی ہے بچے بھی لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

تعصبات سے بھرے معاشروں میں جنسی امتیاز ثابت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اگر آپ کسی پر نکتہ چینی کرنا چاہیں تو ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور مل جائے گی۔ جو شخص بھی کسی فرد یا گروہ کو اپنے آپ سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس میں بہت سی ایسی چیزیں تلاش کرلے گا جن سے واقعی کمتر ظاہر ہوتی ہو۔ ظاہر ہے ہم نے ایک آئیڈیل انسان کا جو تصور بنا رکھا ہے وہ تو کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس تصور کے حساب اگر ہم مرد کو کمتر ثابت کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہر دور اور ہر ملک میں ان کی عمر عورتوں سے کم ہوتی ہے۔ وہ پہلے مرجاتے ہیں وہ جذباتی طور پر بے حس ہوتے ہیں' کسی کی جذباتی مدد نہیں کرسکتے وہ بچے پیدا نہیں کرسکتے بچوں کی پرورش نہیں کرسکتے حتیٰ کہ اپنا کھانا بھی نہیں بنا سکتے۔ ان کے ہارمون کی یہ خاصیت ہے کہ انہیں جلدی غصہ آجاتا ہے اور وہ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں' وہ بھی کھلونوں سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں ایسی چیزیں بنانے کا شوق ہے جن سے وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلا سکیں کہ ہر چیز پر انہیں قدرت حاصل

ہے۔ ان میں بعض اچھی باتیں بھی ہیں جیسے وہ جنسی طور پر نہایت گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے اندر جو غیر ذمہ داری ہے وہ انہیں کھلنڈرا بناتی ہے اور وہ ایسی چیزوں میں بھی الجھ جاتے ہیں جن کا زندگی کے اصل معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ایسی مخلوق کو کھیل کود میں ہی مصروف رکھنا چاہئے تھا اور عورت کو' جو ایک ذمہ دار فرد ہوتی ہے' معاشرہ کا کام چلانا چاہئے تھا اسے بچوں کی پرورش کرنا چاہئے تھی اور کھانا وغیرہ پکانا چاہئے تھا۔ اگر ایسا انتظام ہوتا تو انفرادی فعل کو بھی پورے معاشرہ کی ذمہ داری قرار دیا جاتا اور مردوں کی طرف سے احتجاج کو ان کے ہارمون کا نتیجہ قرار دیا جاتا۔

گورے مرد اپنے ہمسائے میں یا قیمتی دوکانوں میں کالوں کو وحشی ہی سمجھتے ہیں۔ گورے لوگ دولت مند علاقوں میں کالی عورتوں کو گھریلو نوکرانی یا بچوں کی دایا کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں اور سڑکوں پر انہیں طوائف اور مہنگی دوکانوں میں چور مانتے ہیں۔ 1990ء تک ماسکو کے کسی ہوٹل میں کوئی عورت اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتی تھی جب تک وہ ثابت نہ کردے کہ وہ کس کی مہمان ہے یا وہاں ٹھہری ہوئی ہے کیونکہ حکومت ایسی عورتوں کو طوائف سمجھتی تھی۔ (ہوسکتا ہے اب یہ صورتحال بدل گئی ہو) میں جب لڑکی تھی تو کوئی ریستوراں تنہا لڑکی کو اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ مرد کے بغیر عورت طوائف سمجھی جاتی تھی۔

ایک تعصب جنس یا رنگ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ ختم ہوگیا ہو مگر غیر شعوری طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ اب بھی موجود ہے۔ تمام معاشروں میں ایسے تعصبات موجود ہوتے ہیں جن کا برملا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اس لئے انہیں ثابت بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بعض معاشرے اپنے تعصبات کو قانونی شکل بھی دے دیتے ہیں۔ حقوق نسواں کی تحریک نے اکثر صنعتی ملکوں کے قوانین سے یہ تعصب نکلوا دیا ہے لیکن اب مردوں نے عورتوں کو علیحدہ رکھنے کے لئے نئی تیکنیک اختیار کرلی ہے۔ عورتوں کی کمتری کی بات اب زیادہ تر نہیں کی جاتی لیکن ان کا عمل ایسا ہوتا ہے جیسے معاشرہ میں صرف مرد ہی موجود ہیں صرف انہیں کی اہمیت ہے۔ کسی کمپنی میں عورت کو ترقی نہیں ملتی تو کہا جاتا ہے کہ اس کا مطلب

عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مالک اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ اس کار خانے یا ملازمت کے لائق نہیں ہے۔ ایسے میں ایک لفظ بہت زیادہ بولا جاتا ہے اور وہ ہے' "بہت زیادہ"۔ عورت کی آواز بہت تیز ہے' یا بہت باریک ہے یا بہت زیادہ منحنی ہے' یا عورتوں میں بہت زیادہ جارحیت ہوتی ہے یا وہ بہت زیادہ مجہول ہوتی ہیں۔ ان کا لباس بہت زیادہ شوخ ہوتا ہے یا بہت زیادہ بھدا' وہ بہت زیادہ بوڑھی ہوتی ہیں یا بہت زیادہ جوان ویسے تو انسان کی ہر عادت کسی نہ کسی کو ضرورت مشتعل کردیتی ہے لیکن عورت سے نفرت کرنے والے معاشرہ میں عورتیں مردوں کو زیادہ ہی ناراض کرتی ہیں۔

عورت کچھ بھی کرے اسے معاشرہ سے انحراف کرنے والی ہے کہا جاتا ہے۔ ایک نئی کتاب

THE TRAPPED WOMAN: CATCH 22 IN DEVIANCE AND CONTROL

میں ثابت کیا گیا ہے کہ عورت ہمیشہ معتوب رہتی ہے۔ بچے نہیں ہوتے تو وہ معتوب' بچے ہوتے ہیں تو معتوب۔ ملازمت کرتی ہے اور بچوں کو چائلڈ کیئر سنٹر میں رکھتی ہے تو معتوب' اگر چائلڈ کیئر سنٹر استعمال نہیں کرتی تو معتوب۔ اگر عورت بچے پیدا کرتی ہے اور ان کے لئے سوشل ویلفیئر سے امداد کی خواہاں ہے تو بری بات ہے اور ایسا نہیں کرتی تب بھی بری ہے۔ اگر وہ شوہر سے پٹتی ہے تو بری ہے اور پیٹنے والے شوہر کا مقابلہ کرتی تو بھی بری ہے۔ اسے طلاق ہو جاتی ہ تو یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ عورت اگر جنس کے بارے میں کھل کر بات کرتی ہے تو بری بنتی ہے۔ اپنے کنوارپنے سے چمٹی رہتی ہے تب بھی بری بنتی ہے' کسی مرد سے تعلق رکھتی ہے تو بری کہلاتی ہے حتیٰ کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جاتا ہے تب بھی اسے ہی ملزم گردانا جاتا ہے۔ عورت اگر اپنے آپ کو شوہر اور بچوں کے لئے وقف کردیتی ہے تب بھی بری بنتی ہے اور ایسا نہیں کرتی تو بھی بری کہی جاتی ہے۔ معاشرہ ان عورتوں کو بھی برا کہتا ہے جو بہت زیادہ کامیابی چاہتی ہیں' زیادہ دولت مند ہوتی ہیں اور اس وقت بھی برا کہتا ہے جب وہ کامیابی کے لئے کوشش نہیں

کرتیں۔ اگر عورت دبلی ہے تب بری، موٹی ہے تب بری۔ دولت مند ہے تو بری اور غریب ہے تب بری۔

تمام پدری معاشروں میں عورت سے نفرت عام بات ہے۔ وہ مرد کی جیب میں پڑا ایسا سکہ ہے جسے جب چاہا نکالا جاسکتا ہے اور اپنے ہر عمل کے لئے جواز تلاش کیا جاسکتا ہے۔ عورت جیسی بھی ہے اس کے لئے سارا الزام اس کے سر ہی جاتا ہے لیکن جنسی امتیاز یا تفریق ثابت کرنا بہت مشکل کام ہے۔

مرد بھی ہر جگہ مظلوم ہے۔ وہ بھی نسلی، مذہبی، معاشی اور سیاسی منافرتوں میں گھرا ہوا ہے۔ عورت بھی اس میں مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہے (سوائے مردانہ تشخص کے اور یہ ایسا سنگین مسئلہ ہے جس سے بہت کم مرد نبرد آزما ہوسکتے ہیں) لیکن عورتوں کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں مرد برابر کے شریک نہیں ہیں۔ اصل مسئلہ جس میں مرد برابر کے شریک نہیں ہوتے عورت کے بچے پیدا کرنے کی طاقت ہے۔ اگر پدری نظام نہ بھی ہوتا تب بھی عورت کی پوزیشن مختلف اور منفرد ہی ہوتی کیونکہ نسل انسانی کا فروغ اس کے جسم کے واسطے سے ہی ہوتا ہے۔ عورت چونکہ اپنی کوکھ میں بچہ پالتی ہے اس لئے مرد اس کے جسم کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرد کی بالادستی والے معاشروں میں یہ ظاہر کیا جاتا ہے جیسے عورت کسی مرد کے بغیر اپنے آپ ہی معجزانہ طور پر بچے پیدا کرتی ہے۔ (-لاکھوں سال سے ہم ایسا ہی سوچتے آرہے ہیں) یہ رویہ ہر معاشرہ میں پایا جاتا ہے۔ چاہے وہ معاشرہ سیدھا سادہ ہو یا ترقی یافتہ۔ اب چونکہ عورت بچہ پیدا کرتی ہے اس لئے مرد اس کے پالنے پوسنے کی ساری ذمہ داری بھی اس پر ڈال دیتا ہے۔ پھر وہ بچوں پر اپنی ملکیت بھی جتاتا ہے انہیں اپنا نام دیتا ہے۔ اپنے خاندان سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن ظاہر یہی کرتا ہے کہ بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ عورت کا اپنا ہی ہے اس لئے وہ خود ہی اس کی پرورش کرے گی۔ بچہ پیدا کرنے کی وجہ سے عورت ذمہ داریوں کے چکر میں پھنسی رہتی ہے۔ مرد یہ نہیں سوچتا کہ وہ عورت کے جسم کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے اس کا براہ راست اثر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت پر بھی پڑتا ہے۔ ماں بننے کا تجربہ عورت کی پوری زندگی پر اثر انداز

ہوتا ہے۔ اس کے اثرات زندگی بھر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ مرد کو کسی ایسے تجربہ سے نہیں گزرنا پڑتا جو اس کی ساری زندگی کو اس طرح ہمیشہ کے لئے متاثر کرے۔ حتیٰ کہ باپ بننے کا تجربہ یا مردانہ صفات سے محروم کردیئے جانے کا تجربہ بھی اتنا پائیدار نہیں ہوتا۔ وہ بچے پیدا نہیں کرتا۔ اسی لئے وہ اپنے تجربات کو مختلف خانوں میں بانٹ سکتا ہے۔ عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ عورت چونکہ بچے پیدا کرتی ہے اس لئے مرد ہر عورت کو ماں ہی سمجھتے ہیں اور اسے گھربار کی ذمہ داریاں سونپ دیتے ہیں۔ اگر عورت کو بھی اپنی آرزوئیں' امنگیں اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کا پورا موقع دیا جائے تو وہ بچوں اور گھربار کی ساری ذمہ داریاں اٹھانے کو بخوشی تیار ہو جائے گی۔ پھر وہ اس کے لئے کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ لیکن مرد تو عورت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ یہ ساری ذمہ داریاں بھی پوری کرے اور کسی صلے کی توقع بھی نہ رکھے۔ وہ یہ توقع بھی نہ کرے کہ بچے کی پرورش اور گھربار کی ذمہ داریوں میں مرد بھی اس کی مدد کرے گا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مرد نے عورت کی تخلیقی صلاحیتوں سے روگردانی کی۔ اس نے عورت سے اس کا اقتدار چھینا اور اس وقت اسے لین دین کی شے بنا دیا جب دنیا میں ریاست کا وجود بھی عمل نہیں آیا تھا۔ عورت کے جسم پر قبضہ کرنے کی خواہش مرد کے لئے خبط کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ عورت کو قابو رکھنے کی کوشش دراصل ایک ایسی خاموش سازش ہے جس پر دنیا کا ہر مرد عمل کر رہا ہے۔

عورت اور فطرت

سوزن گریفن

کہا جاتا ہے عورت زمین سے زیادہ قریب ہے۔

عورت مرد کو خراب کرتی ہے۔ وہ شیطان کا زینہ ہے۔

روحانی معاملات سمجھنے کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ عورت کی فطرت مرد سے مختلف ہوتی ہے۔ ذہنی طور پر عورت بچہ کی طرح ہوتی ہے اور یہ کہ مرد کے مقابلے میں عورت دماغی اور جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہے۔

"کمزوری' تیرا نام عورت ہے۔"

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کا لفظ ہی "جسمانی خواہش" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

مرد جب عورت کی آواز سنتا ہے یا اس کی شکل دیکھتا ہے تو اس کے اندر شہوانی جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ عورت کا چہرہ جھلستی آندھی اور اس کی آواز سانپ کی پھنکار ہوتی ہے۔

یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ بچہ کی پیدائش میں عورت گھلانے والا مادہ اور انڈے کی زردی (MENSRUUM, YOLK) فراہم کرتی ہے اور مرد ہیت مہیا کرتا ہے جو غیرمادی ہوتی ہے۔ اس ملاپ سے جنین (EMBRYO) کی تخلیق ہوتی ہے۔

بائبل میں لکھا ہے کہ آدم پہلے انسان تھے' حوا ان سے پیدا ہوئیں اور چونکہ وہ مرد سے پیدا ہوئیں اس لئے آدم نے کہا "اسے عورت کہا جائے گا۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیدائش کی جتنی بھی خرابیاں ہیں ان کی ذمہ دار عورت ہوتی جو جنین کو کوئی شکل دینے کے لئے مرد کی کوششوں کی مزاحمت کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "حیات بخش حرارت" مرد کے مادہ میں ہوتی ہے اور یہ ستاروں میں موجود عناصر سے مشابہ ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سورج کی حیات بخش حرارت سے برجستہ توانائی پیدا ہوتی ہے۔
دریافت کیا گیا ہے کہ سورج کائنات کا مرکز ہے زمین مرکز نہیں ہے۔ اور جس نے یہ دریافت کیا اس نے لکھا۔

"تمام چیزوں کے بیچ میں تخت پر بیٹھا ہے۔ اس خوب صورت مندر میں کیا ہم اس سے زیادہ بہتر جگہ پر اسے رکھ سکتے ہیں کہ وہ بیک وقت ہر مقام کو روشن کر سکے؟ اسے بجا طور پر شمع' دماغ اور کائنات کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ ہرمیس ٹر سمیجی لس نے اس کا نام "مرئی خدا" رکھا اور سوفو کلیس کی الیکٹرا نے اسے "خبیر و بصیر' کہا۔ چنانچہ سورج شاہی تخت پر بیٹھا اپنے بچوں یعنی سیاروں پر حکمرانی کر رہا ہے جو اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں..... دریں اثناء سورج نے زمین کو گابھن کیا جو ہر سال نیا جنم لیتی ہے۔
کرۂ ارض میں جو تغیر و تبدل ہوتے ہیں وہ حضرت آدم کے زمین پر اترنے کے بعد شروع ہوا ہے۔ اس سے پہلے زمین پر ابدی مسرت و شادمانی کا دور دورہ تھا۔ ہبوط آدم کے بعد ہر چیز گلنے سڑنے اور تباہ ہونے لگی ہر چیز بالآخر نئے جنم کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ کرۂ ارض کا چہرہ انسانی گناہوں کی دستاویز ہے۔ پہاڑوں کی بلندی' وادیوں کی گہرائی سمندر' دریا' چٹانیں اور دوسری تمام چیزیں طوفان نوح کے بعد وجود میں آئیں اور وہ طوفان انسانوں کو ان کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ "دنیا شیطان ہے اور شیطان دنیا ہے"

چونکہ یہ کہا گیا ہے کہ عورت شیطان کا زینہ ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ گناہ اور بعد میں موت اس لئے پیدا کئے گئے کہ عورت شیطان کے ورغلانے میں آ گئی تھیں جو سانپ کے روپ میں آیا تھا۔

شیطانی قوت مرد کے خفیہ اعضاء میں موجود میں ہوتی ہے۔

اور عورت شیطان کی چیلی کے طور پر کام کرتی ہے اور مرد کو پھانسنے کے لئے جسم کا دانہ ڈالتی ہے۔

عورتیں چڑیل ہوتی ہیں۔

اگرچہ کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ عورت کی خباثت کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے لیکن یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اچھی عورت مرد کے لئے برکت ہوتی ہے۔ وہ قوموں، ملکوں اور شہروں کو بچاتی ہے۔ "مبارک ہے وہ مرد جسے پاک باز بیوی ملی ہے۔ اس کی زندگی کے دن دوگنے ہو جائیں گے۔"

اور پاک باز بیوی وہ ہے جو شوہر کی فرماں بردار ہے اور تابع دار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فطرت حشو زوائد سے بھری ہوئی نہیں ہے۔

فطرت سادگی پسند کرتی ہے اور فضول نمود و نمائش پسند نہیں کرتی۔

کہا جاتا ہے کہ عورتوں میں نمود و نمائش کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ عورتوں میں بے جا محبت و شفقت کا مادہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ عورت کا غم اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ عورت جب غصے میں آتی ہے تو وہ سانپ سے زیادہ زہریلی، ظالم حکمراں سے زیادہ سفاک اور شیطان سے زیادہ دھوکہ باز ہوتی ہے۔ عورت کا طیش خون میں نہایا ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اترتی چڑھتی آندھی کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جادوگری کی شہوانی خواہشات سے پیدا ہوئی ہے اور عورت کی شہوانی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گناہ کا جنم عورت کے جسم میں ہوتا ہے گناہ اسی میں بسیرا کرتا ہے اور عورتوں کو بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں موت کو لانے والی وہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فطرت کو صرف تقلیل اور کسر کے ذریعہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے اعداد میں تقلیل کر کے ہی واضح کیا جا سکتا ہے۔

ریاضی کے بغیر انسان اندھیری بھول بھلیوں میں ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ طے کیا گیا ہے کہ جس چیز کی پیائش نہیں کی جا سکتی اور جسے اعداد میں مکسور نہیں کیا جا سکتا وہ حقیقی شئے نہیں ہے۔

سوال کیا گیا ہے کہ آیا حرکت کوئی حقیقت شئے ہے؟

دریافت کیا گیا ہے کہ اس خلا کی پیائش کر کے حرکت کی پیائش کی جا سکتی ہے جس خلا میں حرکت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور اس وقت کی پیائش سے یہ کام کیا جا سکتا

ہے جس میں یہ حرکت ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حرکت خدا کی طرف سے وقوع پذیر ہوتی ہے اور خدا نے کائنات کو حرکت کی مقررہ تعداد ہی عنایت کی ہے۔

طے کیا گیا ہے کہ تمام حرکات ان اجسام سے پیدا ہوتی ہیں جو دوسرے اجسام پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ کہ ایک جسم فاصلے سے دوسرے جسم پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مادہ چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنا کہ جس کی حرکت کائناتِ کے ظہور کا سبب بنتی ہے او یہ کہ خدا ہی چیزوں کو ان کی اصل شکل میں دیکھتا ہے۔ جو شخص کسی بھی وقت ان ذرات کی پوزیشن معلوم کر لے گا وہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکے گا۔

کہا جاتا ہے کہ آنکھ کی پتلی پر ذرات جو اثر مرتب کرتے ہیں ان سے رنگ کا ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور یہ کہ ذرات تو حقیقت ہیں لیکن ارتعاش حقیقت نہیں ہے۔

رنگ حقیقت نہیں ہے۔ بو بھی حقیقت نہیں ہوتی۔ ڈراؤنے خواب' خوشی اور دکھ بھی کوئی حقیقت نہیں ہے حتیٰ کہ موسیقی بھی حقیقت نہیں ہوتی۔

عورت اور مرد کے درمیان فرق اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عورت زیادہ نفسانی خواہشات رکھتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کا وجود ہی عیاشی کے لئے ہے۔

لوگوں نے لکھا ہے کہ انسانی دماغ اپنی پسند کی ہر چیز سمجھنے کے لئے بنایا گیا بلکہ وہ "تعداد" معلوم کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ "انسانی دماغ میں اعداد و اور حجم کے سوا اور کیا ہے؟؟"

کہا گیا کہ ہمارے تمام خواص مغالطہ ہیں اور عورتیں دغا' فریب' اور ہر قسم کی دھوکہ بازی اور جھوٹ کا سرچشمہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عورت مرد کی ٹوٹی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اس لئے عورت کی سرشت میں دغا اور فریب ہے۔

یہ بھی پڑھایا جاتا ہے کہ عورت کی اصلیت سمجھنا ہے تو اس کے کمرے میں چلے جاؤ۔ وہاں رنگ و روغن پر غازہ پاؤڈر کی نیچے سے ایسی کریہہ المنظر مخلوق برآمد ہوگی کہ اسے دیکھ کر ڈر جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ حسیت دراصل الجھے ہوئے خیالات اور تصویروں کا نتیجہ ہوتی ہے اور تخلیل اور یادداشت پر اس لئے بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ حسیت سے پیدا ہوتے ہیں۔

HYSTERIA (مالیخولیا) کا لفظ HYSTER سے نکلا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے عورت کا رحم۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ جذبات کا منبع رحم ہے اس لئے عورت مرد سے زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رونا پیٹنا عورتوں کا کام ہے اس لئے ڈرامائی شاعری سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اس میں رونا پیٹنا بہت ہوتا ہے۔ اس سے اعلیٰ کردار کے مرد بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورتوں کا اندر یہ خرابی ہے کہ وہ بلاوجہ جذباتی ہو جاتی ہیں اس لئے نوعمر لڑکیوں کو اطالوی اور ہسپانوی نہیں پڑھانا چاہئے کیونکہ ان دونوں زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کا عورتوں پر بہت برا اثر ہوتا ہے۔

شوہروں کو مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں سے مشورہ نہ کریں اور انہیں اپنا حساب کتاب نہ دکھائیں۔

یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عورت کو اپنے اوپر قدرت نہیں ہوتی اور ہزاروں میں کوئی ایک ہی عورت ایسی ہوتی ہے جو عصمت و عفت کے ساتھ زندگی گزارتی ہو۔

یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عورت نہیں بلکہ مرد خدا کا خلیفہ ہے۔

طے کر لیا گیا ہے کہ عورت کی عقل ناقص ہے۔ اس کے دماغ کی بناوٹ کمزور ہے چونکہ عورت ہر مہینے ماہواری سے گزرتی ہے اس لئے اس کے دماغ کو جانے والے خون کی روانی کم ہو جاتی ہے۔

ہدایت کی جاتی تھی کہ تمام تجریدی علوم اور ایسے علم جن میں محنت کرنا پڑتی

ہے صرف مردوں کو پڑھائے جائیں۔ اسی لئے کہا جاتا تھا کہ عورت جیومیٹری کبھی نہیں سیکھ سکتی۔ یہ بھی بحث چلتی رہے ہے کہ عورت کو ریاضی پڑھائی جائے یا نہیں۔

کسی عورت کے پاس اگر دوربین ہو تو اسے ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ اسے پھینک دے۔ اسے یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ چاند میں کیا ہو رہا ہے۔

طے کر دیا گیا کہ مادہ مادے کو نہیں جان سکتا۔ اور یہ کہ مادہ بے عقل ہے اور محض محدود حرکت کے قابل ہی ہے۔

فطرت کے بارے میں استدلال کے ساتھ ہی غور کرنا چاہئے۔

پھر یہ ہی کہا گیا کہ آدم روح ہے اور حوا صرف گوشت پوست۔

دلیل دی جاتی ہے کہ جانور سوچ نہیں سکتے وہ مشین کی طرح ازخود حرکت کرتے ہیں۔ جانوروں کے اندر جذباتی ہیجان بہت شدید ہوتا ہے کیونکہ ان کے اندر سوچنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ ہمارا اپنا جسم مشین سے اس لئے مختلف ہے کہ وہ کسی جذباتی ہیجان کے بغیر سوچنے کی قوت رکھتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر جانور سوچتے ہوتے تو ان کے اندر ابدی روح ہوتی۔

کہا گیا ہے کہ عورت کے اندر چھوٹی سی روح ہوتی ہے۔

کتابوں میں لکھا گیا کہ عورت کو مرد کا تابع ہونا چاہئے۔

ہمیں سکھایا گیا ـــــــ کہ

عورتوں کو پڑھانے کی اجازت نہیں ہے اور وہ کسی کی بپتسمہ بھی نہیں دے سکتیں۔ حتیٰ کہ کنواری مریم کو بھی بپتسمہ دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔

کہ ـــــــ ہماری زبان ناپاک ہے

فطرت کو استدلال کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور یہ کہ فطرت سے انسان کو اس طرح نہیں سیکھنا چاہئے جیسے کوئی سعادت مند شاگرد اپنے استاد سے سیکھتا اور اس کی ہر بات مانتا چلا جاتا ہے بلکہ ایک جج کے طور پر فطرت کا سامنا کرنا چاہئے جو خود ہی سوال کرتا ہے اور گواہ کو مجبور کرتا ہے کہ اس کا جواب دے۔

(اور یہ لکھا ہوا ہے کہ عورت کو یہ معلوم ہو کہ اس کی اندر

بیضہ دان (OVARIES) ہیں تو اس علم سے وہ مغرور ہو گی)

ہمیں کانوں سے بہرہ رہنے کو کہا جاتا ہے:۔۔۔۔۔۔

طے کر لیا گیا ہے کہ انسانی علم اور انسانی طاقت ایک ہی چیز ہے اور "فطرت کی کوکھ میں بہترین استعمال کے لئے بہت سے اسرار ہیں"

لکھا گیا ہے کہ مغرور عورت ناقابل برداشت ہوتی ہے کیونکہ فطرت کے عام اصولوں کے مطابق مرد کو غرور کرنے اور فخر سے معمور ہونے کی صفت عطا کی گئی ہے۔ عورت کو انکساری اور خاکساری دی گئی ہے۔

ہم گونگے رہتے ہیں۔۔۔۔۔:

لکھا گیا ہے کہ نادان جانداروں اور نباتات کی دنیا میں مرد کو خلیفہ بنایا گیا ہے اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ جانداروں اور نباتات کے نام رکھے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ لفظ میں طاقت ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسان چیزوں کے نام رکھ کر انہیں اپنے قبضہ قدرت میں لے سکتا ہے۔ چنانچہ جو شخص مخلوقات کو ان کے صحیح نام سے پکارے گا وہ اس پر قابو پا لیتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ انسان جب بہشت سے گرا تو وہ بیک وقت معصومیت اور خدائی بادشاہت دونوں سے گر گیا۔ اس سے وعدہ کیا گیا ہے کہ ایمان پر قائم رہنے سے اسے معصومیت اور بادشاہت دونوں مل جائے گی۔

بتایا گیا ہے کہ آگ' پانی' ہوا' ستاروں' آسمانوں اور ہمارے گرد موجود دوسرے اجسام کی قوت اور عمل کو جان کر انسان فطرت کے آقا اور اس کے مالک بن جائیں گے۔"

پیش گوئی کی گئی کہ اس کے بعد زندگی طویل ہو جائے گی' نوجوانی بحالی ہو جائے گی' عمر ٹھہر جائے گی' ناقابل علاج بیماریاں ٹھیک ہو جائیں گی' درد جاتے رہیں گے اور ایک جسم دوسرے جسم میں تبدیل ہو جائے گا' جانداروں کی نئی نسلیں پیدا ہوں گی' تباہی اور بربادی کے نئے آلات ایجاد ہوں گے' تولید کا وقت تیز ہو جائے گا' زمین کی کھاد بنتی جائے گی' نئی خوراک بنائی جائے گی' نیا دھاگہ بنے گا' کاغذ' شیشہ' مصنوعی معدنیات اور

سیمنٹ بنایا جائے گا اور دور دور کے فاصلوں تک آواز پہنچانے کا انتظام ہو گا' جنگ کے زیادہ خطرناک ہتھیار تیار کئے جائیں گے اور انسان ہوا میں اڑے گا اور پانی کے اندر بڑے بڑے جہازوں میں جائے گا۔

زمان و مکان کے بارے میں بھی حیرت کا اظہار کیا گیا اور کہا گیا کہ مکان (SPACE) دو ہیں ایک ادنیٰ' تغیرپذیر' اضافی اور دوسرا قائم بالذات' ناقابل تغیر' ابدی اور یہ کہ قائم بالذات مکان خدا کا دماغ ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ادنیٰ دماغ صرف ادنیٰ مکان کو ہی سمجھ سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ قائم بالذات حرکت جیسی چیزیں قائم بالذات مکان میں اپنا وجود رکھتی ہیں اور ہمیشہ وہیں رہیں گی۔

کہا گیا کہ انسان زمین پر چند سال کا مسافر ہی ہوتا ہے اور یہ کہ انسانی عمر کی طرح زمین کی عمر بھی مختصر ہے۔

کہا گیا ہے کہ روئے زمین پر جو تغیر و تبدل ہوتے ہیں وہ بہت تیزی کے ساتھ اور دھماکہ خیز انداز میں ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ زمین کی تخلیق صرف ایک دھماکے سے نہیں ہوئی بلکہ پے درپے دھماکوں کا نتیجہ ہر دھماکہ خدا کی نشانی تھا اور دھماکہ کہ ایک دور کے خاتمے اور دوسرے دور کے آغاز کا اعلان تھا۔

اور یہ کہ ان ادوار کا اندازہ ان چٹانوں کی پرتوں سے لگایا جا سکتا ہے جن پر کرۂ ارض سے معدوم ہو جانے والے جانداروں اور پودوں اور درختوں کے نشانات ملتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ بڑی بڑی دیوہیکل چٹانیں سمندر کی ایک مہیب لہر کے ساتھ لڑھکتی چلی گئی تھیں۔ یہ لہر دور دور تک وادیوں میں پھیل گئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کا سلسلہ مٹی ریت اور پتھروں کے زبردست طوفان کے بعد پیدا ہوا۔ ہولناک دھماکوں اور طوفان کے بعد ایک دور کی نسل دوسرے دور میں زندہ نہیں رہی (جانداروں کی نسلوں کی کڑی صرف کے خدا کے دماغ میں محفوظ رہی)

اور یہ سورج جلد ہی جل کر بھسم ہو جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ جس منصوبے کے تحت جانداروں کی سلطنت قائم کی گئی ہے

اس میں نوع انسانی جانداروں کی آخر نسل ہے۔

(تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسانوں کا ظہور ایک بہت بڑا ارضیاتی واقعہ تھے جس کی بہت زیادہ اہمیت ہے..... اس کا فطرت کے قوانین میں کوئی جواب نہیں ملتا۔

یہ بھی کہا گیا کہ اس کائنات میں ایک زینہ موجود ہے۔

(گیت گائے گئے کہ غلام ہی عورتوں سے محبت کرتے ہیں کیونکہ عورت کی محبت خطرناک ہے اور "خوبصورت اور یلیا کی کوکھ میں کھیلنا موت کو دعوت دینا ہے"

یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ انسانوں کی وحشی نسلیں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس مقام پر پہنچیں اور انسان جنت سے جتنا دور ہوتا جائے گا اتنا ہی وحشی بنتا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ فطرت کے تمام مظاہر انسانوں کی بھلائی کے لئے ہیں۔ کوئلے کو زمین کی اوپری سطح پر رکھا گیا ہے تاکہ وہ اسے استعمال کیا جا سکے جانور چار پاؤں پر اس لئے چلتے ہیں کہ وہ باربرداری اچھی طرح کر سکیں۔ دانت چبانے کے لئے بنائے گئے ہیں اور یہ کہ عورت صرف انسانی نسل میں اضافہ کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ قدرت نے عورت کی فطرت میں ڈال دیا ہے کہ وہ اچھی بیوی اور ماں بنے اور یہ کہ "قدرت کی یہ محبوب مخلوق" گھر کے اندر ہی رہے۔ (جو عورت اپنے گھربار کو نظرانداز کرتی ہے وہ غیر قدرتی شئے ہے اور وہ فرینکنسٹائن سے بھی زیادہ خطرناک راکھشس ہے) اور چونکہ قدرت نے عورت کے لئے ذہنی اور علمی استعداد کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں اس لئے اسے تعلیم دینا غیر قدرتی بات ہے۔

اعلان کیا گیا "فطرت خدا کا آرٹ ہے۔"

(طے کیا گیا کہ تمام نسلوں کے نام رکھے جائیں۔ انسان نے نام رکھ کر خدا کے اسرار کی جھلک دیکھی۔ چنانچہ تمام مخلوقات کے نام ان کے جنسی اعضاء کے مطابق رکھے گئے۔)

یقین دلایا گیا کہ ہمیں اس بات سے پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارا خالق ہمیں نظرانداز کر دے گا کیونکہ ہمارے خالق نے یہ کائنات تخلیق کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سے کیڑے مکوڑے کا بھی خیال رکھا ہے لیکن اب اس میں شکوک و شبہات بھی

پیدا ہوئے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ پہاڑوں اور زمین سے زمانے کے آغاز و انجام کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور آہستہ آہستہ یہ بھی احساس کیا گیا کہ کسی طوفان نے نہیں بلکہ ہواؤں نے چٹانوں اور پتھروں کو خاص شکل دی ہے اور پانی کے قطرے پتھر میں گڑھا ڈال دیتے ہیں۔ پانی مٹی کو بہا کر لے جاتا ہے اور اس سے پہاڑ بن جاتے ہیں اور پانی زمین سے سمندر اور سمندر سے زمین کا سفر کرتا ہے اور مٹی بہہ جاتی ہے تو پھر لوٹ آتی ہے اور پھر اس پر اتفاق ہوا کہ "فطرت حرکت میں زندہ رہتی ہے۔"

اور اب معلوم ہوا کہ معدوم ہو جانے والے جانداروں کے اعضاء پر اور دانت مل گئے ہیں اور بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ گیا ہے ایسے حقائق معلوم ہو گئے ہیں جو جانداروں کی نسلوں کی پائیداری کی نفی کرتے ہیں۔

اور اس بات کو محل نظر قرار دیا گیا کہ تمام زندہ چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔

مثال کے طور پر دانت ایسی صورت میں بھی موجود ہیں جہاں کاٹنے یا چبانے کی صورت نہیں ہوتی ایسے جانداروں کے پر بھی ہیں جو نہیں اڑتے۔ (بطخ اپنے پر' چپو کے طور پر استعمال کرتی ہے' پینگوئن کلپھڑے کے طور پر اور شترمرغ سانس لینے کے لئے اپنے پر پھیلاتا ہے) اور اب یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ فطرت نے چھپکلی کو سانپ کے ساتھ کس طرح ملایا ہے۔

نتیجہ نکالا گیا کہ خدا نے ہر جاندار نسل کو الگ الگ نہیں بنایا اور یہ نسلیں تغیر تبدل سے ماورا نہیں ہیں۔

(یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا کی ذات کے لئے یہ بات اہانت انگیز ہے کہ اس نے بھانت بھانت کے گندے اور غلیظ کیڑے مکوڑے پیدا کئے جو کرۂ ارض پر رینگتے پر پھر رہے ہیں)

جانور کشتی نوح سے نہیں نکلے بلکہ انہیں ماحول نے پیدا کیا جس میں وہ رہتے ہیں اور وہ حالات کے مطابق نئی شکل اختیار کرتے ہیں اب کہا جاتا ہے کہ جانداروں کی نسل نئی نسل پیدا کرتی ہے اور فطرت فطرت پیدا کرتی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جانوروں کی ایسی نسلیں بھی تھیں جو کبھی اس

کرۂ ارض پر موجود تھیں لیکن اب معدوم ہو چکی ہیں اور اریزونا کے ریگستان میں جن جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں وہ ان "لاما" جانوروں سے بالکل مختلف ہیں جو آج موجود ہیں۔
(عینک جیسی آنکھوں والا ماہی خور جانور آخری بار 1852ء میں دیکھا گیا)

یہ بھی کہا گیا کہ انسانی ارتقا کا پوشیدہ مقصد اس مخلوق کو بے عیب اور مکمل بنانا ہے اور یہ کہ دنیا میں تغیر و تبدل کی وجہ سے جانوروں کی تکمیل کا عمل دوسرا رخ اختیار کر گیا ہے۔

(یہ بھی سوچا جاتا ہے کہ کیا اورنگ اوٹان اپنے وحشی پن کی وجہ سے اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔)

تاہم اس امکان پر غور کیا گیا کہ کیا فطرت کسی ارادہ اور منصوبے کے بغیر تو جاندراوں کی نسلیں پیدا نہیں کرتی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ فطرت اندھی ہے' مشیت اندھی ہے اس میں سوچ بچار نہیں ہے اور اس کی کوئی اخلاقیات بھی نہیں ہے۔ اور یہ زندہ رہنے کا ارادہ ہی ہے جو تمام قدرتی اجسام میں موجود ہوتا ہے۔ اس میں پودوں کی نشوونما' عورت مرد کے ملاپ کا جذبہ' کھانے کی بھوک بھی شامل ہے یہ انسانوں اور جانوروں میں مشترک ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہاں' فطرت بے رحم' حریص اور ندیدی ہے۔ اس کے دانت اور پنجے خون میں لتھڑے ہوئے ہیں۔

(اور یہ بھی لکھا ہے کہ فطرت جرائم پر ہی زندہ رہتی ہے۔ اس کے روئیں روئیں سے خون خرابے کی بھوک پھوٹی پڑتی ہے' اس کی رگ و پے میں گناہوں کی خواہش بستی ہے۔ وہ ظلم و تشدد کے لئے بے چین رہتی ہے۔ وہ زندگی میں موت کی چنگاری سلگاتی ہے' جیتا جیتا خون پیتی ہے اور اسکی دودھ سے خالی چھاتیوں میں بے شمار لالچی منہ چمٹے رہتے ہیں۔ فطرت زندگی سے بیزار رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہیں اور اس کے کان سن سن کر پک گئے ہیں۔ وہ موت کی خواہش میں تڑپتی رہتی ہے۔)

کہا جاتا ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کی فطرت زیادہ قدرتی ہوتی ہے اور

وہ خونخوار جانوروں کی طرح چالاک ہوتی ہے۔ شیر کی طرح اس کے پنجے اندر ہوتے ہیں۔

اور یہ کہ اس کی خواہشات اور اس کی نیکیوں کی حرکت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہمیں ڈرنا سکھایا جاتا ہے ـــــــ

(کسی نے لکھا ہے کہ "عورت' تیرا نام ہی ایسا ہے جس سے جرم کی بو آتی ہے")

ہمارا مستقبل ـــــــ:

مشیئت کا متبادل خیال ہے۔ خیال فطرت کی نفی کرتا ہے۔

اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ دماغ کے ارتقاء نے اور اسی وجہ سے انسان کی قوت استدلال نے انسان کو دوسرے جانوروں سے الگ کر دیا ہے اور اسے اپنے ارتقاء پر قدرت بخش دی ہے۔

اور یہ کہ صرف قوت استقلال کے ذریعہ ہی انسان فطرت کا غلام بننے سے انکار کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کے اعضاء تناسل مشیت کا اصل مرکز ہیں اس لئے وہ دماغ کے مخالف سرے پر واقع ہیں۔

یہ اعضا خون حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ ریکارڈ کیا گیا ہے کہ عورت کے تخلیق کرنے والے اعضاء اس کے دل' دماغ اور اس کی روح پر عجیب طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

اور یہ کہ عورت محض اپنے رحم کی وجہ سے صرف وہی ہے جو اپنے کردار' اپنے دلکشی' اپنے جسم' اپنے دماغ اور اپنی روح میں ہے۔ (ماہواری بند ہو جانے کے بعد عورت ایک ایسی شئے بن جاتی ہے جس کی کوئی افادیت نہیں ہوتی) یہ کہ عورت بچے پیدا کرنے کی مشین ہے۔

نصیحت کی جاتی ہے کہ زیادہ دماغی کام کرنے سے عورتوں کی بیماری OVARIAN NEURALGIA ہو سکتی ہے جس میں رحم اور دماغ دونوں کو پورا خون نہیں ملتا۔

یہ کہ غور و فکر کرنے والی عورت اپنے تخلیق کرنے والے اعضاء سے دماغ کی طرف خون کی روانی منتقل کر کے اس مقدس ازلی توازن کو بگاڑ دیتی ہے جو اسے کائنات کے عمیق ترین قوانین سے باندھے رکھتا ہے۔"

نسل انسان کی فلاح کے لئے مشورہ دیا جاتا ہے کہ لڑکیاں سولہ سترہ سال کی عمر تک اپنی تعلیم مکمل کرلیں اور پھر شادی کرلیں انہیں بتایا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے ان کے جنسی اعضاء میں نقص پیدا ہو جائے گا۔

(بتایا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم نے عورتوں کا پیر پہلے ہی چھوٹا کر دیا ہے)

کہا جاتا ہے کہ عورت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ عظیم مرد پیدا کرے۔

لکھا ہوا ہے کہ تمام جسمانی اور دماغی اوصاف کی منزل یہ ہے کہ وہ اپنی تکمیل کریں۔ "دماغ ریڑھ کی ہڈی کی چوٹی پر سب سے اوپر عمودی شکل میں رکھا ہوتا ہے اور اس سے اوپر کوئی ترقی نہیں ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کا ارتقا کم ہوا ہے۔ عورت اور مرد میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پودوں اور جانوروں میں۔ اور مرد اور جانوروں میں ایسی ہی موافقت ہے جیسے اور عورت اور پودوں میں۔ کیونکہ عورت پودوں کی طرح زیادہ تحمل کے ساتھ بڑھتی ہے اور اس کے اندر جذبات کی غیر واضح صفت ہوتی ہے۔

یہ کہ اس کا ارتقا ایسا ہوا ہے کہ اس کی آواز زیادہ تیز اور زیادہ باریک ہوتی ہے' اس کا نرخرہ چھوٹا ہے' اس کے خون میں سرخ خلئے کم ہوتے ہیں اور اس کا اعصابی نظام زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔

ہماری آوزیں مدھم پڑتی جاتی ہیں ـــــــــ :

عورت کے ارتقاء میں اس کا پاؤں چھوٹا رہ جانا اس بات کی نشانی ہے کہ اس کا ارتقا بعد میں ہوا ہے کیونکہ چھوٹا پاؤں "شریف جانور کے شایان شان" نہیں ہوتا۔

ہم کم ہو گئے ـــــــــ

بیان کیا جاتا ہے کہ عورت کا مغز چھوٹا ہوتا ہے۔

اور یہ کہ قوت استدلال اور اخلاقیات کے فقدان کے باعث عورت ایک طرح

بچے اور مرد کی درمیانی کڑی ہے۔

مرد ہی انسان ہے۔

ہماری لئے خاموشی ہی فطری صفت ہے ــــــــ

(رحم مادر میں بچہ انسانی ارتقاء کے تمام مدارج طے کرتا ہے)

جنس مذکر کے سامنے عورت ذہنی طور پر پسماندہ ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے خیالات عام سچائیوں کے بجائے خاص اور ذاتی تجربات سے معمور ہوتے ہیں اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عورتیں اور "کمتر نسلیں" "تجریدی افکار" کے قابل نہیں ہوتیں۔

کہا گیا کہ سائنس اصلی عورتوں کی نزاکت اور شرم و حیا کی بے حرمتی کرتی ہے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ان کی جلد کے اندر بلکہ اس سے بھی زیادہ بیہودہ بات یہ کہ ان کے لباس کے اندر جھانکنا چاہتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ تجریدی افکار عورتوں کے سر میں درد کر دیتے ہیں اور دانشورانہ افکار کے لئے ان کی نااہلی ان کی جنسی خاصیت ہے۔

(عورتوں کی جسمانی ساخت ہی ایسی ہے جو وجدان' عادات اور جبلت اور اپنے بچوں کے لئے وہ جسمانی ہیئت پیدا کرتی جو بچوں کو وراثت میں ملتی ہے۔)

مردوں کو اپنے آپ اور اپنے خاندان کی زندگی چلانے کے لئے زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ "اس جدوجہد میں اس کی ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح مرد اور عورت کا فرق بڑھتا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ مرد کے بغیر تہذیب و تمدن ممکن ہی نہیں تھے۔

بنی نوع انسان کے ارتقاء نے مرد کو حیوانوں سے دور کیا ہے اور فرشتوں کے قریب کیا ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ مانسان حیوان ہے اور نہایت مکمل حیوان۔

انسانی بقا کے قانون کے تحت جاندار اپنی اور اپنی نسل کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں زیادہ بڑا اور زیادہ طاقت ور جانور کمزور کو کھا جاتا ہے۔

کہا گیا کہ اگر عورت کو مرد کے قابو میں نہ رکھنا ہوتا تو اسے کمزور نہ بنایا جاتا۔
کہا گیا کہ عورت مرد سے اتنی ہی الگ ہے جتنا جنگلی بندر مرد سے الگ ہے۔
زیادہ اہل اور قابل جاندار ہی باقی رہتا ہے۔
جیسے بھیڑیا جو دبلا پتلا اور تیز رفتار ہوتا ہے۔
فطرت نے بھیڑیئے اور اس کے بچوں کو زندہ رکھنے کے لئے منتخب کیا ہے۔
مینڈھے کے سینگ اور مرغ کے بچے ہوتے ہیں۔
موت جانداروں کی نسلوں کی ہیت طے کرتی ہے۔
کہا گیا کہ دنیا (گھر سے باہر) ایک وسیع ویرانہ ہے۔
اور انسان اس ویران جنگل میں ننگا آتا ہے جہاں وحشی اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوتے ہیں۔ اسے مسابقت کی جنگ لڑنا پڑتی ہے۔
یہ کہ اس دنیا کے ساتھ اس کا رابطہ اور چکر اس کی جنس کو ورثے میں ملے ہیں۔

(اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لڑکوں کی پرورش میں ان کی جسمانی طاقت کا خاص خیال رکھنا چاہئے تاکہ ان کے اندر غیر معمولی طاقت اور قوت برداشت پیدا ہو سکے اور نوجوان مرد کو اپنے دماغ میں مسلسل مردانہ خیالات ہی رکھنا چاہئیں۔ اور کہ تعلیم میں اسے اپنے آپ کو مقابلے کے لئے تیار کرنے کی غرض سے آرام و آسائش کی بعض قربانیاں بھی دینا چاہیں۔)
کہا گیا ہے کہ عورت کا مقام اس کا گھر ہے۔
عورت نے اپنے ارتقا میں وہ طاقت ور عقلی محرک کھو دیا جو مردوں کے مقابلہ اور مسابقت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ عورت کے مقابلے میں جوں جوں مرد کا دماغ بڑھتا ہے اسی طرح وہ انسانی معاشرہ پر حکمرانی کرتا جاتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ عورت کمزور جنس ہے اور وہی عورتیں معاشرہ میں کامیاب رہتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ مردوں کو خوش رکھتی ہیں۔
اور اس کمزوری کی وجہ سے فطرت نے عورت کو اچھا جھوٹ بولنے والا بنا دیا

ہے کیونکہ جس طرح فطرت نے شیر کو پنجے اور دانت' ہاتھی کو دانت اور سونڈھ اور بیل کو سینگ دیئے ہیں اسی طرح عورت کو فریب سے نوازا ہے۔"

جو عورت مرد کے برے سلوک پر غصے کا اظہار کرتی ہے وہ اس عورت کے مقابلے میں کم عمر پاتی ہے جو مرد کے برے سلوک کو خاموشی سے برداشت کرتی ہے اور اپنے غصے کو چھپالیتی ہے۔"

(فطرت نے مرد کو اس لئے داڑھی سے نوازا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو چھپا سکے عورت چونکہ فطری طور پر فریبی ہوتی ہے اس لئے اسے داڑھی نہیں دی گئی۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس عورت کے اندر وجدان کی صلاحیت ہوتی ہے وہ معاشرہ میں زیادہ اچھی زندگی گزر سکتی ہے کیونکہ جب عورت اپنے ظالم شوہر کے ابھرتے ہوئے جذبات کو فوراً سمجھ جائے وہ شوہر کے غیض و غضب سے بچ جاتی ہے۔

(لڑکیوں کو اپنی تعلیم میں تہذیب و اخلاق پر زیادہ زور دینا چاہئے۔)

یہ بھی کہا گیا کہ عورت کو بے تحاشہ دلکشی اور خوبصورت عطا کی گئی ہے تاکہ وہ مرد کو متوجہ کر سکے۔ لیکن ایک دو بچے پیدا ہونے کے بعد یہ خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اس طرح جیسے مادہ کو زرخیز کرنے کے بعد چیونٹی کے پر جھڑ جاتے ہیں۔

انتباہ کیا جاتا ہے کہ مرد آزاد خیال عورت کو پسند نہیں کرتے۔

معاشرہ کو اس بات پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ آزاد خیال عورتیں اور طوائفیں اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کرتیں۔

طے کر لیا گیا ہے کہ عورت کا بیضہ مجہول ہوتا ہے اور مرد کا مادہ فعال۔

اور یہ کہ مرد کا مادہ انسانی قوت کا ست ہوتا ہے۔

اور یہ کہ بونے قد کے بچے' لاغر بچے اور لڑکیاں کمزور مادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

مرد کا مادہ عورت کے بیضے کو زرخیز کرنے کا عمل کرتا ہے۔

یہ کہ عورت کا بیضہ جبلت' عادت' وجدان اور چال چلن طے کرتا ہے۔

اور مرد کا مادہ وہ وسیلہ ہے جس سے فطرت کی نئی نئی شکلیں عورت کے بیضے میں ظاہر ہوتی ہیں۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم فطرت ہیں ــــــ

(جس طرح مردانہ اعضاء نئی شکلیں تخلیق کرتے ہیں اس طرح مرد کا دماغ نئے تجربات اور فطرت کے نئے قوانین دریافت کرتا ہے جو بعد میں زندگی کا نیا قانون بن جاتے ہیں۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم فطرت ہیں جس میں عقل نہیں ہے ــــ

لکھا گیا ہے کہ تمام نامیاتی مخلوقات کو سخت مقابلے اور مسابقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر جاندار اپنی بقا کی جنگ میں لگا ہوا ہے۔

تمام جانداروں کے اندر یہ رجحان ہے کہ اپنی خوراک کے ذخیروں سے بھی زیادہ تعداد میں بڑھتے چلے جائیں۔

(لکھا گیا ہے کہ انسانوں کی تعداد خوراک کے ذخیروں سے زیادہ ہو جاتی ہے اگر قحط وبائیں اور جنگیں انہیں قابو میں نہ رکھتیں۔)

کہا جاتا ہے کہ جنگیں انسانی صحت بنانے اور طاقت ور نسلیں پیدا کرنے کے کام آتی ہیں۔

اور کہا جاتا ہے کہ بڑی بڑی تجارتی کارپوریشنوں کا قیام دراصل بقائے اصلح کا ہی نتیجہ ہے اور یہ قانون قدرت کے اور قانون خداوندی کے عین مطابق ہے۔

خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہر جسم نامی "مو لیکیولز" کی اس باہمی جنگ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو اپنی بقا کے لئے لڑتے رہتے ہیں۔

یہ کہ انسانی جسم اپنے اعضاء کے درمیان ہونے والی جنگ کا ثمرہ ہے۔

ایک گیت ہے "عورت دودھ کی طرح سفید بھیڑ ہے جو مرد کی حفاظت کیلئے ممیاتی ہے۔"

لکھا گیا ہے کہ عورت کم و بیش معذور ہی ہوتی ہے۔

ماہواری کے دنوں میں عورت ذہنی اور جسمانی پریشانی کا شکار رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ سوچنے اور عمل کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

قابل رحم بات یہ ہے کہ عورت اور جانور جو کمزوری کی پیداوار ہوتے ہیں ان

کے اندر رحم کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔

اور شاعروں نے ترحم عورتوں سے سیکھا ہے۔

سائنس دان کہتے ہیں کہ عورت زیادہ نرم و نازک اور مرد کے مقابلے میں کم خودغرض نظر آتی ہے۔

(کہا جاتا ہے کہ ترحم کا جذبہ فطرت کے قریب ہے اور ترحم یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی جگہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ حقیقت پسندانہ سوچ انسان کو فکر کے ذریعے الگ تھلگ کر دیتی ہے اور حقیقت پسند انسان دوسرے کی تکلیف دیکھ کر کہہ سکتا ہے۔ "مرتا ہے تو مرے' میں تو محفوظ ہوں۔"

لیکن یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "بیمار آدمی صحت مند کے لئے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اور بیمار عورت اس سے بھی بڑا خطرہ ہوتی ہے۔

جس مرد کے گھر عورتوں کی بھرمار ہو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔

گیت ہے "مرد کو کام کرنا چاہئے اور عورت کو رونا پیٹنا چاہئے۔"

"عورت پر ترس کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

لکھا ہوا ہے کہ جو لوگ عورتوں سے ہمدردی کرتے ہیں وہ چڑیا گھر کے اس چوکیدار کی طرح ہیں جو اس شیرنی سے ہمدردی کرتا ہے جو اپنے بچوں کی رکھوالی کر رہی ہے۔ شیرنی اسے ضرور کھا جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کا ارتقاء بن مانس سے ہوا ہے۔

سطح زمین کے نیچے ہم کرۂ ارض پر بسنے والے پہلے جانوروں کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

باہر کو نکلے جبڑے اور چھوٹا ماتھا وحشی پن کی علامت ہے اور کھوپڑی کی یہ ساخت حبشیوں' منگول' ہو ٹنٹوٹ اور قدیم آسٹریلوی باشندوں سے ملتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی ارتقاء کے تمام درجوں کی مخلوق ابھی تک پائی جاتی ہے۔

مختلف نسلوں کے درمیان بقائے اصلح کی جنگ ابھی جاری ہے۔

اور یہ کہ گوری چمڑی کی نسل اپنی برابر کی نسلوں کے مقابلے میں زیادہ ارتقا

پذیر ہے۔

جو لوگ جنگلوں میں رہتے ہیں ان کے پاس سے گزرتے ہوئے آپ کو شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان نہیں "اورنگ اوٹانگ" ہیں۔

(ہو ٹنٹوٹ وحشی ہیں اور ان کی بولی بن مانس کی چٹر پٹر سے زیادہ کچھ نہیں۔)

بتایا جاتا ہے کہ جنوبی امریکہ میں ایسے بھی قبیلے ہیں جن کی زبان اتنی خام ہے کہ وہ اندھیرے میں بات ہی نہیں کر سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ اورنگ اوٹانگ اور چمپینزی کی طرح حبشیوں کو بھی بالغ ہونے کے بعد نہیں پڑھایا جا سکتا۔

رائے ظاہر کی گئی کہ کمتر نسلوں اور بن مانس میں پھولا پیٹ' جھکے گھٹنے اور چپٹی رانیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔

اور بتایا جاتا ہے کہ حبشیوں کی طرح عورت بھی چپٹے تلوے والی ہوتی ہے۔ اس کا پیٹ آگے کو نکلا ہوتا ہے جس سے وہ سیدھی نظر نہیں آتی اور اس کی چال میں توازن کی کمی ہوتی ہے۔

ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے حبشی بچہ' عورت اور معذور گورا بوڑھا برابر ہیں عورت کا دماغ چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی ساخت دودھ پیتے بچے یا کمتر نسلوں کے دماغ جیسی ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کو جب بھی دیکھو وہ مرد کے مقابلے میں جانور سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ ہو ٹنٹوٹ کی عورت میں بندر کی مشابہت دیکھی جا سکتی ہے۔

دنیا بھر کی سیاحت کرنے والوں کی زبانی کہانیاں سنائی جاتی ہیں کہ عورتیں بندروں اور ریچھوں سے ملاپ کرتی ہیں اور ان سے بچے پیدا کرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ غلامی اعلیٰ معاشرہ کی خاصیت ہے۔

عورت کو خوشی خوشی اس مرد کی غلامی کرنا چاہئے جسے اس نے اپنا دل دے دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک عورت نے کہا _ میں پھر عورت ہوں..... تیرے قدموں

میں پڑی عورت۔"

کہا جاتا ہے کہ آزاد خیال عورت اور اس غلام میں پاگل پن کے آثار ملتے ہیں جسے آزاد کر دیا گیا ہو۔

پھر اعلان کیا گیا کہ آقاؤں کی طرف سے غلاموں کے لئے جن فراخ دلانہ جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے وہی جذبات عورت کے حقوق کی ضمانت کے لئے کافی ہیں۔

لیکن جہاں تک عورت اور مرد کا تعلق ہے اندازہ لگایا گیا ہے دو نسل کے ماں باپ کی موجودگی سے تغیرو تبدل کے امکانات میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بقاء کی جدوجہد سے صرف نسلوں کے خاتمے کا ہی راستہ نہیں کھلتا۔ بلکہ شکلوں میں رنگا رنگی اور تنوع بھی پیدا ہوتا ہے یعنی اس سے "فطرت کی سلطنت پھیلتی ہے۔"

پھر "جین" دریافت کی گئی۔

کہا گیا کہ بچہ اپنے والدین کے عادات و اطوار ورثہ میں حاصل نہیں کرتا۔

(جین ارادیا منصوبے سے بالکل آزاد ہوتی ہے اس میں ارادہ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔)

تسلیم کیا گیا جانوروں کی انواع میں ردوبدل بے ساختہ ہوتا ہے اسے حساب کتاب سے نہیں جکڑا جا سکتا۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ نوعی ردوبدل کے نظریہ سے یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس خاص نہج کو دریافت کر لیا جائے گا۔ جب انسان قائم و دائم ہو جائے۔

کہا جاتا ہے کہ مرد کی توانائی فولادی گھوڑے جیسی ہوتی ہے (اور پٹڑی پر ٹرین ایسے ہوتی ہے جیسے عورت اور مرد)

دریافت کیا گیا کہ حرارت غزیزی قوت بخش غذا کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے (اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اگر عورت اور مرد کو ایک پاؤنڈ روٹی دی جائے کہ وہ اسے حیات بخش توانائی میں تبدیل کریں تو مرد زیادہ توانائی پیدا کرے گا۔)

کتابوں میں لکھا گیا کہ "ہمارے جسمانی نظام کی توانائیاں ختم ہو جائیں گی اور

انسان تحت الثریٰ میں چلا جائے گا اور اس کے افکار معدوم ہو جائیں گے۔"

بتایا گیا کہ ذات کی توانائیاں دماغ کے اس گوشے میں پوشیدہ ہیں جس تک رسائی ممکن نہیں اور وہ گوشہ شہوانی خواہشات سے مغلوب رہتا ہے۔ دماغ کا یہ گوشہ خوابوں میں' یا بے خیالی میں منہ سے کچھ نکل جانے پر' غلط لفظ بول دینے سے' بھولے ہوئے ناموں کے' گنگنانے سے' یا قلم گھسیٹنے سے کسی وقت سامنے آ سکتا۔ (یہ سب علامتیں ہیں۔ معذور عضو اس توانائی کی ظاہری علامت ہے) دماغ کی توانائی کو لبڈو یا شہوانی جذبہ کا نام دیا گیا ہے۔

(کتابوں میں لکھا ہے کہ عورت میں یہ جذبہ (لبڈو) کمزور ہوتا ہے۔

ایٹم کا جغرافیہ بھی دریافت کیا گیا ہے۔ اس کے اجزاء کو الیکٹرون' پروٹون اور نیوٹران کا نام دیا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ایٹم نظام شمسی سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس میں چھوٹے اجزاء ایک بڑے مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں۔

کہا گیا کہ ذات تین حصوں سے ملکر بنتی ہے' وہ ہمیں سپر ایگو' ایگو اور اد (ID)

اگرچہ عورت میں کمزور لبڈو یا شہوانی جذبہ ہوتا ہے لیکن اسے اپنی حیوانی جبلت پر کنٹرل کم ہے۔ اس میں سپر ایگو بھی کم ہے۔ یہ کہ عورت میں ایگو بھی کم ہوتی ہے اور (بچوں اور قدیم انسانوں کی طرح) ضروریات زندگی سے بھی زیادہ واقف نہیں ہوتی ہیں۔

یہ کہ عورت میں حس انصاف کم ہوتی ہے اور ان کے خیالات مردوں کے مقابلے میں جذبات کے زیادہ تابع ہوتے ہیں۔

(عورتیں بہت کم معروضی ہوتی ہیں)

کہا گیا کہ تہذیب کے فروغ کے ذمہ دار مرد ہیں۔

عمل کرنا مرد کا ہی حصہ ہے۔ چھوٹے بچے عمودی شکلیں بناتے ہیں اور مرد کی حیثیت سے وہ باہر کی دنیا میں حقیقت کو ایک شکل دیتے ہیں۔

انفعالیت عورت کا حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چھوٹی لڑکیاں گھروندا بناتی ہیں اور باہر کی دنیا سے زیادہ رابطہ نہیں رکھتیں۔ ان کی ترقی ذات کے اندر کی طرف ہوتی ہے۔

مردوں کے باہر کی دنیا سے رابطے پر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہیں۔ اور یہ کہ وہ تہذیب سے خوش نہیں ہوتیں۔ ترقی کے عمل میں وہ اختلاف پیدا کرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اڈ، ایگو اور سپر ایگو کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ ذات کے تینوں حصے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایگو کے ظہور میں آنے سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن ایگو کے ظہور میں آنے کے بعد لڑکی زیادہ مجہول اور انفعالی ہو جاتی ہے۔

یہ کہ عورت مرد کی شخصیت میں ضم ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

عورت محبت میں اپنی شخصیت کی شناخت کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے خیالات میں بے تکے اور آوارہ ہوتے ہیں اور عورت اپنے ذہن میں اپنی ذات کی جانب رجوع کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہتی ہے اور اس میں خود پسندی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

فیصلہ کیا گیا کہ عورت کے بیضے اور مرد کے مادہ کا عمل محبت میں مشغول مرد و عورت کے طرز عمل کا ماڈل پیش کرتے ہیں۔

حیاتیاتی عمل عورت کی فطرت کا تعین کرتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ عورت کیا چاہتی ہے؟ یہ کسی کو علم نہیں ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ جن عورتوں کو ہسٹیریا ہوتا ہے ان کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے ان کی یادیں جھوٹی ہوتی ہیں جو عورتیں کہتی ہیں کہ ان کے باپ نے ان کے ساتھ برا کام کیا دراصل انہیں ان کی مائیں بہکاتی ہیں۔

سوال کیا جاتا ہے کہ اگر کائنات کا ادراک نہ کیا جاتا تو کیا اس کا وجود ہوتا؟

طے کیا گیا ہے کہ چونکہ اکیلے الیکٹرون کی تشریح نہیں کی جا سکتی اس لئے گروپ کی شکل میں الیکٹرون کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چھوٹے بچے اپنے باپ کے رعب اور ان کے خوف میں زندہ رہتے ہیں "رب اور رزاق" کا تصور دراصل بچوں کا تصور ہے جس میں انہوں نے اپنے

باپ کی نئی تخلیق کی ہے۔

بتایا گیا ہے کہ لڑکا اپنی ماں سے جو محبت کرتا ہے اس کی وجہ سے اس کے اندر باپ کو قتل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنے باپ سے خوف بھی کھاتا ہے۔ اسے خطرہ رہتا ہے کہ باپ اسے خصی کرے گا۔

لکھا گیا ہے کہ اپنی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے انسان نے فطرت پر حملہ کیا اور اسے اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔

پھر کہا گیا کہ لڑکیاں خصی ہی پیدا ہوتی ہیں۔

لڑکی کی زندگی کا سب سے اہم یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے پاس مردانہ عضو نہیں ہے۔ یہی خیال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسکے لئے یہ جیسے زخم کا نشان بن جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے وہ اپنے آپ سے نفرت کرتی ہے پھر یہ نفرت ماں کی طرف اور پھر تمام عورتوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت نے اپنے ستر چھپانے کے لئے کپڑا بنایا اور کپڑے میں چٹیں ڈالنا ایجاد کیا۔

یہ بھی کہا گیا کہ چھوٹا بچہ جب یہ دیکھتا ہے کہ عورت کے پاس مردانہ عضو نہیں ہے تو وہ اس کی نظر میں گر جاتی ہے۔

اور یہ کہا گیا کہ چھوٹی بچیاں لڑکوں کے عضو سے جلتی ہیں اور عورتیں فطری طور پر مرد سے عناد رکھتی ہیں اور وہ اس سے جلتی ہیں۔

دماغی بیماری میں ظاہری علامات بیرونی اشیاء کی طرح نارمل حالت پر اپنا عکس ڈالتی ہیں۔ ایگو شیشے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ اس کی ساخت کے مطابق اس کی کرچیاں ہو جاتی ہیں۔

(ایک عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا باپ بستر مرگ پر تھا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے بازو زہریلے سانپ بن گئے ہیں۔ وہ ڈرتی ہے کہ وہ سانپ اس کے باپ کو مار ڈالیں گے۔

باپ کی موت کے بعد وہ اس خواب کو بھول گئی۔ بعد میں وہ اپنے بازو ہی نہ ہلا

سکی۔

بتایا گیا کہ انسانی نفسیات میں موت کی خواہش موجود ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ نامیاتی مادہ کی بقا اور دوسے بڑے یونٹوں کے ساتھ اس کے اتصال کی جبلت کے ساتھ ایک جبلت ایسی بھی ہوتی ہے جو ان یونٹوں کو ختم کرنا چاہتی ہے اور انہیں موت کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ موت کی اس جبلت کو قابو میں کیا جاتا ہے تو وہ مرد میں فطرت پر تسلط حاصل کرنے کا سبب بنتی ہے۔

عورت کے جسم کی خاصیت ہی ایسی ہے کہ تباہی کی اس جبلت کا رخ اندر کی طرف کر دیتی ہے۔

عورت کے خلئے' اس کے بیضے بلکے اس کی زرخیزی جس میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے' ازلی طور پر ایذا پسندی یا مساکیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

یہ کہ دودھ پیتی بچی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا باپ اسے کاٹ کھائے بلکہ کھا جائے اور یہ کہ بعد میں وہ چاہتی ہے کہ باپ اسے تھپڑیا کوڑے مارے۔ نوعمر لڑکیاں زنا کے خواب دیکھتی ہیں اور بڑی عمر کی عورتیں خواہش رکھتی ہیں کہ کوئی ان کے بھالے چبھوئے۔

یہ کہ عورت اذیت میں مزہ لیتی ہے اور اس کی خواہش کرتی ہے۔

پھر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عورت جب اپنے نسوانی دائرہ سے باہر نکلتی ہے اور وہ فعال ہو جاتی ہے تو اپنے اردگرد مردوں کے لئے خطرہ بن جاتی ہے۔

کہا گیا کہ اشیاء کی اصل حقیقت کے بارے میں ہر سوال ایک سوال کو جنم دیتا ہے۔

زمین' چٹان' دریا' بادل' روشنی' ہوا' سانس' گوشت' خچر' گھوڑے' پرندوں کا گوشت' عورت کا جسم' اس کے رحم' چھاتیوں' بالوں وغیرہ کی ماہیت ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔

لکھا ہوا ہے کہ ہم تماشائی بھی ہیں اور تماشہ بھی۔

نظریہ ارتقاء اور عورت

روتھ ہبارڈ

ڈارون کی کتاب 1859 میں چھپی تھی' اس میں ارتقا کو حقیقت تسلیم کیا گیا اور پھر یہ ثابت کیا گیا کہ ارتقا ہوتا کس طرح ہے۔ ڈارون نے مظاہر فطرت کے سائنس دان کے طور پر سنگ واروں (فوسلز) کے ریکارڈ اور اپنے چھوٹے کتے کے مشاہدات سے حاصل کردہ وسیع مواد اکٹھا کر دیا۔ اس نے اس بات پر غور کیا کہ کیوں بعض انواع یا صورتیں معدوم ہو گئی ہیں اور بعض صورتیں بچ گئی ہیں جن سے مزید نئی اور مختلف صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ارتقاء کا نظریہ یوں لگتا تھا کہ "ثمر دار بنو اور بدلتے رہو" اور یہ رویہ حیرت ناک حد تک جانوروں کے پالنے والوں اور مالیوں سے ملتا جلتا ہے۔ ڈارون نے خود بھی جانور پالنے والے کئی افراد سے خط و کتابت کی اور خود بھی کبوتر پالنے شروع کئے۔ جانور پالنے والے بڑے محتاط انتخاب کے ذریعے جانور کی قسم میں معمولی سی تبدیلی سے بہت بڑے نتائج حاصل کر لیتے تھے۔ ڈارون اس طریقے سے متاثر ہوا اور جانور پالنے والوں اور فطرت کی طرف سے "پسندیدہ" کے بقا کے طریق کار میں مماثلت ڈھونڈتا رہا۔ ڈارون ذہنی طور پر مالتھس کی آبادی کے متعلق نظریاتی کتاب سے بھی متاثر تھا۔ ڈارون اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے۔

"مجھے اپنی تفتیش و تحقیق شروع کئے پندرہ ماہ گزرے تھے کہ اکتوبر 1938ء میں' میں نے آبادی کے موضوع پر مالتھس کی کتاب تفریحا" پڑھنا شروع کی۔ میں جانوروں اور نباتات کی عادات کے مشاہدے کے باعث جہدالبقاء کو بڑی حد تک بخوبی جان چکا تھا۔ چنانچہ جب مالتھس کی کتاب پڑھی تو ایک دم خیال آیا کہ ان حالات میں پسندیدہ انواع تو بچ جائیں گی جبکہ ناپسندیدہ تباہ ہو جائیں گی۔ اس کے نتیجے کے طور پر نئی انواع وجود میں آئیں گی چنانچہ یہیں سے مجھے ایک

نظریہ مل گیا کام کرنے کے لئے۔"

ویلیس نے بھی اعتراف کیا کہ مالتھس کی کتاب پڑھنے کے بعد اسے اس نظریئے (ارتقاء) کا خیال آیا۔

"میرے خیال میں یہ انتہائی دلچسپ اتفاق ہے کہ مجھے اور ڈارون کو نظریہ ارتقاء پر کام کرنے کی ترغیب مالتھس سے ہی حاصل ہوئی۔ مجھ پر اچانک منکشف ہوا کہ تمام حیوانات دراصل اسی اصول (جہد البقاء) کے مطابق بچے ہوئے ہیں۔ جن مختلف انواع پر میں ہمیشہ سے سوچ رہا تھا یقیناً وہ مفید ہوں گی اور اسی افادیت کے باعث بچ گئی ہوں گی۔ ان میں اضافہ ہوا ہو گا جبکہ نقصان دہ انواع تلف ہو گئی ہوں گی۔"

چنانچہ دونوں کو مالتھس کی کتاب یا نظریئے میں ایک ایسے قانون فطرت کی عملداری نظر آئی جسے سپنسر نے اپنے الفاظ میں "بقائے اصلح" کا نام دیا ہے۔

ڈارون کے نظریہ کے تین اہم عنصر ہیں۔ لامحدود تنوع' ان میں سے قدرت کا انتخاب اور نتیجے میں بقائے اصلح۔ اس نے اپنے دلائل کے بے شمار جھول گنوائے مگر ماہر اور مشاق بازی گر کی طرح نکل گیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس کے نظریئے کو وسیع حلقے میں قبول کر لیا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ یہ نظریہ تاریخی اور مادی تھا اور یہ دونوں پہلو مستند مانے جاتے تھے۔ دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے اندر ایک قسم کی رجائیت تھی۔ یعنی ایک سے دوسری بہتر انواع کی پیدائش یا خلق۔ برطانوی تاجروں' صنعتی سرمایہ دارانہ نظام اور سامراج کی اچانک فلک بوس ترقی کے سبب اس نظریہ کو بھی اسی رفتار سے ترقی مل گئی۔

ڈارون نے زمین پر حیات کی تاریخ کی جو تعبیر کی تھی۔ وہ نہ صرف انیسویں صدی کی معاشرتی آزاد خیالی اور انفرادیت پسندی کے اصولوں کے عین مطابق تھی بلکہ اس طرح قانون قدرت کے یہ پہلو دکھا کر خود ان اصولوں کو تقویت دی گئی۔ سپنسر کو یہ امتیاز دیا جاتا ہے کہ وہ ڈارون کے نظریئے کو بھی معاشرتی نظریئے میں لے آیا۔ یہ افکار جو بعد میں سوشل ڈارونزم کے نام سے مشہور ہوئے' برطانیہ اور امریکہ میں انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی میں خاصے قبول کئے گئے۔ جان ڈی۔ راک میلر نے ایک سنڈے سکول خطاب میں

دعویٰ کیا۔ "—— کسی گھرانے کا بڑا بزنس گھرانہ بن جانا دراصل بقائے اصلح ہے ---- امریکی گلاب کچھ ایسی آب و تاب اور خوشبو کے ساتھ اگایا جا سکتا ہے جو دیکھنے والے کو سراپا مسرت بنا دے مگر اس کے لئے لازم ہے کہ ان کلیوں کی قربانی دی جائے جو اس کے اردگرد لگتی ہیں۔ تجارت میں یہ بری رسم نہیں ہے یہ تو اصل میں خدائی قانون یا قانون قدرت ہے" —— چنانچہ دائرہ مکمل ہوا۔ ڈارون نے نظریہ ارتقا وضع کرتے وقت معاشرتی نظریہ سازوں مالتھس اور سپنسر کے بعض بنیادی خیالات مستعار لئے۔ اور سپنسر اور دیگر نظریہ سازوں نے اپنے معاشرتی نظریوں کی تقویت کے لئے فوراً ڈارونزم کو استعال کیا اور انہیں زور دار قانون قدرت بنا کر پیش کیا۔

ڈارونزم اور انیسویں صدی کے معاشرتی نظریوں کے باہمی اثرات کے اس تجزیے کو دراصل وکٹورین عہد کی اس تصویر تک پھیلایا جائے جو ڈارون نے بنائی ہے اور جس میں مختلف جنسوں کے درمیان تعلقات اور ارتقا میں انسانوں اور جانوروں' نر اور مادہ کے کرداروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ڈارونزم میں نفسیات کی طرف جو جھکاؤ ہے اسے اکثر تسلیم کیا گیا ہے' لیکن جنس کے بارے میں اس روّیہ کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جس میں مرد کی مرکزیت یا مرد کو محور بنانے کا جھنڈا بلند کیا گیا ہے' انیسوی صدی کی کچھ ایسی خواتین نے اس کا نوٹس لیا تھا جو خواتین کے حقوق کا شعور رکھتی تھیں۔ 1970ء تک ڈارون کے نظریے کے اس پہلو کو نہیں کھنگالا گیا مگر اس کے بعد خاتون سائنسدانوں اور مورخوں کو ڈارون میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ ڈارون کی زندگی میں انٹوئنٹ براؤن' بلیک ویل اور ایلیزا برٹ گیمبل جیسی خواتین نے اس کے دلائل میں موجود مرد کے حق میں تعصب کی طرف توجہ دلائی۔ مگر ان خواتین کا مرتبہ' ڈارون اور سپنسر کے برابر تھا اور نہ ہی سائنٹیفک تجربہ۔ ان کی تعلیم محدود تھی انہوں نے نہ عالمی سفر کئے تھے کہ دنیا کے معاملات میں حصہ لے سکتیں۔ پیشہ ور لکھنے والے شائد ہی ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے حوالہ دیتے یا ان کے وجود کو تسلیم کرتے۔ یہ کتابیں تو خیراب بھی ناپید ہو گئی ہیں۔ ڈارون کے نظریہ میں نر کو جو مرکزیت دی گئی ہے اسے صرف تاریخی وجوہ کی

بنا پر ہی بے نقاب نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس لئے بھی کہ آج بھی یہ نظریہ علم حیاتیات کے نظریوں کا اٹوٹ انگ ہے اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

ڈارون اپنی کتاب (1856) میں "جنسی انتخاب" کی تعریف یوں کرتا ہے کہ یہ ایک ایسا میکنزم ہے جس کے ذریعے ارتقا کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس بات میں وکٹورین عہد کے مردانہ تعصبات صاف جھلکتے ہیں۔

"انتخاب کی بنیاد دوسرے نامیاتی وجودوں کے حوالے سے یا باہر کے حالات کے مقابلے میں بقا کے لئے جاری جدوجہد پر نہیں ہے بلکہ ایک جنس کے افراد عموماً نروں کی اس جدوجہد پر ہے جو وہ مخالف جنس پر قبضہ کرنے یا اس پر حاوی ہونے کے لئے کرتے ہیں۔ عموماً وہ طاقتور نر جو دنیا میں زندہ رہنے کی بہترین قابلیت رکھتے ہیں وہی زیادہ اولاد یا نسل چھوڑیں گے۔ مگر بعض معاملات میں صرف طاقت ہی کام نہیں آتی بلکہ نر کے مخصوص ہتھیاروں پر بھی نسل کشی کا دارومدار ہوتا ہے۔"

وکٹورین عہد میں مرد فاعل اور عورتوں کے انفعالی ہونے کی یہ تصویر اسی پیرا کے بعد کے حصے میں زیادہ واضح کر دی گئی ہے۔ "بعض پر دار کیڑوں میں (شہد کی مکھیاں بھڑیں اور چیونٹیاں) نروں کے بارے میں بے مثال مشاہدہ کرنے والے ایم نیبرنے اکثر مشاہدہ کیا ہے کہ وہ ایک خاص مادہ کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں جو ان کے سامنے' ہر ایک سے قطع تعلق کر کے بیٹھی ہوتی ہے اور پھر ان میں سے جو فاتح ہوتا ہے اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔"

ڈارون اس عمل کو انسانوں پر منطبق کرتا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ "کئی نر پرندے مادہ کے سامنے عجیب و غریب مسخریاں کرتے ہیں' مادہ پہلے تماشائی بنی رہتی ہے اور پھر سب سے دلکش نر کو ساتھی منتخب کر لیتی ہے۔" تاہم ڈارون کو پریشانی اس بات پر ہے کہ ممکن ہے کہ یہی رویہ جنت کی مورنیوں اور مادہ پرندوں کا ہو جن کا یہ رقص ہر کسی کو پسند آ سکتا ہے۔ یہ شبہہ کی بات ہے کہ مادہ پرندے کی نظر میں (جنگلی ٹرکی مرغ کے سینے پر بالوں کا گچھہ) آرائشی حیثیت رکھتا ہو۔ چنانچہ ڈارون یہ کہہ کر اس مختصر بحث کو ختم کر دیتا ہے کہ "وہ تمام جنسی اختلافات

کو صرف اس طریق سے متعلق نہیں سمجھنا چاہئے۔"

کچھ لوگ شائد یہ کہہ کر ڈارون کا دفاع کریں کہ شہد کی مکھیاں (یا پرندے یا جو بھی آپ سمجھ لیں) ایسا ہی مظاہرہ کرتی ہیں مگر ڈارون ان رویوں کو بیان کرتے ہوئے جو زبان استعمال کرتا ہے اس کی بنا پر وہ ایک معروضی مشاہدہ کرنے کے اوصاف سے محروم رہتا ہے۔ اس نے جن جانوروں کا ذکر کیا ہے وہ وکٹورین عہد کے لکھے ڈرامے کے کردار نظر آتے ہیں۔ یہاں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان مشاہدات کے وقت ڈارون نے اپنے تعصبات کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور یہ کہ اس نے جانوروں کے رویے کا انسانوں پر اطلاق کا مشکل سوال حل کر لیا ہے تاہم ڈارون خود کو خفت سے بچانے کے لئے اس قسم کی کوششیں کرتا ہے۔

اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ڈارون غور و فکر جاری رکھتا ہے اور 1871ء میں ایک اور کتاب "نزول انسان اور جنس کے حوالے سے انتخاب" چھاپتا ہے جس میں وہ پہلی کتاب کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے بتاتا ہے کہ جانوروں اور انسانوں کے ارتقا کے عمل میں جنسی انتخاب کس طور کام کرتا ہے۔

دوسری کتاب کی اشاعت پر مذہبی بنیاد پرستوں نے بہت شور مچایا انہوں نے کہا کہ بائبل نے انسان کو جو خاص مقام دیا تھا ڈارون نے اسے وہاں سے گرا کر ایک دوسری قسم کا جانور ہی بنا دیا ہے۔ مگر ڈارون نے تو اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ڈارون نے جو مرکب تیار کیا تھا اس سے علم حیاتیات میں نر کی بالادستی' یا نسل انسانی کے حق میں تعصب کا معاملہ ختم نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اس نے جانوروں کے رویے کی اپنے عہد کے معاشرتی اور اخلاقی نظریوں کے مطابق تعبیر کی اور پھر "فطری حقائق" کہہ کر علم حیاتیات کا حصہ بنا دیا۔

ایک طرح سے بشر کو محور بنانے کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان نے ہی دنیا کی چیزوں کو نام دیا' انہیں مختلف خانوں میں بانٹا اور ان میں ہم یعنی انسان خود ہی شامل ہیں۔ خواہ ہم سیدھے کھڑے ہونے کی صلاحیت' تقابل پذیر انگوٹھوں' اپنے دماغ یا اپنی زبان کو الگ صفات کہیں بہرطور ہم بھی مخلوق ہیں'

باقی سب سے مختلف مگر اپنے بارے میں ہمارا جو سائنٹفک رویہ ہے وہ بہت زیادہ نرپرستانہ ہے۔ نزول انسان دراصل اسی مرد کا سفر ہے۔ ایلین مارگن نے صحیح کہا۔

"مرد کے لئے یہ بہت مشکل کام ہے کہ وہ اپنے آپ مخلوق کا محور یا آفاق کا مرکز سمجھنے کی عادت ترک کر دے۔ وہ غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ ارتقا کی سب سے اہم کڑی وہی ہے اور عورت اسی طرح سیارے کے طور پر اس کے گرد گھومتی ہے جس طور چاند زمین کے گرد گھومتا ہے اس طرح وہ اپنے آباؤ اجداد یا آفرینش کی بعض اہم کلیدوں کو نظرانداز کر دیتا ہے اور بعض اوقات ایسے بیانات بھی دے دیتا ہے جو انتہائی بے ہودہ ہوتے ہیں ---- بے شمار کتابیں اکثر اوقات خواتین کے کردار کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ وہ عورت کو اچانک اس وقت گھسیٹ کر سٹیج پر لاتی ہیں جب معاملہ جنس اور آفرینش یا پیدائش کا شروع ہوتا ہے اور پھر کہا جاتا ہے۔ "جان من اب تم جا سکتی ہو" اس کے بعد وہ وہ اپنے ہیرو —— عظیم شکاری —— اس کے خوبصورت ہتھیاروں' اس کی سیدھی ٹانگوں اور ساحلوں پر اس کی دوڑ پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ عورت کے کردار کو شکاری کے ارتقا کی نقل سمجھا جاتا ہے یا یہ کہاجاتا ہے کہ اسے شکاری مرد کے حظ اٹھانے کے لئے بنایا گیا ہے۔"

انسانی ارتقا کے بارے میں ڈارون کے بعد کے زمانے کی سوچ میں وکٹورین عہد کی جڑوں کو ننگا کرنے کے لئے ہمیں ڈارون کی کتاب "نزول" میں جنس کے انتخاب کے بارے میں خیالات کو دیکھنا ہو گا۔ "جنس کے انتخاب کے اصول" والے باب کی سٹیج وہ سرگرم اور متلاشی نر یا مرد سے سجاتا ہے۔

"جو جانور جنس کے لحاظ سے منقسم ہیں ان کے نر اور مادہ کے پیداواری عضو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ بنیادی جنسی صفات ہیں۔ ہنٹر نے جن جنسی صفات کو ثانوی حیثیت دی ہے ان کا تعلق

براہ راست افزائش نسل سے ہے۔ ان میں بھی نر اور مادہ میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً نروں میں ایک خاص قسم کی چال اور حس ہوتی ہے جس سے مادہ بالکل محروم ہوتی ہے یا یہ صفات مادہ کے مقابلے میں نر میں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں تاکہ وہ مادہ کو دیکھے اور فوراً اس کے پاس پہنچ سکے۔ اور پھر نر کی خاص صفات (عضو) یہ بھی ہوتی ہیں کہ وہ مادہ کو مضبوطی سے پکڑ کر قابو رکھ سکے۔

مزید ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے "نر کو زیادہ سے زیادہ افزائش نسل کا فریضہ انجام دینے کے لئے زیادہ مشتاق اور جذبات سے مملو ہونا چاہئے اور لازمی بات ہے کہ اس صفت کے لئے اسے زیادہ خوبیوں سے لیس ہونا چاہئے۔ مادہ، نر کے مقابلے میں کم اولاد چھوڑنے والی ہوتی ہے۔

مگر ڈارون، جب بعض ایسے جانوروں کو دیکھتا ہے جن میں نر اور مادہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے تو وہ پریشان ہوتا ہے۔ جیسے جنس کے انتخاب کا ایک دوہرا عمل بھی کارفرما ہے کہ نروں نے سب سے زیادہ دلکش مادائیں انتخاب کرلی ہیں اور ماداؤں نے زیادہ پرکشش نر---- مگر جانوروں کی عادات کے باعث یہ نقطہ نظر بھی مضبوط نہیں ہے کیونکہ نر کسی بھی مادہ سے اختلاط کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ اب بات سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی۔ جانوروں کی طرح مرد بھی ان عورتوں کو مائل کر رہے ہوتے ہیں جو اپنی بے رونق آنکھوں کو نیم وا کئے مضبوط ترین خوبصورت مرد کی تلاش میں ہیں۔ کیا یہ بات وکٹورین عہد کے ایک شریف آدمی کی خواب میں تکمیل پانے والی خواہش نہیں ہے؟"

یہاں ڈارون کے طویل مکالمات پر تفصیل سے بحث کا مقام نہیں ہے۔ اب پھر پہلے حوالے سے شروع کرتے ہیں —— "آدمی عورت کے مقابلے میں زیادہ حوصلہ مند، جنگ جو اور تنو مند ہے اور اس میں ایجاد یا تخلیق کرنے کی صلاحیت بھی زیادہ ہے" وحشی قبائل میں نڈر اور جنگ جو آدمی عورتوں پر قبضہ کرنے کے لئے ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ اس لڑائی کے باعث دونوں اصناف کی ثانوی جنسی صفات متاثر ہوتی ہیں۔ ڈارون یہ گنجائش چھوڑتا ہے

کہ اس بات پر کچھ اختلاف ہے کہ آیا عورتوں اور مردوں میں "فرق موروثی" ہے؟ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے اگر جانوروں سے مقابلہ کیا جائے تو لگتا ہے کہ "ایسا ہی ہو گا" دراصل "لگتا ہے عورت ذہنی اعتبار سے مرد سے مختلف ہے۔ عورت میں نرم و نازک احساسات زیادہ ہیں' اور خود غرضی کم ہے" جبکہ مرد دوسرے مردوں کا حریف ہوتا ہے' وہ مقابلے پر خوش ہوتا ہے اس طرح ایک غرض یا خواہش پیدا ہوتی ہے جو بڑی آسانی سے خود غرضی میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ موخرالذکر صفات فطری ہیں اور بدقسمتی سے مرد کا پیدائشی حق"

صفات میں اس فرق سے شاید یہ سمجھا جائے کہ آخر کار عورت کو مرد سے بہتر قرار دے دیا گیا ہے مگر ایسا نہیں ہے:

"دو اصناف (مرد اور عورت) میں سب سے بڑا فرق اور امتیاز عقل و دانش کی صلاحیتوں کا ہے' مرد نے جس شعبہ میں قدم رکھا عورت کے مقابلے میں اعلیٰ حیثیت حاصل کی۔ خواہ معاملہ فکر کی گہرائی کا ہو' عقل یا تخیل کا یا عقل اور ہاتھوں کے استعمال کا' اگر شاعری' مصوری' مجسمہ سازی' موسیقی (کمپوزنگ اور گائیکی) تاریخ' سائنس اور فلسفہ میں عورتوں اور مردوں کی الگ الگ فہرستیں بنائی جائیں اور ہر عنوان کے نیچے نصف درجن مردوں اور عورتوں کے نام ایک دوسرے کے مقابل لکھے جائیں ـــــ تو ان میں کوئی مقابلہ ہی نظر نہیں آتا۔ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر متعدد شعبوں میں مردوں کو عورتوں پر واضح برتری حاصل ہے تو ایک مرد کی اوسط ذہنی صلاحیت ایک عورت کی اوسط ذہنی صلاحیت سے کہیں زیادہ ہے۔ انہیں (مردوں کو) اپنی عورتوں اور بچوں کو ہر قسم کے دشمنوں سے بھی بچانا ہوتا ہے اور مشترکہ طور پر گزر اوقات کے لئے شکار بھی کرنا ہوتا ہے۔ دشمنوں سے بچنے یا ان پر کامیاب حملہ کرنے' جنگلی جانور پکڑنے اور ہتھیار بنانے کے لئے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں مثلاً مشاہدہ' عقل اور دلیل ایجاد یا تخیل بھی درکار ہوتا ہے۔ اس طرح متعدد صفات کے حوالے سے آزمائش ہوئی

ہو گی اور اس آزمائش میں مرد کو منتخب کیا گیا ہو گا۔"

یوں بحث ختم ہوتی ہے کہ "اس طرح مرد نے عورت کے مقابلے میں برتری حاصل کر لی" اور یہ اچھی بات ہے کہ مرد اپنی خصوصیات اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں میں بھی منتقل کرتے ہیں۔ وگرنہ یہ ممکن تھا کہ عورت کے مقابلے میں ذہنی طور پر اس قدر بلند اور برتر ہو جاتا ہے جیسے مورنی کے مقابلے میں پروں کی زیب و آرائش کے اعتبار سے مور کو بلند مقام حاصل ہے۔"

مختصراً یہ کہ شکار اور عورتوں کے حصول میں مقابلوں کی وجہ سے مردوں کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں مسلسل ترقی پاتی رہیں، جبکہ اگر خوشگوار حالات نہ ہوتے اور مرد اپنی اگلی نسل کی بیٹیوں میں اپنی ذہنی صلاحیتیں منتقل نہ کرتے تو عورتوں کا دماغ بالکل خالی ہوتا۔

ڈارون کے اپنے عہد کے روائتی رویوں کو قبول کرنے کی ایک اور مثال شادی اور یک زوج کے ارتقا کی اس تعبیر میں ملتی ہے۔

"لگتا ہے کہ شادی (جس کا محدود مفہوم رائج ہے) کی عادت آہستہ آہستہ پڑی۔ کسی زمانے میں ساری دنیا میں عام جنسی آزادی یا عام اختلاط ہوتا تھا۔ تاہم جانوروں کی دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ جنسی اعتبار سے جانوروں میں بڑا زور دار حسد ہوتا ہے چنانچہ ان کے حوالے سے میں یہ نہیں مان سکتا کہ گزشتہ زمانوں میں کبھی مکمل جنسی آزادی ہوا کرتی تھی۔"

ڈارون کا اخلاقی لہجہ قابل توجہ ہے۔ ڈارون کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حیوانات یا جانوروں کی ساری بادشاہی میں حاسدانہ احساسات وجود رکھتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لئے یہاں ا۔ اینگلز کی تحریر سے اقتباس دلچسپ رہے گا، ا۔ اینگلز نے بھی انہی انسانی وسائل پر اپنی رائے قائم کی ہے جن پر ڈارون نے کام کیا تھا۔

"ہماری تمام معروضات سے جنس کی درجہ بدرجہ ترقی کا حال ظاہر ہوا۔ یہ جن مراحل سے گزری ہے (اجتماعی یا گروپ کی شادی سے لے کر ایک جوڑے کی شادی جسے وہ یک زوج کے ساتھ ساتھ زنا کاری

اور جسم فروشی کا بھی حصہ بنا تا ہے) وہ خاص طور پر عورتوں سے مخصوص ہے مردوں سے نہیں کیونکہ اس طرح اجتماعی شادی کے خاتمے کے ساتھ عورتوں کی جنسی آزادی بھی کم ہو گئی۔ دراصل مردوں کے لئے تو اجتماعی شادی کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ ایک عورت کے لئے جو بات جرم سمجھی جاتی ہے اور جس پر اسے سنگین قانونی سزا دی جاتی ہے اور اسے معاشرتی نتائج بھگتنے پڑتے ہیں' یہی جرم مرد کے لئے ایک اعزاز سمجھا جاتا یا زیادہ سے زیادہ اس پر بداخلاقی کا تھوڑا سا الزام آتا ہے مگر وہ اسے خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے ----- یک زوجی سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ایک فرد ـــــ مرد ـــــ کے ہاتھ میں بہت سی دولت آ گئی اور جب یہ ضرورت لاحق ہوئی کہ یہ جمع شدہ دولت اس کے بچوں کے علاوہ کسی اور کو منتقل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے یک زوج (صرف عورت کے لئے' مرد کے لئے نہیں) سلسلہ شروع ہوا چنانچہ عورت کی واحد شادی یک زوجی مرد کی چھپی یا کھلی تعدد ازواج کی راہ میں حائل نہیں تھی"

صاف ظاہر ہے کہ اینگلز نے وکٹورین عہد کے رویوں کو ہمارے فطری حیاتیاتی ورثے یا روایت کے طور پر قبول نہیں کیا۔

سائنٹیفک جنس کی اور صورتیں

اس صدی کے پہلے نصف میں جنسی انتخاب کے نظریے کو زوال ہوا۔ ڈارون نے جو مثالیں دی تھیں ان کی تصدیق کے لئے کوشش کی گئی تو پتہ چلا کہ جنسی اختلاط کے سلسلے میں اس نے جن خطوط کو کامیاب سمجھا تھا وہ صحیح نہیں تھے۔ تاہم بعد میں یعنی کچھ عرصہ پہلے اس نظریہ کو پھر وقعت مل گئی اور نسل کشی کے لئے فٹ ہونے کے بارے میں بحث مباحثہ کے دوران جنسی انتخاب کی مثالیں دی گئیں چنانچہ انسانی ارتقا پر مزید بحث سے پیشتر جنسی انتخاب اور جانوروں میں (نباتات میں بھی) جنسی کرداروں کے بارے میں عصری رویوں پر نظر ڈالنا مفید ہو گا۔

آیئے قصہ بحری کائی سے شروع کرتے ہیں جس کے بارے میں شائد کسی کو یہ خیال ہو کہ اس میں جنسی اعتبار سے سدا ایک سی صورت نہیں رہ سکتی۔ وولف گانگ وکلررو (23 / 1973) حیاتیاتی پروفیسر یونیورسٹی میونخ کی کتاب کے دیباچے میں کونرڈ لورنیز نے اس موضوع (جنسی رویوں کے روپ) کو بیمار اور صحت مند جنسی رویوں کے تعین کرنے کے سلسلے میں بہت اہم قرار دیا ہے۔

بحری کائی جیسی ساری نباتات میں خلئے آگے پیچھے اس طرح ہوتے ہیں کہ دھاگا سا لگتے ہیں۔ جنسی اختلاط کے دوران مشاہدہ میں آیا کہ ایک دھاگے کا نر خلیہ دوسرے دھاگے کے خلئے کو مادہ کے طور پر اور تیسرے دھاگے کے خلئے کے سامنے مادہ کے طور پر ہوتا ہے۔ نر خلیہ کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تیر کر یا رینگ کر دوسرے خلئے کے اوپر چلا جاتا ہے۔ مادہ خلیہ منفعل رہتا ہے" یہ دائرہ بنانا بڑا آسان ہے۔ اس طرح وکٹورین عہد سے لے کر اب تک کے زمانوں میں جانور کائی، جراثیم اور انسانوں کو دیکھئے تمام انفعالی رویے والوں کو زنانہ اور متحرک اور بامقصد رویے والے کو مردانہ رویہ کہا جاتا ہے اور یوں وکٹورین سٹیریوٹائپ مرد کا رویہ حیاتیاتی اعتبار سے متعین ہو گیا۔ اور تو اور بحری کائی کا بھی جنسی رویہ اسی ڈھنگ سے متعین کیا گیا۔

لیکن ٹھہریئے آیئے دیکھئے گانک وکلر، روکی ماؤنٹین کی بڑے سینگوں والی بھیڑوں کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ جنہیں صرف دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا کہ ان میں نر کون ہے اور مادہ کون ہے۔ عجیب بات ہے کہ آٹھ سال کے مینڈھے اور ایک سال کے لیلے میں صرف عمر کے ظاہراً فرق کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں ہوتا، جسم کی ساخت، سینگوں کی صورت، اور اون کا رنگ نر اور مادہ دونوں کے ایک سے ہوتے ہیں۔" ہمیں بتایا گیا ہے کہ "نر بھیڑ بھی عموماً مادہ کی شناخت نہیں کر سکتا" کیونکہ نروں کو بھی صرف جنسی ضرورت کے دنوں میں مادہ سے دلچسپی ہوتی ہے" ــــ مگر وکلر کو کیسے علم ہوا کہ نر مادہ کو نہیں پہچانتا؟ شائد یہ بھیڑیں ایک انوکھی مخلوق ہیں اور ان کا رویہ کسی عورت سے ہی ملتا جلتا ہے کہ جب اختلاط کی ضرورت ہوئی تو اس مادہ (عورت) کے لئے سیٹی بجادی اور کام ہو گیا۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ مادہ بھیڑوں کا رویہ کیا ہوتا ہے؟ اور بات حیران کن ہے۔ "دونوں اصناف دہرا کردار ادا کرتے ہیں۔ یا نر کا یا نوجوان نر کا' جفتی کے دنوں کے علاوہ مادہ' نوجوان نر کے رویے کا مظاہرہ کرتی ہے اور جفتی کے دنوں میں جارح نر کا رویہ اختیار کرتی ہے۔" ——"ان بھیڑوں میں لیلے سے لے کر مینڈھا بننے تک مرحلہ وار بڑھوتری کی ایک جیسی ہے اور مادہ بھیڑیں ایسا رویہ رکھتی ہیں جیسے وہ نر ہوں --- جن کی بڑھوتری میں نقص رہ گیا ہے ---- ہم کہہ سکتے ہیں کہ بھرپور پہاڑی بھیڑ ہی طاقتور مینڈھا بنتا ہے" آخر کار مردانہ تعصب کی مثال سامنے آ ہی گئی --- مادہ کو ہمیشہ نر کے معیار سے دیکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ نوجوان نر اور بعض اوقات بڑے نر جیسی نظر آتی ہیں۔ مگر بقول وکلر مادہ بھیڑیں مکمل جسمانی ساخت اور اس نوع کے رویے کو نہیں پہنچتیں۔ وکلر کی نظر میں یہ مقام صرف نر کے لئے مخصوص ہے۔ وکلر کی ہر بحث ویلیریس گیسٹ کی کتاب "پہاڑی بھیڑ Mountain Sheep میں درج مشاہدات پر مبنی ہے جس میں بے شمار ایسی مثالیں ہیں جن میں مردانہ تعصبات کی جھلک ہے اور مشاہدات پر بھی مردانہ فوقیت کا رنگ آ گیا ہے اور ان مشاہدات کی تعبیر میں بھی اس رنگ کا عکس موجود ہے۔

"ایک سے" مینڈھے اکٹھے ہوتے ہیں' جو عموماً اجنبی ہوتے ہیں' دونوں ایک دوسرے کو مادہ سمجھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے سے لڑنے لگتے ہیں تا آنکہ ان میں سے ایک مادہ کا روپ دھار لیتا ہے یہ وہ ہوتا ہے جو جنگ ہار جاتا ہے۔ دونوں مینڈھے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں' ایک دوسرے کو مارتے ہیں' تا آنکہ ان میں سے ایک ہار مان لیتا ہے اور دوسرے کی مار بغیر کسی چوں و چرا کے سہتا جاتا ہے' ہارنے والے کو مار بھگایا نہیں جاتا' لڑائی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ دوسرے کو مار دیا جائے لولا لنگڑا کر دیا جائے یا بھگا دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ مادہ کا سا سلوک کیا جائے۔"

اگر اس فعل کی تعبیر محض ایک لڑائی کی بجائے دوسرے افعال مثلاً

اغلام بازی' محض کھیل یا ایک روائتی رقص کے طور پر کی جاتی تو اس کا بیان یقیناً بہت مختلف ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فعل میں ایسا کوئی عنصر نہیں جسے ہم لڑائی سے منسوب کرتے ہیں لیکن چونکہ (Giest) گیسٹ اس کو فطری جماع اور جارحیت کے زمرے کے روپ میں دیکھتا ہے اس لئے الجھن کا سبب بن جاتا ہے۔

اگر نر اور مادہ میں جنسی فرق یا ان کا رویہ غیر معمولی ہوتا تو ایسی مثال پر بحث کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر یہ رویہ آج کی معاشرتی حیاتیات' علم سیرت سازی' اور ارتقائی حیاتیات کا اہم حصہ ہے۔ جارج ولیمز (1975) کی کتاب جنس اور ارتقاء (Sex and Evolution) کو اعلیٰ حوالہ جاتی کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں تعصبات پر مبنی بیانات بھرے پڑے ہیں۔ جنہیں محتاط اور بے تعصب تحقیقی رپورٹوں کا نام دیا گیا ہے مگر ان میں مردانہ تعصب یا نر کی برتری کے حق میں متضاد اور غلط باتیں لکھی گئی ہیں۔ مردانہ اور زنانہ صفات پر بحث' پائپ فش' سمندری گھوڑے' کچ لڈز اور کیٹ فش کے رویے کے حوالے سے کی گئی ہے کیونکہ دونوں اصناف' بچوں کی دیکھ بھال ایک طرح سے کرتی ہیں۔

اب بحث ہو جائے ولیمز کی کتاب کے باب 'بعنوان "نر مردانہ اور مادہ زنانہ صفات کے حامل کیوں ہیں اور بعض اوقات معاملہ الٹ کیوں" پر اس عنوان سے ہی ایک جھٹکا لگتا ہے۔ اگر لفظ مردانہ اور زنانہ کا مفہوم نر اور مادہ سے نہیں ہے تو پھر انہیں سائنٹیفک معنوں میں کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ بہر حال آیئے اسے پڑھتے ہیں۔ پہلے صفحے پر لکھا ہے "معروف اعلیٰ درجے کے جانور اپنے بچوں میں کم دلچسپی لیتے ہیں البتہ باہمی ناز و نیاز (کورٹ شپ) میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں' ساتھی کے انتخاب میں زیادہ پسند ناپسند کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ آزاد جنس یا تعدد ازواج کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور جھگڑالو ہوتے ہیں" اب ہم پھر ڈارون کی طرف آ گئے ہیں۔ کوائف حسب معمول بودے ہیں۔ لیکن کیا یہ نقشہ آپ کے نواح میں بسنے والے خاندانوں کا ہی نقشہ نہیں ہے؟

اہم سوال یہ ہے کہ "معروف اعلیٰ درجے کے جانور" کون ہیں؟ کیا ان کا رویہ ایک جیسا اور ناقابل تبدیل ہے یا ہم ان سے اس لئے واقف ہیں کہ گزشتہ

ایک صدی سے مردانہ تعصب والے سائنس دانوں نے صرف ان جانوروں پر غیر معمولی توجہ دی ہے جن کے رویے انسانی معاشرتی رویوں سے ملتے جلتے ہیں اور جنہیں وہ حیاتیاتی جبریہ قرار دے کر یہ کہیں گے کہ ان پر ہمارا اختیار نہیں ہے، یعنی ان کے رویے ناقابل تبدیل ہیں۔

ولیمز نے اس بات کو جو عمومی رنگ دیا ہے اس سے قول متناقص بھی پیدا ہوا ہے۔ اگر ہر فرد اپنی جنس کو نر بنانے کے چکر میں ہے تو پھر مادہ اپنے انڈوں کو زرخیز کرانے میں نر کے زرخیز کرنے کے جوش کے مقابلے میں کم جوشیلی کیوں ہو، بچے ایک ہی صنف کو زیادہ عزیز کیوں؟" —— جو لوگ آج کا نظریہ ارتقا سے واقف نہیں ہیں ان کے لئے اس جملے کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ فرد کے فٹ ہونے کا تعین اس بات سے کیا جاتا ہے کہ نر یا مادہ کے بچوں میں سے کتنے بلوغت (نسل کشی کے قابل ہونے تک) تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ "بقائے اصلح" کا قول یہ حقیقت بتاتا ہے کہ نظریہ ارتقا کی تاریخ ان مخلوقات کی کہانیوں کا ست یا نچوڑ ہے جو زیادہ سے زیادہ وارث چھوڑ جاتی ہیں "اپنی صنف میں زیادہ سے زیادہ اضافہ" سے مراد یہ ہے کہ ہر کوئی یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی صنف کے زیادہ سے زیادہ بچے چھوڑے جو نسل کشی کے اہل ہوں (یہاں ارادہ یا نیت کا) سوال قابل توجہ ہے اس ارادہ یا نیت کا ذکر انسانوں کے زمرے میں نہیں کیا گیا جو بالارادہ بچوں کی تعداد محدود رکھتے ہیں۔ نہ ہی دوسرے جانوروں سے اس قسم کی بات منسوب کرنے کا کوئی جواز ہے۔

چنانچہ یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ جانوروں میں مادہ اور نر دونوں اپنے بچوں کے آدھے آدھے ورثے کے ذمہ دار ہیں تو نر اور مادہ دونوں اس بات پر زور لگاتے ہوں گے کہ ان کی صنف کے بچے زیادہ سے زیادہ ہوں۔ تاہم ہمیں علم ہے کہ پدری اصول کے مطابق نر جنسی سرگرمیوں میں مادہ کے مقابلے میں زیادہ سرگرم ہوتا ہے۔ ولیمز کا "مادہ کے جنس کے بارے میں کم جوشی" سے یہی مطلب تھا کہ نر کے مقابلے میں مادہ کی دلچسپی کم ہوتی ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "عموماً" مادہ کا بچوں کی پرورش میں بہت زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ (یعنی مادہ بچوں کی بقاء

میں زیادہ کردار ادا کرتی ہے) تو پھر یہ بے ڈھنگا پن کیوں؟ بیان یا وضاحت یہ ہے ــــ "جنس یا اصناف میں فرق یہ ہے کہ مادہ غیر متحرک بڑے نسبی خلئے پیدا کرتی ہے جبکہ نر چھوٹے مگر متحرک، یہی فرق ان دونوں کے طریق کار کا تعین کرتا ہے۔ اگر آپ کو اس بات پر حیرت ہے کہ مرد کیوں آزاد جنس کے قائل ہیں اور عورتیں بڑی وفاداری کے ساتھ گھروں میں بیٹھی بچوں کی پرورش کر رہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد "بڑی تیزی سے انزال کئے گئے خلئے دوبارہ بنا لیتا ہے اور ایک اور جماع کے لئے تیار ہو جاتا ہے" اس کے مقابلے میں عورت اتنی تیزی سے اپنے خلئے دوبارہ نہیں بنا سکتی یا اپنے خلیوں کے لئے دوسرے مرد (باپ) کا اہتمام نہیں کر سکتی" چنانچہ مادہ یا عورت کو اپنے ساتھی کے انتخاب میں حد درجہ احتیاط کرنی چاہیے۔ اگرچہ یہ تفصیلات یا خصوصیات ان حیوانی انواع سے مخصوص ہیں جو جماع کرتے ہیں مگر دنیا بھر میں انسانوں نے جماع کا جو گھریلو انتظام کیا ہے ان پر پورا نہیں اترتیں۔ یہ خصوصیات پدر سری نظام کے گھرانوں پر ضرور پورا اترتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ نر کے حق میں متعصب علم حیاتیات حسب معمول ہمارے معاشرتی انتظامات یا ڈھانچے کو جواز فراہم کرنے میں مصروف ہے۔

1948ء میں روتھ ہرشبرگر نے "آدم کی پسلی" Adam's Rib کے عنوان سے دلچسپ کتاب لکھی جس میں اس نے جنسی امتیازات کے سلسلے میں مردانہ تعصبات کے قصے کہانیوں کی بھد اڑائی ہے۔ "سوسائٹی بیالوجی تحریر کرتی ہے" کے عنوان کے تحت اس نے ایک ایسے پھرتیلے تیز طراز خلئے کے پدرسری معاشرے کی طرف سے مادری معاشرے میں موجود ست مگر منتظر خلئے کی طرف سفر کی داستان لکھی ہے۔ اس میں بڑا انڈا مرکزی کردار ادا کرتا ہے اور ہم ان لاکھوں نحیف و نزار اور نسل کشی کے نااہل خلیوں کی حالت پر صرف افسوس کا اظہار کر سکتے ہیں۔ صرف اس زبان کو دیکھئے جو نسل کشی یا زرخیزی کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ ہم کہتے ہیں خلئے نے ایک انڈے کو زرخیز کیا (جاگ لگائی) یہ فعل متحرکہ ہے اور انڈا زرخیز ہوا یا اسے جاگ لگی (فعل مجہول) ہے۔ گرامر حیاتیاتی حقیقت کو بیان نہیں کرتی اور حیاتیاتی حقیقت یہ ہے کہ دو خلئے ایک عمل

شروع کرتے ہیں جس میں دونوں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ گرامر سے صرف تذکیر و تانیث کا نظریہ منعکس ہوتا ہے جس میں نر متلاشی یا سرگرم ہوتا ہے اور مادہ مفعول۔

جنسی انتخاب کے نظریہ کے دوبارہ موضوع بننے یا جی اٹھنے اور معاملہ کے بے ڈول یا بے ڈھنگے ہونے کو مادہ اور نر کی "سرمایہ کاری" سے منسوب کرنے کے رحجان کا بھی خواتین کی تحریک کی تجدید سے گہرا تعلق ہے۔ ہمیں یاد ہونا چاہیئے کہ خواتین کی بیداری کی پہلی لہر کے عین درمیان ڈارون کا جنسی انتخاب یا انتخاب جنس کا نظریہ چھوڑا گیا تھا۔ لگتا ہے کہ جب عورت امور دنیا میں مرد کے برابر حصہ دار ہونے کے لئے آگے بڑھتی ہے' مردانہ تعصب والے سائنس دان یہ ثابت کرنے پر جٹ جاتے ہیں کہ عورت کا فطری مقام اس کا گھر ہے۔

مرد کا ارتقاء

انسانی ارتقا پر ہونے والے موجودہ کام میں بھی ڈارون کے جنس پر اکتا دینے والے سٹیریو ٹائپ افکار کا شہرہ ہے۔ اس شعبہ میں حقائق تو کم ہیں مگر نمونے ہزاروں لاکھوں سال کے لائے جاتے ہیں تاکہ اس طرح تحقیق کرنے والے کو اپنے تعصّبات کے لئے گنجائش نکالنے کی خاطر وسیع موقع مل جائے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تحقیق کرنے والے سارے ہی مرد تھے اس لئے اس تحقیق میں سے اگر وہی شکاری مرد نکلا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیئے یہ انداز اور طریق فکر اتنی دور تک حاوی ہے کہ جب سوانس کومب کے قریب دریائے ٹیمز میں اڑھائی لاکھ سال پرانے زمانے کی کھوپڑی کے ٹکڑے اور پتھر کے بعض ہتھیار ملے تو ماہرین نے بتایا کہ یہ کھوپڑی کسی عورت کی تھی۔ اور پھر ہم نے پڑھا ــــــ "سوانس کومب کی عورت یا اس کا خاوند دستی کلہاڑے بناتا تھا" (سویل 1973-) اب اس کا الٹ جملہ دیکھیئے "سوانس کومب والا مرد یا اس کی بیوی کلہاڑے بناتے تھے" ــــــ مدعا یہ ہے کہ اگر سوانس کومب میں سے ہتھیار بھی برآمد ہوئے ہیں تو ہتھیار عورت نہیں بنا سکتی۔ جبکہ ہتھیار تو بوزنے اور بن مانس بھی بناتے ہیں۔ عورتیں

کیوں نہیں بنا سکتیں؟

اصل بات یہ ہے کہ جب سے فوسلز عہد کی دریافتیں ہوئیں ہیں اور یہ مشاہدہ بھی کیا گیا ہے کہ بوزنے یا بن مانس بھی ہتھیار بناتے اور استعمال کرتے تھے اس وقت سے نظریہ ارتقا میں اس بات پر زور کم ہو گیا ہے کہ ارتقا میں سب سے زیادہ عمل دخل ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے والی طاقت کا تھا۔ اب زور صرف شکار کے لئے بنائے جانے والے اور انسان کے استعمال میں آنے والے ہتھیاروں پر ہے۔ اس طرح ہم شکاری مرد تک پہنچتے ہیں' جسے نہ صرف شکار کے لئے ہتھیار بنانے پڑے بلکہ بڑے جانوروں کے شکار کے لئے ایک معاشرتی ڈھانچہ بھی کھڑا کرنا پڑا۔ اسے دور دراز تک سفر بھی کرنا پڑتا اور غیر معمولی اور مشکل حالات سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان سارے واقعات اور کوائف نے انسان کے دماغ کو حیران کن حد تک تیزی سے ترقی دی اور وہ اپنے عم زاد بوزنوں سے اسی صفت کی وجہ سے ممتاز ہو گیا۔ مثال کیتھ اوکلے (1972)

"جن مردوں نے معیاری قسم کے اوزار بنائے ---- ان میں یہ صلاحیت ضرور ہو گی کہ وہ ان مقاصد کا نقشہ دماغ میں بنا سکیں جن کے حصول کے لئے وہ محنت کرتے تھے۔ اپنے تمام رنگوں اور تنوع کے ساتھ انسانی ثقافت اسی فکر و خیال اور تصور سازی کی صلاحیت کی مرہون منت ہے۔ مگر اس میں سب سے اہم عنصر روایت کے ساتھ ساتھ ایجاد کا ہے۔ ابتدائی شکاری نے جو ہتھیار بنایا وہ ایک ہی قسم کا تھا کیونکہ اس نے بچپن میں اپنے باپ کو ایسا ہی ہتھیار بناتے دیکھا تھا' یا یہ کہ اس نے نواحی قبیلے میں ایک دوسرے شکاری کو ایسا ہتھیار بناتے دیکھا تھا۔ معیاری دستی ہتھوڑا اصلاً کسی ایک شخص یا فرد نے نہیں بنایا تھا' نہ ایک شخص نے سوچا تھا بلکہ نسل در نسل کئی لوگوں نے اس میں ترمیم و اضافہ کر کے اور اپنے آباؤ اجداد کے کام میں بہتر تبدیلی کر کے اسے یہ صورت دی تھی۔ شکار امداد باہمی کی بنیاد پر کھیلنے' نقل مکانی کرنے اور جنس کے بدلے جنس لینے کی ابتدائی صورتوں کے باعث ابتدائی شکاریوں

کے گروپ (قبیلے) آپس میں ملنے جلنے اور ضم ہونے لگے تھے۔"

کیسی خوبصورت غیب دانی کے ذریعے اتنی تفصیل کے ساتھ اس بات کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ اڑھائی لاکھ سال پہلے یعنی ماقبل تاریخ میں کیا کچھ ہوا تھا اور یہ کہ ننھے نے اپنے باپ کے پتھر چھیلنے یا تراشنے والے' پتھر کے بڑے ہتھیاروں کی طرز پر اپنے لئے بھی چھوٹا سا سیٹ بنا لیا تھا۔

یہ معلوم کرنا بڑا مشکل ہے کہ انسان کے ارتقا کے ڈھانچے کی اس قسم کی تعمیر کے پیچھے کون سی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ بوزنے اور انسان میں فرق کوئی پچاس لاکھ سال پہلے شروع ہوا۔ فوسلز کے زمانے کی دریافتوں سے آدمی جو نتیجہ اخذ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے سیدھا کھڑے ہونا سیکھ لیا' دانتوں کا سائز کم ہو گیا' اور دماغ کا سائز بڑا ہو گیا مگر اس ضمن میں جو مادی کوائف اکٹھے ہوئے ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں اور ان کی دریافت کا زمانہ بھی بہت طویل ہے اور بہت دیر بعد ہم وسط حجری عہد میں پہنچتے ہیں۔ یعنی ستر سے چالیس ہزار سال پہلے ——— جب ہمیں ایک جبڑا یا ایک کھوپڑی ملتی ہے۔ پیٹرو کی ہڈیاں ملتی ہیں وہ بھی ٹکڑوں میں۔ ان تھوڑے سے شواہد کی بنا پر ہم نے تصویریں اور مجسمے بنا لئے ہیں' ہم نے زیادہ سیدھے کھڑے مرد جن کے بال کم ہو گئے ہیں بیلچے' پتھر یا کلہاڑے لئے پہلے باشعور انسان کے پیچھے قطار میں دیکھتے ہیں' یا پھر بکھری اور بڑی بھنوؤں اور داڑھیوں والے شکاری دکھائے گئے ہیں جو اپنے کیمپ میں لائے ذبح شدہ جانور پر جھکے ہوئے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف لمبے بالوں' چوڑے چوتڑوں والی عورتیں بیٹھی لٹکتی ہوئی چھاتیوں سے بچوں کو دودھ پلا رہی ہیں۔

میرے خیال میں ٹینسی ٹیز اور اڈرین زیلمین جیسی خواتین' کی شکاری انسان کے ارتقا کے تصور پر تنقید سے گھبرا کر علم الانسانیات کے ماہرین نے' ابتدائی معاشروں کی ترقی میں عورتوں نے جو کردار ادا کیا ہو گا' اس کا ذکر کرنا شروع کر دیا ہے' مگر نقلی اور یک طرفہ (سٹیریو ٹائپ) کام جاری ہے مثلاً ولیم ہوولز (1973) سمجھتا ہے کہ عورتوں کی تنقید جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محنت کی تقسیم کو پھر روایتی نظریے کے مطابق بیان کرتا ہے کہ پتھر کے زمانے کے مرد دور

دور تک گھومتے ہوں گے مگر عورتوں کو اپنے کیمپ سے بس ذرا دور تک جانے کی اجازت تھی ـــــ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ (ہوولز) ان میں سے کسی بات سے بھی باخبر نہیں ہے۔

آدمی یہ بھی فرض کر سکتا ہے کہ خوراک کی فراہمی اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے گروپ بنے ہوں گے کیونکہ بقا کے لئے تعاون کرنا اور حفاظتی طریقے اختیار کرنا ضروری تھا اور افراد میں بھی یہ ذمہ داریاں وسیع پیمانے پر تقسیم ہونگی۔ تاہم یہ واضح نہیں کہ ان کاموں کے بارے میں جنس کی تخصیص کیوں کر دی جائے۔ یہ بات معقول ہے کہ شکار اکٹھا کرنے والے بھی جانتے ہوں گے کہ جو جانور سامنے آجائے اسے کیسے شکار کرنا ہے۔ اور یہ کہ جب شکاری کے شکار کرنے یا پکڑنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو وہ ضروری چیزیں اکٹھی کرتے ہیں اور ان دنوں' مرد اور عورتیں ایک ساتھ شکار یا چیزیں اکٹھی کرتے ہوں گے۔ بہر طور اہم بات تو خوراک کی فراہمی تھی نہ کہ جنس کی تخصیص۔ آج ہی خانہ بدوشوں اور گھوڑوں کی تجارت کرنے والوں میں' بچے پیدا کرنے اور پالنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ عورتیں کہیں آتی جاتی نہیں یا دوسرے کام نہیں کرتیں۔ اور شکار اور دوسری اشیاء اکٹھے کرنے کے لئے لازم ہے کہ عورتیں خاصے فاصلے تک آتی جاتی ہوں گی۔ گھر کے آس پاس لکڑی کاٹنے وغیرہ سے ہی بیجائی کا سلسلہ شروع ہوا' اور اس باعث ہی گھر سے باہر رہنا ضروری ہوا' بلاشبہ صرف فصل کی کٹائی تک ـــــ ان دنوں کھاد بھی استعمال نہیں ہوتی تھی اور فصلیں بھی باری باری نہیں بوئی جاتی ہوں گی۔ اس لئے عورت کو کاشتکاری کے ابتدائی عہد میں کئی کئی بار باہر جانا پڑتا ہوگا۔

چونکہ ہم خود ادھر ادھر زیادہ نہیں جاتے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ جب ہمارے آباؤ اجداد نے کاشتکاری ایجاد کی ہوگی تو شکر کا سانس لیا ہوگا کہ اب انہیں دور دور تک سفر نہیں کرنا پڑے گا۔ مگر خانہ بدوش اور چرواہے وغیرہ اب بھی اپنی خوراک کی خاطر لمبے سفر کرتے ہیں اور یہ لوگ اب بھی موجود ہیں۔ اور جسے "زرعی انقلاب" کہا جاتا ہے اس کے آتے آتے بھی اتنے زمانے لگے ہوں

گے جو ہماری تاریخ کے رقم ہونے کے عرصہ کے مقابلے میں بھی طویل تر ہوں گے۔ غالباً اس زمانے میں کچھ لوگ ایک ہی جگہ پر مستقلاً قیام پذیر ہو گئے جبکہ بعض بدستور خانہ بدوش رہے، جگہ اور موسم کی مناسبت سے، بعض میں دونوں خصائص موجود ہیں۔

ہم نے لاکھوں سالوں پر پھیلی زندگی کی داستان کو غیر معمولی حد تک مختصر اور سٹیریو ٹائپ بنا دیا ہے۔ حالانکہ اس زندگی میں ایسے ایسے مرحلے اور مقامات بھی آئے ہوں گے جن کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے۔ یہ سچ ہے کہ جب تاریخ شروع ہوئی اور یہ زمانہ ہمارے ارتقا کے پورے زمانوں میں ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے تو اس زمانے میں زراعت شروع ہو چکی تھی اور چند گاؤں یا قصبے بھی آباد ہو گئے تھے جن کی آبادی سینکڑوں یا ہزاروں میں ہوتی تھی اس وقت تک کام جنس کے حساب سے تقسیم ہو چکے تھے۔ تاہم علم الانسانیات کے ماہرین نے کہا ہے اور بجا طور کہا ہے کہ محنت کی تقسیم ہر علاقہ میں مختلف رہی ہے اور مختلف ہو سکتی ہے۔ صنف یا جنس کے اعتبار سے کردار متعین کرنے کی معاشی اور معاشرتی وجوہ بھی ہوتی تھیں۔ لیکن ہم ماقبل تاریخ کے ماضی کے ذرہ بھر شواہد کی بنا پر مفروضوں کے پہاڑ کھڑے کر لیتے ہیں۔

اب علم الانسانیات اور علم حیاتیات کے ماہرین ہمارے قریبی رشتہ داروں یعنی بن مانسوں اور بندروں کی عادات و اطوار کا مشاہدہ کر کے سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہاں ایک بات ہے کہ دودھ پلانے والی اعلیٰ مخلوق نر اور مادہ میں ساخت اور معاشرتی حالات کے باعث رویے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ان میں بڑا تنوع ہوتا ہے اس لئے کہ جس قسم کی مثال درکار ہو اسی قسم کے جانور کا انتخاب کر لیا جائے۔ ہاں ایک اور بات، اکثر سائنس دان یہ بات بڑی آسانی سے بھول جاتے ہی کہ آج کے بن مانسوں اور بندروں کے ارتقا کی اتنی ہی لمبی تاریخ ہے جتنی انسانوں کے ارتقا کی ہے۔ نظری اعتبار سے یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں ہمارے آباؤاجداد کے بارے میں زیادہ معلومات اپنے رویوں کے مطالعہ کی بجائے آج کے بندروں اور بن مانسوں کے رویے سے حاصل ہوتی ہیں۔ مگر جیسا

کہ مرد کی برتری اور تعصبات کا ضابطہ ہے کہ مرد کچھ بنا رہا ہے یا ترقی کر رہا ہے اور عورتیں دھوپ میں چھتریوں تلے بیٹھی تالیاں بجا رہی ہیں۔ ایسے جیسے انسان کے حق میں متعصبانہ انداز میں ایک انسان نے ہی ایک نظریہ یا شے بنائی جبکہ بوزنے' درختوں میں سے اس کو داد دینے کے انداز میں دیکھ رہے ہوں۔

انسانی ارتقا کے بارے میں آج کے لٹریچر میں مردوں کے متعلق روائتی قسم کے رویے پر بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن اس ارتقا میں زبان کے کردار کے بارے میں بہت کم بات کی جاتی ہے۔ تاہم بعض اوقات سائنس دان شکار اور شکار کے آلات کے حوالے سے زبان کی بات کرتے ہیں اور یہ بھی دو ایسے کام ہیں جنہیں مردوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ نسبت بے ربط ہے کیونکہ زبان کا تعلق چہرے' دماغ اور اور نرخرے کی بناوٹ سے ہے اور ان سب کا (ارتقا کا) عمل انتہا درجے کا ست رفتار تھا۔ ہتھیار اور شکار ارتقائی مظاہر ہیں جو نسبتاً جلد ہی بنتے ـــــ اور تبدیل ہوتے ہیں۔ جبکہ جسمانی اور عضوی تبدیلیوں کے لئے بہت لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہتھیاروں کے وسیع استعمال اور شکار اور چیزیں اکٹھی کرنے کے باعث جو معاشرتی ترقی ہوئی ہے وہ مرحلہ وار ہوئی ہو اور ان مراحل کے ساتھ ساتھ زبان بنتی گئی ہو جو ایک دوسرے سے اظہار خیال کے لئے ضروری تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حرف اور زبان کے ارتقا نے حیاتیاتی' ثقافتی اور معاشرتی ارتقا میں بڑا ہی اہم کردار کیا ہو' لیکن تعجب کی بات ہے کہ علم حیاتیات کے ماہرین نے اس کی اہمیت کو سرا سر نظرانداز کر دیا۔ اور وہ غالباً اس لئے کہ زبان میں مردانہ طرفداری اور تعصبات کی کم گنجائش ہے۔ آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ عورت باتیں نہیں کر سکتی۔

لسانیات میں تذکیر و تانیث کا فرق

میری لوئیس جینسن جیوریٹ

لسانیات ایک ایسا شعبہ ہے جس میں تذکیر و تانیث کا فرق عورت اور مرد کے فرق کی طرح سب سے زیادہ واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ ہزاروں برس سے یہ فیصلہ ہی نہیں کیا جا سکا کہ جو الفاظ یا فقرے جو اسم یا صفت پر ختم ہوتے ہیں انہیں تذکیر کے زمرے میں رکھا جائے یا تانیث کے زمرے میں۔ انڈو جرمن زبانوں میں سے اکثر ایسی ہیں جن میں تذکیر' تانیث اور بے جنس صیغے موجود ہیں لیکن فرانسیسی وغیرہ ایسی زبانیں بھی ہیں جن میں صرف تذکیر و تانیث ہی موجود ہے۔ انگریزی میں حرف تنکیر اور صفت کا فرق مٹا دیا گیا ہے اور ضمیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ (جیسے He, She, It)

لفظ کے آخری حرف اور اس کی آواز کے سوال پر بحث قدیم یونان کے فلسفیوں اور صرفی و نحوی ماہروں کے درمیان شروع ہوئی تھی۔ ارسطو لفظ کے آخر میں آنے والے حرف سے اس کی تذکیر و تانیث کا فرق معلوم کرنے کا قائل تھا۔ وہ تذکیر کو حرکت اور عمل کرنے والا اور تانیث کو "عورت اور دکھ جھیلنے" والا صیغہ قرار دیتا تھا۔ اس کے برعکس لسانیات کے ماہرین کہتے تھے کہ عورت اور مرد کے فرق کا اطلاق زبان کے استعمال پر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتے تھے کہ کسی لفظ کا آخری حرف اس کی ایک صوری اور لسانی شکل ہے۔ مگر سوفسطائی فلسفی جن میں نیتا غورث پیش پیش تھا تذکیر و تانیث کے فرق کے ساتھ زبان کی اصلاح کر رہے تھے۔ ان کی نظر میں عورت اور مرد کے لئے ایک ہی قسم کے الفاظ کا استعمال گمراہی کا سبب بن سکتا تھا۔ تاہم ان کے ہم عصر جن میں مزاحیہ شاعر ارسطو فنیس بھی شامل تھا' ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

بعض اوقات یہ دونوں نظریئے اکٹھے بھی دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں بہت تضاد ہے تیسری صدی قبل مسیح سے پہلی صدی قبل مسیح تک جن صرفی و نحوی ماہرین نے زبان کے قواعد مرتب کئے اور گرائمر کو سائنسی بنیاد فراہم کی ان میں اسکندریہ

کے ایک ماہر کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ "یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ گرائمر میں جنس کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔"

ازمنہ وسطیٰ کے صرف و نحو اور علم و ادب کے ماہرین نے بھی زبان میں جنس کے فرق سے متعلق ارسطو کے نظریہ کی حمایت کی ہے۔ گریمر کے کسی گمنام ماہر کا قول ہے "تذکیر کے ذریعہ ہم کسی چیز میں اس کے عمل کی نوعیت کا اندازہ کرتے ہیں اور تانیث کے ذریعہ ہم کسی چیز میں تحمل و برداشت کی نوعیت سمجھتے ہیں۔ تذکیر میں مرد اور پتھر ایک ہیں اور تانیث میں چٹان اور عورت ایک ہیں۔

اطالوی فلسفی تو ماس کمپانیلا نے اپنی کتاب (1638) Philosophia rationalis میں فعال کو متحمل کا مخالف قرار دیا ہے اور لکھا ہے " جس طرح عمل مذکر ہے اسی طرح مادہ (جس سے کوئی چیز بنائی جاتی ہے) مونث ہے۔ خدا اور آگ مذکر ہیں لیکن زمین اور پانی مونث ہیں۔ ایک میں عمل کا اظہار دیکھائی دیتا ہے اور دوسرے میں تحمل و برداشت کا۔

پی رودین نے 1925ء میں اس موضوع پر انتہائی مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس نے صرفی و نحوی اور ادب و فن کے ماہروں کی آرا کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے۔

"یہ تمام لوگ اسم کو حقیقت پر مبنی کوئی شے گردانتے تھے' یعنی ان کے نزدیک اسم معرفہ ہوتا ہے یا اسم نکرہ۔"

برطانوی ماہر لسانیات ہیرس نے 1751ء میں اپنی کتاب Hermes میں لکھا۔ اکثر الفاظ کو مذکر قرار دیا جاتا ہے۔ جن لفظوں میں آنکھوں کو فعال اثرات یا معلومات دکھائی دیں' یا جو اپنی ماہیئت کے اعتبار سے فعال' طاقت ور اور کاریگر ہیں —— خواہ وہ اچھے ہوں یا برے (مذکر ہیں) اس کے برعکس تانیث وہ ہے جو قبول کرتی ہے' جمع کرتی ہے پیدا کرتی ہے' آگے بڑھاتی ہے یا جو اپنی ماہیئت کے اعتبار سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والی ہے یا جو غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے مہربان ہے یا جس میں مردانہ سے زیادہ زنانہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔"

ولہم فان ہیمبولٹ تذکیر و تانیث کو زبان کی تصوراتی صفت قرار دیتا ہے اور جیکب گرم کا خیال بھی یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان میں تذکر و تانیث دراصل قدرتی اوصاف کی توسیع ہی ہے۔ ان کے ذریعے ہم ہر چیز کو پہچانتے ہیں اور یہ فرق انسان کے ذہن میں ہی پیدا ہوتا ہے۔

اسم دراصل کسی چیز کے بنیادی اوصاف کا عکس نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی زبان کے ایک سادہ سے تصور کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے تصور میں چیزوں کو مذکر اور مونث کے حساب سے دیکھتا ہے۔ جیکب گرم نے تذکیر و تانیث کے لئے جو معیار مقرر کیا ہے وہ بھی نہایت دلچسپ ہے وہ کہتا ہے۔

مذکر پہلا' بڑا' مضبوط' زیادہ لچک دار' تیز' فعال' متحرک اور خلاق معلوم ہوتا ہے جبکہ مونث بعد میں آنے والی' نرم' جامد' دکھ جھیلنے والی اور قبول کرنے والی ہوتی ہے اور بے جنس صیغہ مخلوق' مادی' عام' اور بے جان ہوتی ہے۔"

انیسویں صدی کے صرفی و نحوی ماہروں نے سراغ لگایا کہ تمام زبانوں میں تذکیر و تانیث کا قدرتی فرق موجود نہیں ہے ترک' چینی' منگول جیسی زبانوں میں تذکیر و تانیث ہے ہی نہیں ہے۔ افریقہ کی بنتو زبان میں اسم کو آٹھ درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند میں ہی تذکیر و تانیث موجود ہے۔ ان میں سے اکثر میں جاندار اور بے جان کا ہی فرق پایا جاتا ہے۔

جرمن ماہر لسانیات اور ماہر مصریات کارل رچرڈ لیپسس' جس نے افریقی زبانوں اور ان کے گروپوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے' لکھتا ہے کہ افریقہ کے بنتو قبائل میں انسانوں کی درجہ بندی کے حساب سے ہی تذکیر و تانیث کی درجہ بندی بھی کر جاتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ سامی زبانوں میں خاص طور سے مرد کو ہی فوقیت حاصل ہے کیونکہ ان کے نزدیک مرد ہی زبان کی تشکیل کرتا ہے اور جنس کا امتیاز عورت کو مستثنیٰ کر کے کیا جاتا ہے۔"

چونکہ متعدد افریقی زبانوں جیسے ہاؤسا اور ہونٹوٹ اور آسٹریلیا کی زبانوں

میں تذکیر و تانیث کا فرق پایا جاتا ہے اس لئے لیپسس کا خیال ہے کہ "تذکیر و تانیث کا فرق اور جنس کا امتیاز ان کے اخلاق و آداب اور شادی میں عورت مرد کے فرق کی نشان دہی کرتا ہے۔"

فرانسیسی ماہر صرف و نحو لوسیاں ایڈم جنس کی اس تھیوری کو درجہ بندی کے مختلف نظاموں میں گروہی اور نفسیاتی تصریحات تک پھیلا دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ درجہ بندی طاقت اور کمزوری کے حساب سے کی جاتی ہے۔ زیادہ طاقت ور جاندار مذکر بنا دیئے گئے اور کم طاقت والے مونث کہلائے۔ کیر یبئین زبانوں میں یہ تقسیم زیادہ واضح ہے انسانوں میں مرد اور جانوروں میں نر اور کئی بے جان چیزیں مذکر ہیں اور عورتیں اور بے جان چیزیں مونث بن گئیں اور کوائے اور چکوائے زبانوں میں مرد اور خدا ایک ہی درجہ میں آتے ہیں۔ دوسری درجہ میں عورت اور باقی تمام چیزیں شامل ہیں۔

جرمن ماہر لسانیات مائنہان نے افریقہ کے فلانی قبیلے کی زبان کے مطالعہ سے تذکیر و تانیث کا فرق زیادہ بہتر طور پر واضح کیا ہے۔ فلانی چار قسم کی درجہ بندی کرتے ہیں اشخاص' اشیا' بڑے اور چھوٹے' بڑے جانور انسانی شخص کی طرح ہی تسلیم کئے جاتے ہیں اور کمتر درجہ کے مرد عورتوں اور بچوں کو اشیا میں شمار کیا جاتا ہے۔

گرائمر کے ماہروں نے صرف و نحو میں تذکیر و تانیث کے فرق کا قابل قبول جواز پیش کرنے کی کوشش کی تو یہ صورت حال بذات خود آزادی نسواں کے خلاف نظریاتی جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں تھیڈور ہیپل پہلا شخص تھا جس نے عورتوں کے مساوی حقوق اور ان کی تعلیم کی وکالت کی اس کے باوجود وہ مانتا تھا کہ قوت استدلال اور نسوانیت دو متضاد صفات ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرمن زبان میں قوت استدلال کے لئے جو لفظ آتا ہے وہ مذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے

"قوت استدلال" لیکن عورتوں کو اپنے منہ سے یہ لفظ نکالتے ہوئے

ہوشیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس لفظ کے منہ پر بال اگے ہوئے ہیں۔

قدامت پسند ولہیم ہانئوک ریہل کہتا ہے کہ "ریاست بھی مذکر ہے۔" جب اس سے سوال کیا گیا کہ پھر عورتیں کہاں جائیں تو اس نے جواب دیا انہیں گھروں کے اندر اپنے خاندانوں میں رہنا چاہئے کیونکہ ان کا صیغہ نسوانیت کا اعلان کرتا ہے اس سے نسوانیت ہی ظاہر ہوتی ہے۔"

گریمر میں جس طرح مونث اور مذکر کا فرق ایک معمہ ہے اسی طرح ایک قبیلے میں بولی جانے والی عورت اور مرد کی زبان کا فرق بھی معمہ ہی بنا ہوا ہے۔ کریبین جزائر میں نوجوان لڑکے بلوغت کی رسمیں ادا کرنے کے بعد عورت کی زبان بولنے سے گریز کرتے ہیں اور صرف مردوں کی زبان ہی بولتے ہیں۔ اس صورت حال کی وضاحت کے لئے متعدد نظریات پیش کئے گئے؟ ہیں لیکن ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ اس کے پیچھے کون سے نفسیاتی' سماجی' اور مذہبی عوامل کارفرما ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ چونکہ عورت اور مرد کے کاموں کا شعبہ الگ الگ ہے اس لئے زبان کا یہ فرق پیدا ہوا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہیکہ کریبین کی عورت کو اغوا کر کے شادی کی جاتی ہے اس لئے یہ فرق موجود ہے اساطیر کے مشہور برطانوی ماہر جیمز فریزر کا خیال ہے کہ دو قبیلوں کے درمیان شادی کے رشتے قائم ہوتے ہیں تو ان کے درمیان میاں بیوی اپنے اپنے قبیلے کی زبان برقرار رکھتے ہیں لیکن دونوں قبیلوں کے درمیان بات چیت کے لئے کوئی ایک زبان استعمال کی جاتی ہے۔ فریزر اس کی مثال دیتا ہے کہ پیراگوائے کے ایک شہر میں عورتیں صرف گوارانی زبان ہی سمجھتی ہیں۔ مرد آپس میں ہسپانوی زبان بولتے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے گوارانی بولتے ہیں تاہم پیراگوائے کے قبیلے ایم بایاس کی عورتیں جو زبان بولتی ہیں اس میں مردوں کی زبان سے تھوڑا سا ہی فرق ہوتا ہے۔

دوسرے ماہرین اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ اغوا کر کے شادی کرنے اور خرید کر شادی کرنے کی وجہ ہی عورتوں کی زنانی زبانوں کے ارتقا کی بنیاد بنتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہبی تصورات اور معاشی شعبوں میں مرد اور عورت کی

علیحدگی ہی عورتوں کی خاص زبان پیدا کرنے کا سبب ہیں۔

بعض قبائل میں عورت اور مرد کی زبان میں لفظ کے شروع یا وسط میں ایک حرف کے اضافے سے فرق پیدا کیا جاتا ہے بعض مقامات پر عورتوں کی زبان میں گونج دار الفاظ زیادہ ہیں جس سے یہ مانا جاتا ہے کہ زبان کی یہ زیادہ پرانی شکل ہے بعض دوسرے قبائل میں مردوں کی زبان میں زیادہ گونج دار الفاظ ہوتے ہیں۔

یانا قبیلے میں عورتوں کی زبان میں الفاظ کی شکل مردوں کے مقابلے میں مختصر ہوتی ہے۔ کیر یبئین کے اور آسٹریلیا کے قبائل میں مردوں کی اپنی ایک خفیہ زبان ہوتی ہے جسے جنگی زبان کہا جا سکتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو اس سے دور رکھا جاتا ہے۔

ان مقامات پر جہاں ایک زبان کا دوسری زبان کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے۔ جیسے ترک وطن کر کے آنے والوں کی زبان کے ساتھ وہاں صرف عورتیں ہی اپنی اصل زبان محفوظ رکھتی ہیں اور پرانی زبان بولتی رہتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مرد دو زبانیں بولنے لگتے ہیں۔ یہودیوں اور جپسیوں میں یہ بات عام نظر آتی ہے۔ اسکیمو قبائل میں عورتوں کی زبان میں لفظ کی آخری آواز مختلف ہوتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ولندیزی ماہر لسانیات کرستیانس کارنیلیس اوہلین بیک کا بیان ہے کہ مرد عورت کی زبان اس لئے استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے کہ کہیں اس کے اندر عورتوں والی کمزوری نہ پیدا ہو جائیں۔ "مرد کو عورتوں کی کمزوریوں کا شکار ہونے کا خطرہ اس وقت اور بھی زیادہ ہوتا ہے جب عورت محکوم قبیلے کی ہوتی ہے "اگر مرد عورت کی زبان بولتا ہے تو وہ دھوکا دینے یا چال بازی کے لئے ایسا کرتا ہے۔"

جدید زبانوں میں بھی عورت اور مرد کی زبان میں فرق موجود ہے خاص طور سے جنسی چیزوں کے ذکر میں یہ فرق بہت واضح ہے۔ رومانیہ میں مردوں کی جنسی اصطلاحات لاطینی زبان میں ہیں جبکہ عوت اس کے لئے سلاوک زبان استعمال کرتی ہے۔ رومانیہ کی زبان صدیوں سے سلاوک زبان کے ساتھ بولی جاتی ہے۔

جس کی وجہ سے رومانیہ کی زبان میں بہت سے سلاوک الفاظ آ گئے ہیں۔ وہاں ایک اعلیٰ زبان اور ایک ادنیٰ زبان مانی جاتی ہے۔ ادنیٰ زبان عورتوں کی زبان ہے۔

اس کی مثال ان ملکوں میں بھی ملتی ہے جہاں کی اشرافیہ کوئی غیر ملکی زبان بولتی ہے کیونکہ وہ اعلیٰ اور مہذب زبان مانی جاتی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں جیسے یورپ کی اشرافیہ لاطینی بولتی تھی یا جیسے کسی زمانے میں جاپان کی اشرافیہ چینی زبان بولتی تھی۔

دسویں اور گیارہویں صدی میں جاپان کے اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت تھی جاپانی ادب کے ماہرین کا خیال ہے کہ قریب ایک سو سال تک وہاں جاپان کی ہر مشہور اور ممتاز ادیب عورت تھی۔ سب سے زیادہ مشہور مصنفہ مورا ساکن سکوبو ہے جس کی کتاب Jale of Genti بہت مشہور ہے۔ جاپان کی تاریخ میں یہ دور' دربار سے متعلق خواتین' ان کی بیٹیوں اور اعلیٰ طبقے کی دوسری عورتوں کی سب سے زیادہ آزادی کا دور تھا۔

ایسا کیونکر ہوا کہ جاپان کا پہلا ادبی کارنامہ عورتوں نے انجام دیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس ادب کو نسبتاً جدید دور کے مقابلے میں عظیم کارنامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جدید دور کا مرد عورتوں کے ادب کو ایک ذیلی کلچر کے طور پر تسلیم کرتا ہے اور اسے مردوں کے ادب کے مقابلے میں بہت ہی کمتر حیثیت دیتا ہے ان دنوں جن مردوں کا تعلق ادب سے ہوتا تھا وہ چینی زبان استعمال کرتے تھے کیونکہ چینی زبان بہت ہی اعلیٰ زبان' علما کی زبان' پروہتوں کی زبان اور سرکاری افسروں کی زبان مانی جاتی تھی۔ اسے وہی حیثیت حاصل تھی جو یورپ میں لاطینی کو تھی۔ لیکن عورتیں چونکہ سماجی اور سیاسی طبقوں کی نفسیاتی برتری کے دباؤ سے آزاد تھیں اس لئے وہ جو کچھ لکھتی تھیں وہ ''کانا'' رسم الخط میں لکھتی تھیں جو اصل جاپانی زبان کا رسم الخط تھا۔ یہ عام بول چال کی سادہ زبان تھی' ایسی سادگی چینی زبان یا چینی اور جاپانی کی ملی جلی زبان ''کامبون'' میں موجود نہیں تھی۔ عورت نے اس زبان میں لکھا اس لئے آج بھی جاپانی زبان کی عظیم تخلیق کا نام آتا ہے تو وہ

عورت کی ہی لکھی ہوتی ہے۔

قدیم قبیلوں اور قدیم زبانوں میں پودوں اور جانوروں کے لئے الفاظ میں بھی مذکر مونث کا فرق ہوتا تھا۔ مثلاً ریشے والے پودوں کے لئے ہالینڈ اور بیلجیم کے بعض علاقوں میں تذکیر و تانیث کے مختلف انداز استعمال ہوتے ہیں۔ تاہیتی میں پودوں اور درختوں کی مختلف اوصاف کے ساتھ مذکر اور مونث کا فرق ہوتا ہے اس طرح جانوروں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے۔ ملائیشیا کے چند قبیلوں' نیوزی لینڈ کے ماؤری قبیلے اور شمالی امریکہ کے انڈین قبائل میں تذکرو تانیث کا نہایت پیچیدہ طریقہ رائج ہے۔ پودوں کو جس حساب سے تذکیر و تانیث کا درجہ دیا جاتا ہے وہ ان کا اپنا ہی کوئی طریقہ ہے۔

تذکیر و تانیث کا سب سے زیادہ واضح فرق جن زبانوں میں پایا جاتا ہے ان میں عربی اور عبرانی شامل ہیں۔ ان میں تمام اسم مذکر ہیں یا مونث۔ ان سے متعلق صفت بھی مذکر ہو گی یا مونث حتیٰ کہ فعل بھی اسی حساب سے مذکر یا مونث بن جاتا ہے۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہنا چاہے کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" تو اسے کہنے کے چار مختلف طریقے ہیں یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ عورت مرد سے کہہ رہی ہے یا مرد عورت سے کہہ رہا ہے۔ عورت کسی دوسری عورت سے کہہ رہی ہے یا مرد کسی دوسرے مرد سے کہہ رہا ہے۔

امریکی انڈین قبائل میں تذکیر و تانیث کا زبردست فرق موجود ہے اور اس کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ عورت وہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتی جن میں مردوں کے اوزاروں یا ہتھیاروں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض حالات میں عورت مرد کی چیزوں کے لئے تانیث کا صیغہ استعمال کرے گی اور مرد تذکیر کا صیغہ جیسے گھریلو برتن کے لئے ہوپی انڈین قبیلے میں "آپ کا شکریہ" کہنے کے لئے مرد اور عورت الگ الگ الفاظ استعمال کریں گے۔ اس طرح پرتگالی میں شکریہ کہنے کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں۔ میکسکو کے مازٹیکو انڈین قبیلے میں سیٹی بجانے کی ایک خفیہ زبان ہے۔ سیٹی کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے مردوں کے لفظوں کا فرق واضح کیا جاتا ہے۔

مردوں کو یہ زبان استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ عورت اسے استعمال کرے گی تو وہ بدنام ہو جائے گی۔

بہت سی زبانوں میں تو "میں" کا لفظ بھی مرد اور عورت کے لئے الگ الگ ہے۔ جاپانی زبان میں عام طور پر مذکر مونث کا استعمال کم ہے "میں" کے لئے ایک ہی لفظ "واتا کوشی" استعمال کیا جاتا ہے لیکن جب عورت اپنی نسوانیت کا زیادہ ہی اظہار کرنا چاہتی ہے تو "واتاشی" استعمال کرتی ہے "میں" کے لئے ایک تیسرا لفظ "بوکو" بھی ہے جو سورما لوگ استعمال کرتے ہیں۔

ولیم شمٹ تذکیر و تانیث والی زبانوں چار ذیلی اقسام میں تقسیم کرتا ہے۔

1... وہ زبانیں جن میں یہ ذاتی ضمیر کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

2... وہ زبانیں جن میں یہ اسم کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن اسم کسی شخص یا جانور سے متعلق ہوتا ہے۔

3... وہ زبانیں جن میں غیر جاندار چیزیں ایک یا دو اقسام میں تقسیم ہوتی ہیں۔

4... وہ زبانیں جن میں مذکر مونث کے ساتھ تیسری جنس بھی ہوتی ہے۔

شمٹ کہتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے بات کرتا ہے تو تذکیر و تانیث کا استعمال نہیں ہوتا البتہ جب کسی تیسرے شخص کا حوالہ آتا ہے تو اس کا استعمال ہوتا ہے۔

عربی اور عبرانی کی طرح پاپوا کی زبان میں بھی تذکیر و تانیث کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ نیوگنی کی مونمبو زبان میں متکلم اور غائب ضمیر کے علاوہ اسم' صفت' اعداد' اور فعل کو بھی مذکر مونث میں تقسیم کیا جاتا ہے اس کے علاوہ بے جنس صیغہ کے ساتھ ایک اور صیغہ بھی ہوتا ہے جس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ ساؤتھ سیز کے جزیرہ بوگینزول میں بڑے اور چھوٹے چوپائیوں' پرندوں' مچھلیوں' درختوں' پھلوں اور اوزاروں کے لئے تذکر و تانیث کے علاوہ کئی قسم کے اور

درجے بھی ہیں۔

1953ء میں ہربرٹ سائیڈلر نے جیکب گرم کے خیال کی تائید کرتے ہوئے اس کی اس بات کو آگے بڑھایا کہ گریمر میں تذکیرو تانیث جنس کے قدرتی فرق کی ہی توسیع ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

تذکیر و تانیث دنیا کو دیکھنے کے جذباتی انداز سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارے انسانی کردار سے تخلیق پاتی ہے جس میں جنس کی تقسیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے تجربے میں جو چیز فعال' عطا کرنے والی اور بڑی شکل میں آتی ہے وہ مذکر محسوس ہوتی ہے اور جو مجہول قبول کرنے والی' اور چھوٹی شکل میں آتی ہے وہ نسوانی خاصیت کی حامل ہوتی ہے۔

لیکن دوسرے بہت سے ماہرین جن میں ہنگری کا استوان فوورو نمایاں ہے اس بات کو نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں یہ قدرتی فرق نہیں ہے بلکہ زبان کا اپنا میکینزم ہے۔ اس کے مطابق یہ کوئی اقداری فرق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ خیال کی اصل زبان کی ساخت کو نہیں بناتی۔ الفاظ کی شکل محض ان کی ساخت یا بناوٹ کی ایک صورت ہے جو کسی جنس سے تعلق نہیں رکھتی۔ اگر ایسا ہو جائے تو زبان جو ایک باضابطہ نظام رکھتی ہے بالکل بکھر جائے۔

جان مونی انگریزی کے واحد غائب صیغہ (He, She, It) کو تذکیرو تانیث کے فرق کا اہم حصہ قرار دیتا ہے۔ انڈو جرمن زبانوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ تذکیرو تانیث نفسیاتی طور پر بہت ضروری ہیں۔ عورت کے لئے عام طرپر بے جنس صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اس سے مقصود عورت کی تذلیل ہے۔ چھوٹی بچی کے لئے بھی بے جنس صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جرمن زبان میں ایک رجحان یہ بھی ہے کہ بے جنس صیغہ صرف چھوٹی لڑکی کے لئے ہی استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ بڑی عمر کی عورت کے لئے بھی Das Madchen استعمال کیا جاتا ہے۔

انڈین ہاوک زبان میں جس طرح عورت کو مخاطب کیا جاتا ہے وہ بھی

اسے ذلیل کرنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ اگر عورت کا شوہر مرجائے تو اس کے لیے بے جنس ضمیر استعمال کی جائے گی۔ عورت کی انسانی حیثیت ہی ختم ہو جائے گی۔ وہاں عام طور پر بیوہ عورت کو "ہانی" کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے جانور، ہندوستان کی ایک زبان کونکنی میں بالغ ہونے سے پہلے لڑکی اور نچلی ذات کی عورت کے لئے بے جنس ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سگمنڈ فرائیڈ بھی انسانی ارتقا کے ابتدائی مرحلے پر اس کے لئے It کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

مردوں کے دل و دماغ میں جنس کی تفریق کتنی گہرائی تک بیٹھ گئی ہے اس کا ثبوت جرمن میں ہونے والے ایک مباحثے سے ملتا ہے۔ 1975ء میں عورتوں کے سال کے سلسلے میں مباحثہ ہو رہا تھا تو ایک وزیر اور ایک سیکریٹری خارجہ نے بڑے زور و شور سے نہایت جذباتی انداز میں اس بات پر اعتراض کیا کہ اس سلسلے میں جو خطاب دیئے جائیں ان کے نام نسوانی نہیں ہونا چاہئیں اس کے لئے ان میں سے ایک نے جو جواز پیش کیا وہ یہ تھا کہ عورت تو ایک فرض ادا کر رہی ہے اس سے اس کی شخصیت کا کوئی تعلق نہیں ہے اس کے پیچھے ان کا یہ خوف جھانک رہا تھا کہ اس طرح خطاب کی عزت کم ہو جائے گی۔

جن زبانوں میں تذکر و تانیث ہیں ان میں جب دونوں جنسوں کا اکٹھا حوالہ آتا ہے تو مذکر کا صیغہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں غیر حاضر کے لئے الگ الگ مذکر مونث استعمال ہو گا لیکن اگر مجمع ملا جلا ہو تو مذکر کا صیغہ ہی استعمال ہو گا۔ یہی حال اطالوی اور پرتگالی زبانوں کا ہے اگر کہیں کوئی مظاہرہ ہوتا ہے اور اس میں پانچ سو عورتیں اور ایک مرد شرکت کرتے ہیں تو اس کے لئے مذکر کا صیغہ ہی استعمال کیا جائے گا۔

عربی میں بچے کے لئے عام طور پر "ولد" کا لفظ بولا جاتا ہے جس کی جمع اولاد ہے۔ لیکن لڑکی کے لئے بھی یہی ولد استعمال ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جب آپ سوال کریں گے کہ "آپ کے کتنے بچے ہیں" تو لغوی طور پر اسے اس طرح کہا جائے گا کہ "آپ کے کتنے لڑکے ہیں۔" عربی سے ترجمہ کرتے ہوئے یہ

امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ "ولد" سے مراد کوئی بھی بچہ یا بچی ہے یا صرف بچہ یا لڑکا ہے۔

یہی حال "عوام" کا ہے۔ یونان کی سٹی اسٹیٹس میں "عوام" یا "عام جلسے" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی حالانکہ ان میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ گویا عوام سے مراد صرف مرد ہیں۔

اسی طرح "نوجوان" کا لفظ ہے۔ ہم نوجوان کہتے ہیں تو اس سے مراد نوجوان مرد ہی ہوتا ہے عورت اس میں شامل نہیں ہوتی۔ جب کہا جاتا ہے کہ نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح بڑھ رہی ہے تو اس میں عورتیں شامل نہیں ہوتیں۔

ہیگل کا قول ہے ——— "جہاں تک افراد کا تعلق ہے ہر فرد بہرحال اپنے زمانے کا بیٹا ہوتا ہے ---- جو شخص بھی اپنے زمانے کے رزم کا اظہار کرتا ہے، اپنے ہم عصر لوگوں تک پہنچاتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے وہ اپنے زمانے کا عظیم مرد ہے۔" یہاں بھی فرد کا تصور مرد کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔

شلر کی نظم Hymnus an die freud میں کہا گیا ہے "تمام انسان بھائی ہیں" یعنی نوع انسانی سے مراد مرد ہی ہیں۔

آزادی کی تحریک کی تاریخ کے بارے میں امریکہ کے سیاہ فام لیڈر ایلڈرج کلیور نے لکھا۔ "ہم انسان بننا چاہتے ہیں۔ ہم انسان بننا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہماری جدوجہد سے سب کچھ نیست و نابود ہو جائے گا۔"

انسان بننا ایک ایسا سیاسی مرتبہ ہے جس کی ہر محکوم شخص خواہش رکھتا ہے۔ تمام حکمرانوں کی طرف سے نفسیاتی تسلط کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ اپنے محکوموں سے انسانیت کا درجہ چھین کر ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ انہیں انسانی مرتبے سے محروم کر دیا جائے۔

اس صدی کے آغاز میں ہی سیاسی معاشیات کے ماہر وورنر سومبرٹ نے عورت کے وجود کو تہذیبی زوال کے مترادف قرار دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔
"ہاں، میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ان چیزوں کا معمولی عکس بھی انحطاط کی

نشانی ہے ------ اس خیال کی صداقت کا ثبوت پہلی تہذیبوں کی تقدیر سے ملتا ہے جو محض اس وجہ سے تباہ ہو گئیں کہ ان میں عورت کو انسان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ------"

لیکن ہیڈوگ ڈھوم کا مقولہ ہے کہ "انسانی حقوق کی کوئی جنس نہیں"

اردو زبان میں تذکیر و تانیث کا نظام خاصہ پیچیدہ ہے۔ اس میں ضمیر کی تو کوئی جنس نہیں ہوتی البتہ اسم کے ساتھ فعل بھی مذکر یا مونث بن جاتا ہے۔ اسی کی طرح ناموں کے آخری حرف سے تذکیر و تانیث کی تخصیص کی جاتی ہے۔ آخر میں الف یا ی آ جانے سے عام طور پر مونث کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اردو میں اور اردو کی طرح پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی عورت اور مرد کی زبان میں بھی فرق ہے اور مرد عورت کی زبان بولنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ عورت بھی اگر مرد کے انداز میں بولے تو اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ عورتوں اور مردوں کی زبان کے چند اشارے ایسے بھی ہیں جو عورت یا مرد کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جنوبی ایشیا کی زبانوں میں مذکر اور مونث کی تخصیص کے بارے میں صرف ایک ہی بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ ان معاشروں میں عورت گھر میں بند رہی ہے' اسے مردوں کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا اس لئے گھروں کے اندر بولی جانے والی عورتوں کی زبان ہی الگ ہو گئی۔ اگرچہ اس زبان کو ثقہ زبان تو نہیں سمجھا جاتا لیکن محاوروں کی صحت کے لئے عورت کی زبان سے ہی رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی وہی عورت کا دوسرے علاقوں سے دور رہنا ہے۔ مرد چونکہ گھر سے باہر ہر قسم کے لوگوں سے ملتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی زبان دوسرے لہجوں اور زبان سے متاثر ہو جاتی ہے۔ لیکن تعلیم کے فروغ کے ساتھ عورت مرد کی زبان کی یہ تخصیص ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کے کام کرنے سے بھی ان کی زبان پر فرق پڑا ہے اور اب دونوں کی زبان کا امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن زبان کے اندر تذکیر و تانیث کا جو نظام چلا آ رہا ہے۔ وہ بہرحال برقرار ہے اور اس کے ختم ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ یہ نظام مردوں کا بنایا ہوا ہے اور مردوں کا تسلط ہمارے معاشرے میں بہت مضبوط ہے۔

عورت: تاریخ کیا کہتی ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

حقوق نسواں کی ایک جرمن کارکن خاتون نے کہا تھا کہ: "میری تاریخ کی کتابیں جھوٹ بولتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میرا وجود ہی نہیں تھا۔" تاریخ میں عورت کا وجود تو ہے، مگر اس کا یہ وجود وہ ہے کہ جو مرد نے تشکیل دیا ہے۔ کیونکہ ہماری پوری تاریخ مردوں کی تاریخ ہے، عورتوں کی نہیں، اور اس تاریخ کو لکھنے کے لئے جو خاکہ بنایا گیا ہے، اس میں عورت کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، اگر عورت تاریخ میں آتی ہے تو اس کا کردار، اور اس کا عمل مرد کے تابع ہوتا ہے، مثلاً یونانی مورخوں نے جنگ کو تاریخ کا اہم موضوع بنایا، اس لئے جنگ کے موضوع میں مردوں کی بہادری، شجاعت، اور دلیری کے کارنامے ابھر کر سامنے آئے، اور جنگ اس قدر مقدس بن گئی کہ اس کے مقابلہ میں امن پسندی بزدلی، اور کم ہمتی قرار پائی، اور اگر کسی نے جنگ سے گریز کی کوشش کی تو اس پر زنانہ پن کے طعنے کسے گئے۔

اس لئے تاریخ کی تعبیر و تشکیل کے لئے یہ نظریہ ہوا کہ یہ صرف عظیم مرد ہی کر سکتے ہیں۔ کہ اگر ان کا وجود نہ ہو تو تاریخی عمل آگے کی جانب نہ بڑھ سکے، فاتحین سے لے کر پیغمبروں و اولیاء اللہ میں سب مرد ہی مرد نظر آتے ہیں، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ میں عورت کا وجود ہے یا نہیں؟ تاریخ میں عورت جس شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اس میں کوئی عظمت، عزت و وقار نہیں۔ بلکہ یہ ایک ایسا امیج ہے کہ جس سے کبھی نفرت ہوتی ہے، کبھی اس پر رحم کھانے کو دل چاہتا ہے، اور کبھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اس مختصر سے مضمون میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کی ان حیثیتوں کا ذکر کیا جائے کہ جو ہماری تاریخ میں ہیں۔ اور جب عورت اس تاریخ کو پڑھتی ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے ذہن اور کردار کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے۔

اول تو اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ ہماری تحریری تاریخ کے وقت تک انسانی معاشرے پر مرد کا غلبہ ہو چکا تھا اور عورت کی سماجی حیثیت گر چکی تھی۔ اس لئے عورت کا معاشرے میں مساوی درجہ نہیں رہا تھا' اور غیر مساوی درجہ کی وجہ سے مرد کے لئے یہ آسان ہو گیا تھا کہ وہ اسے اپنے مفادات کی خاطر قربان کرتا رہے' کیونکہ اخلاقی طور پر اعلیٰ مقاصد کے لئے کم تر اشیاء اور چیزوں کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں جب قبیلوں میں باہمی جنگ و جدل ہوتا تھا اور اس کے بعد دوستی کے معاہدے ہوتے تھے تو اس میں باہمی شادی بیاہ کے ذریعہ تعلقات کو بہتر بنایا جاتا تھا۔ اس کے بعد سے تاریخ میں یہ رواج رہا کہ جب بھی دشمنوں اور مخالفوں سے دوستی کرنا ہو تو انہیں لڑکی دے کر ان سے دوستی کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں بھی ہوتا تھا کہ شکست کھانے والا حکمران' اپنے خاندان کی لڑکی' فاتح کو دے کر اپنی شکست کو تسلیم کرتا تھا۔ اس طرح شادی کے دو مقاصد ہوئے: سیاسی تعلقات کو بہتر بنانا' اور شکست خوردہ حکمران یا قبیلہ کی لڑکی لے کر ان پر برتری قائم کرنا۔ ان دونوں صورتوں میں عورت کو قربان کر دیا جاتا تھا۔

تاریخ اس قسم کی شادیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثلاً جب بابر سمرقند میں تھا تو اس کے جانی دشمن شیبانی خاں نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا اور جب بابر کے لئے کوئی امید نہیں رہی تو اس نے اپنی بہن خانزادہ بیگم کو شادی کے لئے شیبانی خاں کے حوالہ کیا اور خود وہاں سے فرار ہوا۔ راجپوت حکمرانوں نے اکبر کو اپنی لڑکیاں شادی کے لئے پیش کیں تاکہ وہ اس طرح سے مغل خاندان میں شامل ہو جائیں۔ اس سارے عمل کا المیہ یہ تھا کہ عورت قربانی کے بعد گم نام ہو جاتی تھی اور اس کا کردار اس کے بعد ختم ہو جاتا تھا' اس کی قربانی کے نتیجہ میں جو فوائد ہوتے تھے وہ تمام کے تمام مردوں کو ملتے تھے' اور ان قربانیوں کے بعد بھی عورت کا سماجی رتبہ بڑھا نہیں بلکہ اس سے مردوں کو حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ عورت کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ چنانچہ ہماری تاریخ چاہے یورپ کی ہو یا ایشیاء و افریقہ کی اس میں عورت مرد کے مفادات کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

تاریخ میں عورت کا تذکرہ اس وقت آتا ہے کہ جب جنگ کے خاتمہ کے بعد مال غنیمت جمع کیا جاتا تھا۔ اس مال غنیمت کا سب سے اہم حصہ عورتیں ہوا کرتی

تھیں' اور ان کی تقسیم بھی اس طرح سے ہوتی تھی جیسے ہیرے جواہرات' کپڑوں قالینوں اور ہتھیاروں کی۔ جنگی قیدی بننے سے پہلے اگر ان کی کوئی سماجی حیثیت تھی بھی تو وہ اس کے بعد فوری ختم ہو جاتی تھی اور اس درجہ کنیز اور لونڈی کا ہو جاتا تھا' اور اس کے مالک کو اس پر پورا پورا حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جنسی تعلقات رکھے یا اسے بطور تحفہ کسی کو دے دے۔

جنگ کے بعد جو فتح کی خوش خبری بھیجی جاتی تھی اس میں خاص طور سے یہ خبر ہوتی تھی کہ کتنی عورتیں گرفتار ہوئیں اور کس کو کتنی ملیں۔ عام طور سے خوبصورت عورتیں حکمرانوں' جنرلوں اور امراء کے لئے ہوتی تھیں۔ باقی عام سپاہیوں میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ مثلاً چچ نامہ میں ہے کہ سندھ کی فتح پر صرف اروڑ شہر میں محمد بن قاسم نے تیس ہزار غلام اور کنیزیں حاصل کیں کہ جن میں تیس لڑکیاں راجاؤں کی بیٹیاں تھیں۔ کنیزیں بننے کے بعد یہ عورتیں تاریخ سے غائب ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ ان کا کیا ہوا؟

عورتوں کو دشمنوں کے ہاتھوں گرفتاری سے بچانے کے لئے یہ دستور بھی تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا تھا۔ یا راجپوتوں میں جوہر کی رسم تھی کہ جب وہ اپنی شکست کے آثار دیکھتے تھے تو اپنی عزت و آبرو بچانے کی خاطر عورتوں کو یا تو قتل کر دیتے تھے یا انہیں زندہ جلا دیتے تھے۔ وہاں بھی عورت کی اپنی مرضی و خواہش نظر نہیں آتی' اور تعریف ان مردوں کی جاتی ہے کہ جنہوں نے اپنی عزت و آبرو کی خاطر یہ بہادری کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس لئے جوہر کی رسم راجپوت مردوں کی مردانگی کی علامت تھی اس کا تعلق راجپوت عورتوں سے نہیں تھا۔

ویسے بھی جنگ کے زمانہ میں اور جنگ کے بعد سب سے زیادہ اذیت کا شکار عورت ہی ہوتی تھی۔ کنیزیں یا لونڈی بنانے کے ساتھ ساتھ فاتح افواج سب سے پہلے مفتوح قوم کی عورتوں کی عصمت دری کرتے تھے اور یہ قدیم زمانہ کی تاریخ ہی میں نہیں ہوا بلکہ دوسری جنگ کے بعد جرمن عورتیں روسی فاتح فوجیوں کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ اور اس وقت سربیا کے فوجی بوسنیا کی عورتوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں۔ اس کا!!

پہلو یہ ہے کہ مرد اپنی مردانگی عورت کی عصمت دری کر کے ثابت کرتا ہے' اس کی ایک مثال سعودی خاندان کے بانی شاہ سعود کی ہے کہ جو اپنے حرم میں ہمیشہ تین بیویاں رکھتے تھے تاکہ چوتھی کی جگہ رہے' اور جب بھی ضرورت پڑتی تھی وہ ایک کو طلاق دے کر 3 رکھتے تھے' ہوا یہ کہ ایک جنگ میں وہ شدید زخمی ہوئے اور ان کے ساتھیوں کو خیال ہوا کہ بادشاہ قوت رجولیت سے محروم ہو گیا ہے۔ اس افواہ کو جھٹلانے کے لئے انہوں نے میدان جنگ ہی میں نئی شادی کر کے اپنی مردانگی کو ثابت کر دکھایا۔

جب عورت کی حیثیت مال اور شے کی ہو گئی تو اس صورت میں ہر طاقتور حکمران اور دولت مند فرد کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے حرم میں خوبصورت عورتیں اکٹھی کریں۔ اس لئے اگر کسی حکمران کو یہ خبر ملتی تھی کہ کسی دوسرے ملک میں کوئی خوبصورت عورت ہے تو اس کے حصول کے لئے جنگ تک کی نوبت آ جاتی تھی۔ ہیلن آف ٹروئے سے لے کر ہندوستان میں پدمنی و روپ متی جنگوں کا سبب رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ سرما لکم نے اپنی کتاب "وسط ہند کی یادداشتوں" میں لکھا ہے کہ راجستھان ریاست کی ایک خوبصورت شہزادی کے حصول کے لئے دو راجا جنگ پر آمادہ ہو چکے تھے' اس پر شہزادی کے باپ کو اس کے مصاحبوں نے یہ مشورہ دیا کہ چونکہ ان جنگوں کا باعث شہزادی ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ شہزادی کو مار ڈالا جائے تاکہ قتل و غارت گری نہ ہو اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے شہزادی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

اس پورے واقعہ میں شہزادی کو کسی نے دیکھا نہیں تھا' صرف اس کی خوبصورتی کی شہرت سنی تھی' اور اسکی خوبصورتی بالآخر اس کے لئے عذاب بن گئی۔ اور سارا الزام اسے دیا گیا کہ وہ جنگ کا باعث بن رہی ہے' اور جب وہ جنگ کا سبب بنی تو اس کے مرنے پر افسوس کے بجائے خوشی ہوئی کہ اس سے خوں ریزی رک گئی۔ اس سارے ڈرامہ میں دونوں راجاؤں کی ہوسناکی کو بالکل فراموش کر دیا گیا اور انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی اور نہ ہی تاریخ میں راجاؤں کے کردار کے بارے میں ایک لفظ کہا گیا۔

تاریخ میں عورت کا ذکر یہ بھی آتا ہے کہ کس طرح کچھ عورتوں نے اپنی

خوبصورتی سے اور اپنی اداؤں سے حکمرانوں کو اپنے قابو میں کر لیا' اور پھر وہ سیاست پر اثر انداز ہو کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کراتی رہیں۔ یہ ایک ایسا امیج ہے کہ جس میں عورت اقتدار کی ہوس رکھنے والی اور گمراہ کرنے والی نظر آتی ہے۔ اس لئے دو ہندوستانی مورخ نورجہاں کو الزام دیتے ہیں کہ وہ جہانگیر پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی کہ اس میں خود سے فیصلہ کرنے کی طاقت ختم ہو گئی تھی اور اسی لئے عورت کی حکمرانی کی وجہ سے مغل سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ اور یہ الزام صرف مشرق ہی میں نہیں' مغرب کی تاریخ میں بھی ہے' جرمنی کے مشہور سیاستدان اور متحدہ جرمنی کے پہلے چانسلر بسمارک نے پروشیا کی ملکہ کو یہ الزام دیا کہ وہ بادشاہ کو مجبور کرتی رہی ہے کہ فرانس سے جنگ نہ کرے' جیسا کہ اس کے مطابق جرمنی کے لئے یہ جنگ انتہائی ضروری تھی' وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ

> "وہ تہتر سال کا بوڑھا ہے اور امن پسند ہے' اس کی کوئی خواہش نہیں کہ وہ 1866 والی عظمت کو ایک نئی جنگ کے ذریعہ حاصل کرے۔ اگر وہ نسوانی اثرات سے آزاد ہوتا تو اس کو احساس ہوتا کہ وہ فریڈرک اعظم اور پروشیا کے عظیم ہیروز کا جانشین ہے۔"

وہ ملکہ کو الزام دیتا ہے کہ وہ عورت ہونے کی وجہ سے بادشاہ کو جنگ سے روکے ہوئے ہے "مجھے بتایا گیا کہ ملکہ آگستا نے ایمیزے سے برلن جاتے ہوئے روتے ہوئے جنگ کی مخالفت کی۔۔۔۔ میں اس خبر کو صحیح سمجھتا ہوں' سوائے آنسو بہانے والی بات کے۔"

پوری تاریخ میں جنگ بہادری اور مردانگی کی علامت رہی' اور امن پسندی کو عورت سے منسوب کرے' اس کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر انسانی تاریخ میں جنگ کی ہولناکیوں کے بعد' انسان کا بار بار امن و آشتی کی طرف لوٹنا کیا عورت کی فتح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاقی اقدار کے معنی بدلنے میں وقت درکار ہوتا ہے' مگر اب بہادری و شجاعت صرف جنگ سے منسوب نہیں رہی ہیں' بلکہ انکا تعلق سماجی بہبود کے کاموں سے بھی ہوتا جا رہا ہے اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ مردوں کی بنائی ہوئی قدریں وقت کے ساتھ کمزور ہو

رہی ہیں۔

اس کے بعد تاریخ میں عورت کئی اور دوسری حیثیتوں سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً ملکہ کی حیثیت سے، ہندوستان میں رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی اور انگلستان میں الزبتھ، روس میں کیتھرائین اور آسٹریا میں تھریسا، مگر تاریخ میں ان کی عظمت و بڑائی ان کے مرد مصاحبین کی وجہ سے نظر آتی ہے جو ان کے ارد گرد رہتے ہیں اور انہیں مشورے دیتے نظر آتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ ناکام ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ساری ذمہ داری اس پر آتی ہے، کہ وہ عورت تھی، اور سیاست سے نابلد تھی، اس لئے غلط کام کر کے ملک و قوم کو تباہ کر دیا۔ اگر ملکہ اور بادشاہ مل کر حکومت کرتے ہیں، جیسے اسپین میں ازابیلا و فرڈی ننڈ، جنہوں نے مل کر اسپین سے عربوں کی حکومت کم کی، یا انگلستان میں ملکہ این اور ولیم، جو شاندار انقلاب کے بانی ہوئے، اس صورت میں بادشاہ کی تعریف کی جاتی ہے اور ملکہ کو عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تاریخ میں عورت کا تذکرہ ماں کی حیثیت سے آتا ہے، مگر اس حیثیت میں بڑائی یہ ہوتی ہے کہ اس نے کیسے جیالے، بہادر، عظیم لوگ پیدا کئے، اور یہ سب عظیم شخصیتیں مردوں کی ہوئی ہیں اور جب یہ عظیم لوگ تاریخ بناتے ہیں۔ تو اس عمل میں عورت پھر فراموش کر دی جاتی ہے، اس کا کام محض جب ختم ہو جاتا ہے کہ جب وہ لڑکے کو پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اس کی شناخت ختم ہو جاتی ہے، اور اس کے لڑکے اس کی شناخت بن جاتے ہیں۔

کبھی کبھی عورت تاریخ میں اس وقت ہی اہم بن کر ابھرتی ہے کہ جب اس کو مظلوم بنا کر جنگ کی جاتی ہے اور اس طرح سے سیاسی و معاشی مفادات کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال عربوں کا سندھ پر حملہ ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب سندھ کے ڈاکوؤں نے عرب خاندانوں کے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر لیا تو ایک لڑکی نے حجاج سے فریاد کی، اس پر حجاج نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ سندھ پر حملہ کیا جائے۔ حالانکہ عرب اس سے پہلے بھی سندھ پر حملے کر چکے تھے اور اس کی فتح ان کے منصوبے میں تھی۔ مگر یہ واقعہ سندھ پر حملے کی وجہ بن گیا اور یہاں بھی عورت کو مظلوم پا کر سیاسی

مقاصد کو حاصل کیا گیا۔ اس پورے واقعہ کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ اس کے بعد وہ لڑکی تاریخ میں نہیں آئی کہ سندھ کی فتح کے بعد اس پر کیا بیتی' وہ کہاں گئی' کیونکہ حملہ اور فتح کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لئے تاریخ نے اسے بالکل فراموش کر دیا۔

اور پھر تاریخ میں عورت کا تذکرہ بطور طوائف' رقاصہ' اور گانے والی کے آتا ہے جو ایک طرف مرد کی جنسی خواہشات کو پورا کرتی ہے تو دوسری طرف رقص اور گانے سے اسے خوشی و مسرت بہم پہنچاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس سماجی رتبہ بڑھتا نہیں بلکہ اور گھٹ جاتا ہے۔ طوائف کی ضرورت بھی سمجھی جاتی ہے تو اس سے نفرت بھی کی جاتی ہے' التمش کے زمانہ کے ایک عالم دین نورالدین مبارک کے مطابق طوائفوں کو ختم نہیں کرنا چاہیئے' انہیں باقی رہنے دیا جائے' ورنہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے لئے شریفوں کے گھروں میں کودا کریں گے۔ اکبر بادشاہ نے بھی ان سب کو ایک جگہ آباد کر کے اس کا نام "شیطان پورہ" رکھ دیا تھا۔

طوائف کی حیثیت سے عورت مرد کی ضرورت کو پورا کرتی ہے' اس لئے دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اپنے فوجیوں کے لئے زبردستی کوریائی عورتوں کو فوجی کیمپوں میں رکھا تاکہ وہ سپاہیوں کی خواہشات پوری کریں' ویتنام میں امریکی سپاہیوں نے ویت نامی عورتوں کو استعمال کیا اور جاتے وقت ان سب کو چھوڑ گئے۔

اس تمام عمل میں طوائف کی کوئی آواز نہیں۔ عورت اس ڈرامہ میں جب درد' کرب' اور اذیت سے گذری' تاریخ کے صفحات اس سے خالی ہیں۔ ایک طوائف کو ہمیشہ گناہ کی علامت سمجھا گیا اور اس کی محرومیوں اور تکلیفوں سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عورت کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھا گیا اور اسے قوم' ملک' معاشرہ کے زوال کا ذمہ دار بنایا گیا۔ جب بھی کسی قوم کے عروج کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس میں عورت کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ مگر جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں' تو اس کی ساری ذمہ داری عورتوں پر ہوتی ہے کہ زوال کے زمانہ میں عورتوں نے حکمرانوں کو عیش و عشرت میں مبتلا کر دیا' اور اس طرح سے ان کی تمام صلاحیتوں کو ختم کر دیا' عورتوں کی

صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان کی مردانہ صفات ختم ہو گئیں اور ان میں نسوانی عادتیں آ گئیں۔ لہٰذا اس بات پر اکثر مورخ متفق ہیں کہ ہر قوم کے زوال میں عورتوں نے حصہ لیا۔

مشہور جرمن مورخ تھیوڈور مومزن' جسے 1902ء میں ادب کا نوبل انعام ملا' اور جس نے رومی تاریخ پر تحقیق کی۔ وہ رومیوں کے زوال کیوجہ' رومی معاشرہ میں عورت کے سماجی رتبہ کی تبدیلی کو دیتا ہے۔

"پرانے دستور میں عورت قانون کے تحت شوہر کی نگرانی میں ہوتی تھی' اور شوہر اختیارات کے مقابلے میں باپ کے برابر ہوتا تھا۔ غیر شادی شدہ عورت باپ یا کسی مرد رشتہ دار کے ماتحت ہوتی تھی۔۔۔ شادی شدہ عورت کی اپنی کوئی جائداد نہیں ہوا کرتی تھی۔ بغیر باپ کی عورت یا بیوہ کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی رقم خود خرچ کرے۔ لیکن اب یہ شروع ہو گیا ہے کہ عورت اپنی رقم خود خرچ کرنے لگی ہے' اور اس نے قسم قسم کے خاندانی حیلوں کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً شادی کر لے' تاکہ باپ کی نگرانی سے آزاد ہو جائے اور اپنی جائیداد کا انتظام خود سنبھال لے۔ وہ یہ تک کرتی ہیں کہ شادی کے بعد شوہر کو اس کے اختیارات استعمال نہیں کرنے دیتیں۔

عورت کی یہ آرزو ہے کہ "دنیا کے حکمرانوں پر حکومت کرو" اس کی یہ آرزو برابر بڑھ رہی ہے' اور یہ شہریوں کی اسمبلی نے بھی محسوس کر لیا ہے اور اس لئے اب صوبوں میں جگہ جگہ عورتوں کے مجسمے ایستادہ ہونے لگے ہیں۔ لباس' زیورات' عمارتوں کی سجاوٹ اور کھانوں میں فراوانی اور خوبصورتی آ گئی ہے۔ خصوصیت سے انیسویں صدی میں ایشیائے کوچک کی مہم کے بعد' ایشیائی و یونانی عیش و عشرت وہاں سے روم آ گیا ہے' ان میں بیکار کی تفریحات' بدعنوانی' وقت کا زیاں سب موجود ہے' اور ان سب میں عورت خرابی کی جڑ ہے۔"

اس لئے مورخ قوموں کے زوال میں عورت کو دو حیثیتوں سے دیکھتے ہیں۔

اول عورت کی آزادی اور اس کا ملک کے سیاسی معاملات میں دخل' اور حکمران طبقوں کا عورتوں کی صحبت میں وقت گزارنا' ان دونوں صورتوں میں ان کے نزدیک قومیں زوال سے دوچار ہوتی ہیں' لہٰذا جب بھی ملکی معاملات بگڑتے ہیں' مستحکم نظام ٹوٹتا ہے' تو اس کی تمام ذمہ داری عورت پر ڈالی جاتی ہے'

انگلستان کا مشہور مورخ ٹوائن بی' بھی اس کا قائل ہے' اور اس کے مطابق انسان کے شجاعانہ دور میں تمام تباہیاں عورتوں کی وجہ سے آئیں' اگرچہ اس وقت عورت کا رول بڑا خاموشی والا تھا لیکن عورتیں ان تمام خرابیوں کی ذمہ دار تھیں کہ جن کی وجہ سے ہیروز نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔

اس طرح تاریخ میں عورت کا جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی اپنی کوئی ذات نہیں وہ پوری تاریخ میں محض ایک شے کی مانند رہی ہے' جسے مرد نے اپنی خواہشات کے تحت استعمال کیا ہے' تاریخ کے اس تاثر سے ایک طرف تو مرد کو احساس برتری ہوتا ہے' تو دوسری طرف عورت خود کو کم تر سمجھ کر مرد کے تابع ہو جاتی ہے' اور وہ اسی راستہ پر چلنا چاہتی ہے کہ جو اس کے لئے مرد نے متعین کر دیا ہے' وہ ہنسی خوشی اپنے بچوں کو جنگ میں قربان کر کے شہید کی ماں ہونے پر فخر کرتی ہے' جس کی تازہ مثال عراق اور ایران کی جنگ ہے اور اس طرح وہ اپنی زندگی کے تمام دکھوں' اذیتوں اور صدموں کو خاموشی سے برداشت کر لیتی ہے'

اس لئے جب آج عورت کی جدوجہد کا سوال آتا ہے' اور جب وہ اپنے حقوق کے حصول کی بات کرتی ہے' تو تاریخ کے حوالہ سے اس سے کہا جاتا ہے کہ اس کو پہلے ہی زیادہ سے زیادہ حقوق دے دیئے گئے ہیں' لہٰذا ان کی جدوجہد کیسی۔ یہاں بھی قابل غور چیز یہ ہے کہ یہ نام نہاد حقوق بھی مرد نے اسے دیئے ہیں' عورت نے خود سے نہیں لئے ہیں' لہٰذا عورت کو ان حقوق پر مطمئن ہو کر احسان مند ہونا چاہئے۔

اس صورت حال سے عورت کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ تاریخ کو مکمل طور پر رد کرے' کیونکہ اس تاریخ میں اس کے لئے کچھ نہیں' کہ جس سے وہ متاثر ہو سکے' اور جس سے وہ اپنی حال کی جدوجہد کو منسلک کر سکے۔

عورت اور جدید مسلم معاشرہ کے تضادات

ڈاکٹر فاطمہ مرنیسی

عالم اسلام کی فکری اور عملی قوت محرکہ کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ دو پہلوؤں کے درمیان واضح امتیاز قائم کیا جائے۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ لوگ عملاً کیا کرتے ہیں؟ وہ کس قسم کے فیصلے کرتے ہیں؟ ان کے دلوں میں کس طرح کی امنگیں پروان چڑھتی ہیں اور وہ چیزوں کو برتنے میں ان امنگوں اور آرزوؤں کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ کہتے کیا ہیں؟ ان کے دعوے کیا ہیں؟ خاص طور پر ان کے وہ دعوے جو وہ اپنے سیاسی افکار کے بارے میں کرتے ہیں۔ پہلا پہلو ایک امر واقعہ ہے اور ایسی حقیقت ہے جو بدلتے وقت کے قوانین کی تابع ہے۔ دوسرے پہلو کا تعلق اپنے تشخص اور اس تشخص کے اظہار سے ہے۔ یعنی دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا۔ اور میری طرح آپ بھی جانتے ہیں کہ انسان جب دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے تو وہ زیادہ تر اپنی صفائیاں ہی پیش کرتا ہے۔ کہ اس وقت اس کے قدم مضبوط نہیں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے اس دعوے کو ہی لیجئے کہ وہ بہت زیادہ روایت پسند ہیں اور یہ کہ ان کی عورتیں معجزانہ طور پر معاشرتی تبدیلیوں اور زمانہ کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہی ہیں۔ یہ دعویٰ محض دوسروں کے سامنے اپنا علیحدہ تشخص ظاہر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کیونکہ عملاً ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ان کی نفسیاتی ضرورت ہے تاکہ بدلتی حقیقتوں کے انتشار میں کم سے کم اپنا تشخص برقرار رکھا جائے۔

میرا خیال ہے کہ عورتوں پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہو رہی ہے وہ بنیاد پرستی اور قدامت پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر ہے۔ لیکن اگر ہم مسلم معاشروں میں عورت کے مستقبل اور اس کے لئے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ہمیں

اس بندھے ٹکے اور گھسے پٹے خیال کو ترک کرنا ہو گا کہ بنیاد پرستی "قرون وسطیٰ کی پارینہ رجعت پسندی" کا اظہار ہے بلکہ ہمیں اسے اس طرح دیکھنا ہو گا کہ یہ ان لوگوں کا سیاسی عمل ہے جو ایسی حیران کن مگر لازمی تبدیلیوں سے دوچار ہیں جنہوں نے ان کے معاشی اور جنسی تشخص کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ تبدیلیاں اتنی ٹھوس اور اتنی بہت سی ہیں کہ انہوں نے ان کے اندر ایک نامعقول سا خوف پیدا کر دیا ہے۔

عالم اسلام کے بارے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اس انقلابی اور تغیرپذیر زمانے میں لایعنی چیزوں میں سے بھی معنی پیدا کر لیتے ہیں' یہاں مطلق العنان طاقتیں آج بھی انسانی زندگی سے کھیل رہی ہیں۔ اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو ابھی تک اپنے روشن مستقبل پر غیر متزلزل اعتماد بھی ہے۔ حالانکہ ان کا دفاعی میکنزم قریب قریب ٹوٹ چکا ہے (بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دفاعی میکنزم ٹوٹنے سے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی ہو!)

موجودہ عالم اسلام کو سمجھنے کے لئے اس کے ڈھانچے میں موجود اس عدم یکسانیت یا تضاد کو جاننا ضروری ہے جو اس کی اجتماعی اور انفرادی شخصیت کا حصہ بن چکا ہے۔ یہاں عمل اور اس عمل پر کی جانے والی فکر اور اس فکر کے اظہار میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ عمل کا تعلق حقیقت سے ہوتا ہے اور فکر کا تعلق نفسیاتی تصریح سے۔ نفسیاتی پہلو ہی ایک ایسا پہلو ہے جو انسان کے انفرادی تشخص کا شعور زندہ رکھتا ہے۔ فرد جسمانی بیماری سے مرتا ہے لیکن معاشرے اپنا تشخص ختم ہونے سے مر جاتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کو بامعنی کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ اس لئے کہ اصل طاقت کا مرکز یہی ہے۔ تشخص کا شعور یہ شعور ہے کہ ہماری زندگی بامعنی ہے۔ اور یہ کہ ہم خواہ کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں ہم اپنے ماحول پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ بنیاد پرستی کی لہر دراصل اپنے تشخص کے اظہار کی لہر ہے۔ چنانچہ وہ لوگ عورتوں کے لئے پردہ کی جو بات کرتے ہیں اسے مسلمانوں کے تشخص کے اس بحران کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جس سے آج کل تمام مسلم معاشرے گزر رہے ہیں۔

1970ء اور 1980 کی دہائی میں مسلم معاشروں میں لوگوں کے اندر عمل اور فکر کے جو تضادات نظر آتے ہیں اس کا سبب یہی ہے۔ ایک طرف تو

زمانے کے اندر تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں سے وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے بلکہ بڑی حد تک وہ ان تبدیلیوں کو قبول بھی کر رہے ہیں اور ان کی زندگی میں وہ تبدیلیاں نظر بھی آتی ہیں' لیکن دوسری طرف وہ اپنا کم سے کم انفرادی تشخص برقرار رکھنے کے لئے بھی ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی مصر ہیں کہ مذہبی روایات غیر متبدل ہیں۔ یہ ان کا نفسیاتی مسئلہ ہے۔

فرد اور معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے ہمارا جو تشخص بنتا ہے اسے ہمارے حقیقت پسندانہ رویہ کے ساتھ نہیں الجھانا چاہئے۔ ہمارا رویہ فرد کی حیثیت سے ہمارے عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ جبکہ کسی معاشرہ کا رکن ہونا ہمارے وجود کا اظہار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم جو عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے (یا اپنے آپ سے بھی) جو کہتے ہیں اس میں کتنا بعد ہوتا ہے۔ حقیقت اور حقیقت کی عکاسی میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان یہ بعد اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب معاشرہ کسی ایسے شدید بحران سے دوچار ہوتا ہے جب فرد کو اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ اپنے آپ کو ہی یہ بتا سکے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس وقت وہ کوئی مضبوط فکر پیدا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

تبدیلی سے ہر شخص خوف کھاتا ہے لیکن مسلمان اس سے کچھ زیادہ ہی ڈرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے دماغ میں قوت و اقتدار کا جو خیالی محل تعمیر کر رکھا ہے اس طرح وہ منہدم ہوتا نظر آتا ہے۔ دنیا بھر کی عورتیں خوب جانتی ہیں کہ ذات کی بالا دستی کے لئے خوابوں کے یہ محل کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ احیائے اسلام کی لہر اس تیزی کے ساتھ پھیلانے کا راز یہ بھی ہے کہ اسلام مسلمان بچے کو پیدائش کے وقت ہی یہ حق دے دیتا ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا خواب دیکھنا شروع کر دے' اور اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے۔ اس میں کچھ پابندیاں بھی ہیں لیکن اسلام شروع سے ہی "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کی تعلیم دیتا آیا ہے۔ پیغمبر اسلام وہ واحد پیغمبر ہیں جنہوں نے پورے کرہ ارض کو مسجد سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا "ساری زمین ہمارے لئے مسجد بنائی گئی ہے۔ میری امت کے کسی بھی پاکیزہ شخص کے لئے جس جگہ بھی نماز کا

وقت آ جائے وہی اس کی مسجد ہے۔" آپ کہیں بھی ہوں کعبہ کی جانب رخ کر کے، نماز ادا کر سکتے ہیں۔ پاکستانی مسلمان نماز کے لئے مغرب کی طرف منہ کرتا ہے تو مراکش کے مسلمان مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اسلام دوسری باتوں کے علاوہ مسلمان کے اندر ایسے نفسیاتی عناصر بھی پیدا کرتا ہے کہ وہ کرہ ارض پر کہیں بھی ہو، اس ماحول سے ہو یا نہ ہو وہاں کی زبان جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، وہ اپنے آپ کو وہاں سے ضرور مانوس کرلیتا ہے۔ ساتویں صدی میں اسلام ساری دنیا میں جس حیرت انگیز طور پر پھیلا اسے اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک عالم اسلام کی یہ خصوصیات نہ سمجھ لی جائیں۔

آج اسلام مشنریوں کے بغیر پھیل رہا ہے۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو اپنے اردگرد کی دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ پھیلتی ہوئی دنیا کے لئے ایک قطب نما ہے، یہ خلائی کائنات میں سفر کرنے کے لئے ایک نقشہ ہے وہ نامعلوم دنیاؤں میں چھلانگ لگانے کے لئے مسلمان تیار کرتا ہے۔ اگر ہم یہ بات سمجھ لیں تو ہماری سمجھ میں آ جائے گا کہ آج لاکھوں نوجوان اسلام پر اپنے پختہ ایمان کا دعویٰ کیوں کر رہے ہیں۔ نیز وہ عورتوں کو اپنی بات ماننے پر کیوں مجبور کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے عورتیں جن مسائل سے دوچار ہیں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بالادستی کے اس تصور کے دوسرے آئینے میں ہی دیکھتی ہیں۔

اگر بنیاد پرست عورتوں سے پردہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تیزی کے ساتھ پردہ ترک کر رہی ہیں۔ ہم ایسی صورت حال سے دوچار ہیں کہ بنیاد پرست مرد اور غیر بنیاد پرست عورتوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ بنیاد پرست مرد کون ہیں اور وہ غیر بنیاد پرست عورتیں کون ہیں جو پردہ ترک کر رہی ہیں۔ بعض اوقات جنسی امتیاز سے متعلق جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں ان میں طبقاتی تضاد کو بھی دخل ہوتا ہے۔ جدید دور کا اسلام اس کی بہترین مثال ہے۔ کیونکہ عالم اسلام میں مذہبی لگاؤ کے علاوہ جو زبردست کشمکش جاری ہے وہ خالص مادی تعیش یعنی سیاسی حاکمیت کے

استعمال اور منڈی میں اپنی قیمت زیادہ لگانے کے جذبات کی آئینہ دار بھی ہے۔

نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بنیاد پرست لوگ اور بے پردہ خواتین ہی دو ایسے گروہ ہیں جو متضاد دعووں کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ یہ دونوں گروہ ایک ہی عمر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیم بھی ایک ہی سطح کی ہے۔ لیکن مذہب کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے مرد زیادہ تر شہری متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ بے پردہ خواتین کا تعلق زیادہ تر شہروں کے بالائی اور متوسط طبقے سے ہے۔

تاریخ کی کتابیں مردوں نے لکھی ہیں اسی لئے وہ تاریخی واقعات کو مذہبی تقدس دے دیتے ہیں۔ عورت کے ماضی کو تبدیل کرنا تو مشکل ہے لیکن وہ مستقبل کی تشکیل ضرور کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ ایک نہایت اہم اور نازک سوال ہے کہ کیا ہم دوبارہ پردہ کے پیچھے جا سکتے ہیں؟ کیا ہم والڈ سٹی میں پھر جا سکتے ہیں؟ کیا ہم ان خیالی فیصلوں کے اندر پھر بند ہو سکتے ہیں جنہیں ہمارا قومی وقار کہا جاتا ہے؟ میں پیش آگاہی کا دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا۔

عورتیں پڑھی لکھی ہوں یا ناخواندہ، اب وہ اپنے مسائل کی تشخیص کر رہی ہیں اور انہیں سامنے بھی لا رہی ہیں۔ جن مسائل کو پہلے جذباتی کہہ دیا جاتا تھا آج عورتیں ثابت کر رہی ہیں کہ وہ خالصتاً سیاسی مسائل ہیں۔ آج عورت کا غصہ اور غم اس لئے نہیں ہے کہ اسے شوہر کے روٹھ جانے کا خطرہ ہے یا اسے یہ ڈر ہے کہ کوئی اور کلنکنی اس کے شوہر کو رجھا لے گی اور اس کی محبت پر قبضہ کر لے گی۔ بلکہ اس کا غصہ اس وجہ سے ہے کہ آخر مرد کو ہی یہ حق کیوں حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے اسے چھوڑ دے؟ سارا مذہبی تقدس صرف شوہر کو ہی کیوں حاصل ہے! وہ سوچتی ہے کہ اگر شوہر نے چھوڑ دیا تو وہ کیا کرے گی؟ یہ انصاف تو نہیں ہے؟ خدا اتنا غیر منصف تو نہیں ہو سکتا!

میرے خیال میں یہ ایک انقلابی عمل ہے جو مسلمان عورتوں کے اندر جاری ہے۔ یہ کوئی ایسی زبردست چیز نہیں ہے جسے ذرائع ابلاغ زیادہ اہمیت دیں

اور اس میں کوئی ایسا ڈرامہ بھی نہیں ہے کہ ہمارے اس انقلاب کو رومانوی شکل دلائی جائے۔ اس انقلاب سے مراد جلسے جلوس، پولیس کا لاٹھی چارج یا اخباروں اور ٹیلی ویژن پر اس کی تصویروں کی اشاعت نہیں ہے۔

ایک عورت اور بعض اوقات ماہر عمرانیات کی حیثیت سے میں نے گونگی طاقتوں، پوشیدہ خواہشوں، دبے ہوئے خواصوں اور ان دعووں کو اہمیت دینا سیکھا ہے جو زبان پر نہیں آپاتے۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ اور جذباتی زندگی میں دوسروں کے ساتھ میل جول کے دوران یہ سیکھا ہے کہ خاموشی کا مطلب رضا مندی یا اپنی شکست تسلیم کرنا نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ کی ذات یا آپ کی اصل آرزوؤں اور امنگوں کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ ہم روزانہ جو کام کرتے ہیں اس میں بہت سے دباؤ، بہت سی مجبوریاں اور بہت سے سمجھوتے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم کسی نہ کسی طرح اپنی خواہشات کا اظہار کر ہی دیتے ہیں اور اپنی خواہش پوری بھی کر لیتے ہیں۔

جدید سیاسی طاقتوں میں اسلام بھی ایک ایسی سیاسی طاقت ہے جو ساری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ مغرب کے لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ سیکولرزم کے اس دور میں اسلام کا احیا کیسے ہو رہا ہے۔ لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ اسلام روحانی طاقت سے زیادہ دنیوی اقتدار کے حصول اور مسلمانوں کے غلبہ پر توجہ دیتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے سیاسی نظام جب عام لوگوں کے مسائل حل نہ کر سکے تو خاص طور پر مسلمانوں کی نظر اسلام کے احیا پر ہی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا کا نوجوان طبقہ اس طرف زیادہ متوجہ ہوا ہے۔ لیکن ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آتی وہ علاقائی حدود کا مسئلہ ہے۔ ستر کی دہائی میں یہ مسئلہ بیرونی طاقتوں کے ساتھ بھی رہا اور مسلم ملکوں کے اپنے درمیان بھی۔ پھر یہ بھی سوال ہے کہ ہم مغربی ٹیکنالوجی لیں گے تو کیا اس کے ساتھ مغربی افکار ہمارے مزاج اور ہمارے رویوں پر اثرانداز نہیں ہوں گے؟ اس کے بعد ہمارا انفرادی تشخص کہاں رہ گیا؟ اگر آئی ایم ایف ہمارے اوپر دباؤ ڈال کر ہماری روٹی کی قیمت متعین کرا سکتا ہے تو پھر ہمارے قومی تشخص کا کیا ہو

گا؟ آج دنیا معاشی طور پر ایک دوسرے کی اتنی محتاج ہو گئی ہے کہ اپنے آپ کو بسم اللہ کے گنبد میں بند کرنا ناممکن ہے۔ بھلا بتائیے بین الاقوامی مگرمچھوں کے سامنے ہماری مسلم مملکتوں کی کیا حیثیت ہے؟ یہی وہ تضادات ہیں جنہوں نے مسلم دنیا کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہم اپنا انفرادی تشخص بھی چاہتی ہیں اور مغرب کے میدان میں جا کر اس کا مقابلہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔

1975ء تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ عورتوں میں بڑھتی ہوئی آزادی کی لہر سے مسلم معاشرے اتنے پریشان کیوں ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ معاشرے صرف اس لئے پریشان نہیں ہیں کہ انہیں اپنا ماضی خطرے میں نظر آنے لگا ہے بلکہ ان کی پریشانی اس لئے بھی ہے کہ اس کے سات ہی ان کی جنس، سیاسی اقتصادی، اور ثقافتی سرحدوں کا بھی از سر نو تعین شروع ہو گیا ہے۔ مغرب سے عام ضرورت کی جو اشیاء درآمد کی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ سیٹلائٹ کے ذریعہ مغربی ذرائع ابلاغ نے ہمارے اوپر جو حملہ کر رکھا ہے اس نے ان معاشروں کو پریشان کر دیا ہے۔

مسلم معاشروں نے مغرب کی ٹیکنالوجی اور اس کی ترقی کو تو قبول کر لیا ہے لیکن وہ اپنے قدیم معاشرہ کا تانا بانا بکھرتا نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے خلاف وہ مزاحمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ عورت کا مردوں کے ساتھ باہر آنا ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورت کی آزادی کے ساتھ ہی مسلم معاشرہ کا قدیم تانا بانا بکھر جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کو پردہ کی اتنی ضرورت کیوں ہے؟

بنیاد پرست کون ہے؟

آپ کے ذہن میں بنیاد پرست کی تصویر کیا ہے؟ اگر یہ سوال امریکیوں سے کیا جائے تو وہ کہیں گے کہ بنیاد پرست مسلمان بے پڑھا لکھا، غیر مہذب، بازاری، خون کا پیاسا، عورت بیزار، مفلس، سیاسی طور پر ناکام ایک ایسا دہشت گرد ہوتا ہے جس کے گلے میں بندوق اور ہاتھ میں پستول ہوتا ہے اس عفریت نما

مخلوق کی نظریں صرف ایک نشانہ پر جمی ہوئی ہیں اور وہ نشانہ ہے امریکہ اور اس کے پیارے پیارے امن پسند' جمہوریت نواز' سائنسی ذہن کے مالک' اعلیٰ اخلاق والے خوش حال شہری' لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بنیاد پرست نہ پڑھا لکھا ہے' نہ خون آشام ہے اور نہ بنیادی طور پر امریکہ دشمن ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت کا دشمن بھی ہو۔ اور پھر وہ عام بازاری انسان بالکل نہیں ہے۔ وہ انتہائی جدید حالات کی پیداوار ہے۔ اسے تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری زندگی اور سرکاری امداد سے چلنے والے عام تعلیمی اداروں نے پیدا کیا ہے۔

وہ غیر تعلیم یافتہ تو بالکل بھی نہیں ہے۔ مصر میں حامد انصاری نے جو سروے کیا ہے اس کے مطابق جن 280 انتہا پسندوں کے بارے میں معلوم کیا گیا ان میں سے 43 فیصد طلبہ تھے' 12٫5 فیصد پیشہ ور افراد اور صرف 14٫6 فیصد مزدور تھے۔ نیز 10٫7 فیصد بے روزگار تھے۔ کسانوں میں سے تو مشکل سے 2٫2 فیصد ہی ان کے ساتھ تھے۔ ایران میں شاہ کے خلاف جوجہد میں جو لوگ مارے گئے ان میں زیادہ طالب علم تھے اس کے بعد انجنیئر ڈاکٹر اور دفتروں میں کام کرنے والے آتے ہیں۔

بنیاد پرست کسانوں یا مزدوروں کے طبقے سے ہرگز تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا تعلق متوسط یا نچلے متوسط طبقے سے ہوتا ہے۔ اور یہ عام طور پر پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے شعبے میں تعلیمی لحاظ سے بہت ترقی کرتے ہیں اور اعلیٰ معیار حاصل کرتے ہیں۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں گے جن میں ہمیشہ لڑائی جھگڑے رہتے ہوں گے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ مصر میں جو تحقیق کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے اکثر وہ نوجوان ہیں جن کے خاندان میں کوئی طلاق نہیں ہوئی' ماں باپ میں کبھی علیحدگی نہیں ہوئی اور ماں یا باپ میں سے کسی کا بھی انتقال نہ ہوا۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کے اندر یہ تشدد پسندی کہاں سے آئی؟

مصر ایران اور پاکستان میں احیائے اسلام کی تحریکوں کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کی طرف وہ نوجوان زیادہ راغب ہوتے

ہیں جن کی بنیاد دیہاتی ہے۔ یہ لوگ متوسط یا نچلے سے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر انہوں نے تازہ تازہ متوسط طبقے میں قدم رکھا ہے۔ انہوں نے شہروں کی زندگی کا نیا مزہ چکھا ہے اور انہیں مغربی اثرات سے بھی سابقہ پڑا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پرانی اقدار لائے ہیں جنہیں وہ چھوڑنا نہیں چاہتے اسی لئے وہ اپنی روایات کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر شہروں کے گنجان آباد علاقوں اور پھیلتے ہوئے چھوٹے شہروں میں رہتے ہیں۔ صنعتی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ دیہات سے زبردست نقل مکانی ہوئی ہے۔ کسانوں کے بچے بھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہروں کی طرف بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی قدامت پرستی کی روایات بھی لائے ہیں۔

بنیاد پرستی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک متروک نظام کو واپس لانے کی کوشش ہے۔ وہ قرون وسطیٰ کے افکار کے احیا کی کوشش ہے۔ عورتوں کو پردہ کرانے کی مہم کو بھی اس زمرہ میں لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ اس صورت حال کو ہمیں تعلیم کی پھیلتی ہوئی سہولتوں کے تناظر میں سمجھنا چاہئے۔ پہلے تعلیم کھاتے پیتے لوگوں کے لئے مخصوص تھی۔ پڑھا لکھا آدمی معاشرہ میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اس کو اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔ لیکن اب شہر اور دیہات کا عام آدمی بھی یونیورسٹیوں میں جا رہا ہے۔ ان بنیاد پرستوں کے عورتوں کے خلاف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان یونیورسٹیوں میں اب محروم طبقوں کے مردوں کو ہی داخلہ نہیں ملتا بلکہ ان میں عورتیں بھی داخل ہو رہی ہیں۔

طلبہ اور طالبات میں مقابلہ

بنیاد پرست مرد دراصل خود غرض ہے۔ اس کے لئے عورت اس لئے مسئلہ بن گئی ہے کہ اسے خود جدید تعلیم یافتہ فرد کا جو تشخص حاصل ہوا ہے، عورت اس میں دخل اندازی کرتی ہے۔ وہ تنہا اس دنیا کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتا ہے۔ عورت پڑھ لکھ کر اور میدان میں آکر اس کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس اعتبار

سے دیکھا جائے تو مسلم معاشرہ میں جو سماجی جمہوریت پیدا ہوئی ہے' بنیاد پرست اس کا نمائندہ ہے۔ تعلیم کی توسیع چونکہ ایک نئی صورت حال ہے اس لئے بزرگوں کے مقابلے میں آبادی میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے۔ ایران میں پندرہ سال سے کم عمر افراد آبادی کا 45 فیصد اور مصر میں 39 فیصد ہیں۔ آبادی کے دوگنا ہونے کا تناسب ایران میں 23 سال اور مصر میں 22 سال ہے۔ ایران کے ثانوی اسکولوں میں داخلے کا تناسب لڑکیوں کا 35 فیصد اور لڑکوں کا 54 فیصد ہے۔ مصر میں لڑکیوں کا تناسب 39 فیصد اور لڑکوں کا 64 فیصد ہے۔ دوسرے مسلم معاشروں میں بھی یہی تناسب پایا جاتا ہے۔ صدیوں سے مسلمان عورت کو تعلیمی سرگرمیوں سے باہر رکھا گیا تھا لیکن اب لڑکیاں تیزی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اب عورت کے لئے کالج یا یونیورسٹی میں جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پہلے مسلم عورت کے مقدر میں جہالت ایسی لکھ دی گئی تھی کہ میری دادی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ حکومت نے لڑکیوں کے لئے جو اسکول کھولے ہیں وہ چلتے بھی رہیں گے۔ چنانچہ وہ مجھے اور میری بہن کو فجر کی نماز کے وقت ہی اٹھا دیا کرتی تھیں کہ "جلدی سے اسکول جانے کے لئے تیار ہو جاؤ" میں ان سے کہتی کہ ہمارا اسکول کھلنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ مگر وہ کہتیں۔ تم جلدی جاؤ اسکول کے دروازے پر کھڑی ہو جاؤ کیا پتہ حکومت اسے بند ہی کر دے۔" وہ کہتی تھیں۔ " میں چاہتی ہوں تم خوب سمجھ کر قرآن پڑھ لو کہ اگر میں تم سے کسی آیت کا مطلب پوچھوں تو فوراً بتا سکو۔ قاضی کی عزت اسی لئے تو ہے کہ وہ قرآن سمجھتا ہے۔ لیکن قرآن کے ساتھ عورت کو حساب بھی آنا چاہیئے۔ حساب کے بغیر کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔" گویا میری دادی کو بھی تعلیم کی سیاسی اہمیت کا احساس تھا۔

کچھ عرصے پہلے تک بیس سال سے پہلے ہی لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی تھی۔ آج مصر میں اس عمر کی صرف 22 فیصد اور ایران میں 38.4 فیصد لڑکیاں شادی شدہ ہیں۔ ایران میں غیر شادی شدہ عورتوں کی فوج نے وہاں مردوں کو کتنا پریشان کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران میں قانونی طور پر شادی کی عمر لڑکی کے لئے تیرہ سال اور لڑکے کے لئے پندرہ سال کرائی گئی ہے

کسی بالغ لڑکی کا غیر شادی شدہ رہ جانا مسلم معاشروں کے لئے ایک نئی بات ہے۔ پہلے تو بلوغت کے ساتھ ہی لڑکی کی شادی کرائی جاتی تھی تاکہ شادی سے پہلے وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کو خاندان کی بدنامی نہ کردے۔ مردوں کی بالادستی کی ساری عمارت عورت کے کنوارپن کی بنیاد پر ہی قائم تھی۔ عورت محض بچے پیدا کرنے اور خاندان بڑھانے کا ذریعہ تھی۔ جلدی شادی سے زیادہ بچے بھی ہوتے تھے۔ بالغ کنواری لڑکی کو معاشرہ کے لئے "فتنہ" تصور کیا جاتا تھا۔

آج نوجوان لڑکے اس لئے اپنی شادی ملتوی رکھتے ہیں کہ انہیں کوئی محفوظ ملازمت نہیں ملتی یا ایسی ملازمت کے لئے وہ بروقت ڈگری حاصل نہیں کر پاتے۔ اب لڑکیاں دولت مند شوہر تلاش کرنے اور اس پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اچھی تعلیم حاصل کر کے بہتر ملازمت یا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ چنانچہ عرب ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی شادی کی عمر کی اوسط میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ مصر اور تیونس میں اب یہ عمر عورت کے لئے 22 سال اور مرد کے لئے 27 سال ہو گئی ہے۔ الجزائر میں اوسط عمر عورت کے لئے 18 سال اور مرد کے لئے 24 سال ہے۔ مراکش، لیبیا اور سوڈان میں مرد 25 سال میں اور عورت 19 سال میں شادی کرتی ہے۔ عرب امارات میں بھی غیر شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کی عمر میں اضافہ ہوا ہے۔ وہاں لڑکی کی اوسط عمر 20 سال اور لڑکے کی 27 سال تک ہو گئی ہے۔ شادی پر شہری زندگی کی کا اثر زیادہ پڑا ہے۔ شہروں میں رہنے والے زیادہ تر دیر سے شادی کرتے ہیں۔

مصر میں زیادہ عمر میں شادی کرنے کا جو سروے کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم پھیلنے کے ساتھ ہی دیر سے شادی کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ عورتوں اور مردوں کو تعلیم کی جتنی زیادہ سہولتیں میسر آ رہی ہیں اتنی ہی ان میں دیر سے شادی کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ مصر میں جلدی شادی کرنے والوں کی تعداد میں بہت کمی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کا فروغ ہے۔

مغرب میں عورتوں کی تعلیم کا اتنا شدید اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کو ایک زمانے سے تعلیم کے مواقع حاصل

تھے اس لئے انہوں نے اپنا روایتی رول برقرار رکھا۔ مسلم دنیا میں عورتوں کی آزادی کے خلاف یلغار کو سمجھنے کے لئے زمانے کے بنیادی اجزا کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ ہم پڑھی لکھی خواتین میں سے اکثر کی مائیں ان پڑھ تھیں۔ عورت کو تعلیم کی سہولت ملی تو اس پر اس کا فوری اثر ہوا اور اس نے اپنی شناخت کی۔ اس نے اپنی جنسی حیثیت اور بچے پیدا کرنے والی کے رول کا از سر نو جائزہ لیا۔ مصر میں ہی سروے کیا گیا ہے کہ ان پڑھ عورتوں کے پیدا ہونے والے بچوں کا تناسب اگر 4،4 ہے تو پڑھی لکھی عورتوں کے بچوں کا تناسب 2،2 ہے۔ اور یہ عورتیں وہ ہیں جنہوں نے ثانوی اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرنے والی عورتوں کے ہاں بچوں کی پیدائش کا اوسط محض 1،8 ہی ہے۔ دوسرے مسلم معاشروں میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اصل توجہ طلب بات یہ ہے کہ عورت کی تعلیم نے مسلم ملکوں میں جنسی شناخت اور بچوں کی پیدائش کے روایتی رول کو یکسر بدل دیا ہے۔ یہ معاشرے عورتوں کے کنوارپن اور بچوں کی پیدائش کے خبط میں مبتلا تھے۔ ان معاشروں میں عورت اور مرد کو اس لئے الگ رکھا جاتا تھا اور اسی لئے جلدی شادی پر اصرار کیا جاتا تھا۔ جلدی شادی کے تصور نے عورت کی زندگی محدود کر دی تھی اور اس کی توقعات کو محدود کر دیا تھا ——— عورت خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہو دولت مند شوہر اور بہت سے بچے پیدا کرنے کے خواب دیکھتی تھی۔ نرینہ اولاد اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اب عورت توہمات اور جادو ٹونے کا سہارا لے رہی ہے۔ جادو ٹونا کرنے والے پیر فقیر اور اب نئے دور میں ماہر نفسیات خوب پھل پھول رہے ہیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ سلسلہ زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔

مراکش کے شہروں میں ستر اور اسی کی دہائی میں اچانک شادی اور بچوں کی پیدائش سے متعلق نفسیاتی مشوروں اور جادو ٹونے کی روایات میں اضافہ ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ دقیانوسی توہمات کا احیا ہو رہا ہے۔ لیکن اسے اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک طرف عورتوں کی عام تعلیم اور روزگار میں ان

کی زیادہ شرکت اور دوسری طرف ان کے پرانے روایاتی تصورات اور عقائد کے درمیان جو کشمکش بڑھ رہی تھی اس نے ان کے اندر ذہنی انتشار پیدا کیا ہے اور وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی ہیں۔ اب وہ کم عمر میں شادی سے گریز کر رہی تھیں لیکن ذہنی طور پر اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ 1982ء میں مراکش میں جو قومی مردم شماری کرائی گئی اس سے پتہ چلا کہ غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ 1971 اور 1982 کی مردم شماری کے درمیان اس تناسب میں جو فرق پایا گیا وہ یہ تھا کہ اس عرصے میں پندرہ سال سے زیادہ عمر میں شادی کرنے والے مردوں کا تناسب 38 فیصد سے بڑھ کر 47ء3 فیصد اور ایسی عورتوں کا تناسب 23ء5 فیصد سے بڑھ کر 31ء9 فیصد ہو گیا۔ پندرہ سال کے عرصے میں یہ فرق پڑا۔ اب کم عمر میں شوہر کا ملنا ہی مشکل نہیں ہو گیا بلکہ کم عمر میں کی جانے والی زیادہ شادیاں ناکام بھی ہونے لگیں۔ ایسی 16ء6 شادیاں طلاق پر ختم ہوئیں۔

ایسی لڑکیوں کی دوسری شادی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں جن کی پہلی شادی بیس سال سے پہلے ہو گئی ہو یا وہ دیہات میں رہتی ہے یا پھر کم تعلیم یافتہ ہے۔ تعلیم یافتہ عورت کی دوسری شادی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ورلڈ فرٹلٹی سروے میں بتایا گیا ہے کہ تعلیم سے عورت کے بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔

مرکش کی عدالتوں نے گھریلو جھگڑوں میں عورت کی زیادہ تعلیم اور اس کی ملازمت کو بھی ذمہ دار قرار دیا ہے۔ فاطمہ معادی نے اس موضوع پر حال ہی میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ انہوں نے خاندانی تنازعات سے متعلق تین ہزار مقدموں کی فائلیں عدالتوں سے نکال کر ان کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ گھر سے باہر عورت کی ملازمت اور اس کی کمائی زیادہ تر تنازعات کا سبب بنی۔

جو عورتیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہیں وہ پھر نمایاں بھی ہو جاتی ہیں۔ وہ اعلیٰ عہدوں کے لئے بھی مردوں سے مقابلہ کرتی ہیں۔ وہ سول سروس میں جاتی ہیں اور دوسرے پیشہ ورانہ عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مراکش میں ملازمتوں کے ڈھانچے کا جو سروے کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لبرل

پیشوں اور سائنسی میدان میں عورتوں کا تناسب 29.9 اور سول سروس میں 27.7 فیصد ہے۔

مراکش میں سب سے زیادہ مقبول ٹیلی وژن ڈرامہ مصر کے نبیل غلام کا "شادی شدہ مگر بیگانہ" تھا۔ یہ ڈرامہ سیریل 1986 میں چلا۔ اس میں ایک ایسے ریٹائرڈ افسر کی کہانی بیان کی گئی ہے جو یہ حقیقت قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ وہ جس کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے وہ عہدہ اس کی بیوی کو مل جائے۔ مصنف نے تعلیم یافتہ عورت کی ترقی اور روایتی اسلامی معاشرہ میں شوہر کی تابع داری کے تضاد اور کشمکش کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے' جس سے دیکھنے والے محظوظ بھی ہوتے ہیں اور نہایت اہم مسئلے پر غور کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ اکرام ایک نہایت کامیاب بیوی اور بہت کامیاب افسر ہے۔ وہ اپنی کمپنی کی طرف سے کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جینوا جا رہی ہے لیکن اسے ایئرپورٹ پر روک لیا جاتا ہے کیونکہ اس کے شوہر نے ایئرپورٹ کے حکام کو ہدایت کی ہے کہ اس کی بیوی کو ملک سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ یہ ڈرامہ رات کو نو بجے دکھایا جاتا تھا اور پھر اس پر ہر گھر میں رات گئے تک بحث کی جاتی تھی حتیٰ کہ صبح کو دفتروں میں بھی اسی پر گفتگو ہوتی تھی۔

مسلم ملکوں میں عورتوں کے خلاف قدامت پرستی کی جو لہر آئی ہے وہ کوئی رجعت پسندانہ تحریک نہیں ہے' بلکہ مردوں کی طرف سے ان کا دفاعی میکنزم ہے۔ مرد اور عورت کے کردار اور جنسی شناخت میں جو تبدیلی آئی ہے اور عورتوں کے اندر جو شعور بیدار ہوا ہے یہ تحریک اس کے خلاف بند باندھنے کی کوشش ہے۔ مردوں کی قدامت پرستی اور عورتوں کا نفسیاتی علاج اور جادو ٹونوں کی طرف میلان' دراصل ان الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش ہے جو نئے حالات نے پیدا کی ہیں۔ یہ الجھنیں تغیر پذیر معاشرہ اور عورت اور مرد کے تبدیل ہوتے کردار کی پیدا کردہ ہیں۔

بنیاد پرستوں کی یہ بات درست ہے کہ عورتوں کی تعلیم نے عورت اور مرد کے مکانی فرق اور روایتی جنسی امتیاز کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ تیل سے مالا

مال عرب ملکوں میں بھی اسکولوں کی تعلیم نے عورت اور مرد کے میل جول پر پابندی کی دیواری گرا دی ہے۔ وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکول یقیناً الگ الگ ہیں۔ لیکن اسکول جانے کے لئے بہر حال لڑکیوں کو سب کے سامنے سڑک تو پار کرنا ہی پڑتی ہے۔ روایتی طور پر سڑکیں گناہوں اور جنسی ترغیب کا مرکز ہوتی ہیں کیونکہ وہاں مرد اور عورت اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ روایتی طور پر "فتنے" کی تعریف بھی یہی ہے۔ بنیاد پرستوں کا یہ خیال بھی غلط نہیں ہے کہ خاندانی اخلاقیات نے عورت کے لئے روایتی طور پر جو فرائض متعین کئے تھے ان میں ردوبدل سے ساری خرابی پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ عمر میں شادی ہونے کی وجہ سے عورت اپنی ذات کی ترقی کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اب اگر عورتوں میں تعلیم کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ دیہات سے شہروں کی طرف نیا نیا آنے والا تعلیم یافتہ طبقہ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ عورت کو اسلام دشمن کیوں سمجھتا ہے اور اسے کوئی اہم عہدہ دینے کے خلاف کیوں ہے۔ مصر کی یونیورسٹیوں میں پڑھانے والی عورتوں کا تناسب 1981ء میں 25 فیصد تھا۔ اب اس کا موازنہ امریکہ اور جرمنی سے کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ اسے عرصے میں امریکی یونیورسٹی میں پڑھانے والی عورتوں کا تناسب 24 فیصد اور جرمنی میں 25 فیصد تھا۔ گویا مسلم ملکوں میں عورتوں کی تعلیم زیادہ تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ سعودی عرب خاصا قدامت پسند ملک ہے۔ لیکن وہاں کے تعلیمی اداروں پر بھی عورتوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ وہاں عورت کی تعلیم مرد سے الگ ہی ہوتی ہیں لیکن وہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی پڑھانے والی عورتوں کا تناسب 22 فیصد ہے مراکش میں 18 فیصد' عراق میں 16 فیصد اور قطر میں یہ تناسب 12 فیصد ہے۔

بنیاد پرست جس بات پر خوف زدہ ہیں وہ یہ ہے کہ آزادی کے اس دور سے ان کی خواہش کے مطابق صرف مردوں پر مشتمل نیا طبقہ پیدا نہیں ہو سکا بلکہ اس دعوت شیراز میں عورتیں بھی شرکت کر رہی ہیں۔ عورت اور ریاست کے رشتے اور علم کی منظم تقسیم سے متعلق اسلامی تصور میں یقیناً یہ بہت بڑا انقلاب ہے۔

عورتیں اور اسلام

شاہین سردار علی

دنیا بھر میں ایسا لگتا ہے کہ اسلامی معاشرے زبردست ردوبدل کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ان ملکوں میں احیائے اسلام کا زبردست جوش و جذبہ نظر آ رہا ہے اور یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ بنیادی اسلامی نظام کا احیا کیا جائے اور اصل اسلامی معاشرہ کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ ایران ہو یا پاکستان' الجزائر ہو یا سوڈان ہر معاشرہ میں مذہب کی بنیاد پر کی جانے والی سیاست کے بیج پڑ گئے ہیں۔ موٹے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں تین رجحانات نمایاں ہیں۔ ایک طرف سیکولر نظام کے حامی ہیں جو دین کو سیاست سے بالکل جدا رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معاشرہ کی تمام بیماریوں کا علاج سیکولر نظام میں ہے۔ دوسری طرف احیائے اسلام کے حامی ہیں جنہیں "بنیاد پرستوں" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی شریعت پر مبنی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تیسرا حلقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والے نو آزاد اسلامی ملکوں میں قانونی اصلاحات کیں۔ یہ لوگ اصلاح پسند ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اسلامی ملکوں کو ترقی کرنا ہے تو اسلام کی ترقی پسندانہ تشریح اور تفسیر کرنا پڑے گی۔ حالیہ برسوں میں بنیاد پرستوں نے جو تقویت حاصل کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عام لوگ ان اصلاحات سے مطمئن نہیں ہو سکتے' گویا ایک طرح کی طلسم شکنی ہوئی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ انہیں مذہب سے بیگانہ کرنے کی یہ مغربی سازش ہے۔ لیکن نام نہاد اسلامی نظام کے لئے ان ملکوں میں کچھ ایسی یک طرفہ غیر منصفانہ قانون سازی کی گئی ہے کہ اس پر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور زبردست بحث مباحثہ شروع ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جن کا اثر عورتوں اور معاشرہ کے دوسرے کمزور طبقوں پر پڑا ہے حدود

آرڈیننس [1979] قانون شہادت [1984] اور شریعت بل [1990] صاف ظاہر کرتے ہیں کہ بنیاد پرست عورتوں کو ہی اپنا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے صدیوں پرانے اس رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مرد مذہب کے نام پر عورتوں کو اپنے قابو میں رکھنے پر مجبور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلامی قوانین عورتوں پر اور معاشرہ میں ان کی حیثیت پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ ایسے رسوم و رواج کیوں قبول کئے جاتے ہیں جو اسلامی شریعت کے خلاف ہیں لیکن مردوں کی فوقیت مسلط کرتے ہیں؟۔ اس مقالے میں ہم عورتوں کی حیثیت' اسلامی شریعت' قرآن کی مختلف تفاسیر' اور احادیث کو قانون سازی کا مرکز بنانے پر غور کریں گے۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ عورتوں کے انسانی حقوق کو جو خطرات درپیش ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی جا سکتی ہے؟

اسلام میں عورت کا مقام

اسلام میں عورت کا مقام ایسا موضوع ہے جو خاصا متنازعہ ہے۔ اس لئے اس پر نہایت محتاط انداز میں غور کرنے کی ضروت ہے۔ چونکہ اسلامی معاشروں کے درمیان طرز زندگی اور معاشرتی طور طریقوں میں کافی اختلافات ہیں اس لئے جنسی رویے بھی بڑی حد تک مختلف ہیں۔ مسلمان خواتین ہر معاشرہ میں بالکل مختلف انداز میں زندگی گزارتی ہیں اور ہر معاشرہ میں ان کی زندگی پر ان کے اپنے اثرونفوذ کی وسعت مختلف ہے۔ اس لئے "مسلم عورت" کے بارے میں کوئی قطعی بیان دینا ٹھیک نہیں ہو گا۔ البتہ ان محرکات پر غور کیا جا سکتا ہے جو اسلام میں عورت مرد کے رشتے کا تعین کرتے ہیں اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی' معاشی اور سماجی عوامل نے مسلم عورت کا موجودہ تصور کیسے پیدا کیا ہے۔

اسلام میں عورت کے مقام پر بات کرتے ہوئے خود بخود ہماری توجہ ان تضادات کی طرف چلی جاتی ہے جو ہماری عام زندگی اور ذاتی زندگی کے درمیان موجود ہیں اور جنہوں نے عورت کو عام معاشرتی زندگی میں الگ تھلگ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کے ماں' بیٹی اور بیوی کے کردار کو تو خوب اچھالا جاتا ہے لیکن ایک انسان کی حیثیت سے اس کے حقوق کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ اسلام سے

قبل کے قبائلی نظام کی عکاسی کرتا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تفریق کے بغیر جمہوری اور فلاحی معاشرہ کا جو تصور دیا تھا' اس کی نفی کرتا ہے۔

صدیوں سے علما' امام اور سیاست دان اسی رجحان کو تقویت دیتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے اسلام' اس کی ترویج اور اسلامی تاریخ کے صرف ان پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا ہے جو ان کے لئے فائدہ مند تھے۔ لیکن دقیقہ رس نظر اسلامی معاشرہ کے اولین دور تک پہنچ جاتی ہے' جب مکمل مساوات کا دور دورہ تھا۔ آنحضرت کا نصب العین ذاتی اور عام زندگی کا فرق مٹانا تھا۔ اس مساویانہ اور فلاحی رویہ کا اندازہ مسجد کے فن تعمیر[جو سیاسی اور عام زندگی کا مرکز ہوتی تھی' اور آنحضرت کے رہائشی گھر[ذاتی زندگی کا مرکز) سے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کے کمرہ کا دروازہ مسجد کے اندر کھلتا تھا۔ اس طرح عام زندگی اور ذاتی زندگی کا فرق مٹا دیا گیا تھا۔ اس انتظام نے عورتوں کی زندگی اور سیاست کے ساتھ ان کے تعلق کے لئے بھی فیصلہ کن رول ادا کیا۔ یہ طرز زندگی کے تمام شعبوں میں عورت کی شرکت کا علامتی اظہار بھی تھا اور اس طرح عورتیں سیاسی مطالبات اور مردوں کی طرح اپنے حقوق منوا سکتی تھیں۔

عام اور ذاتی زندگی کو یک جا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان عورتوں کے ترجمان بن گئے اور اسلام میں عورت کے مقام کا سوال خود انہوں نے اٹھایا۔ مثلاً امہاۃ المومنینؓ میں سے حضرت ام سلمیٰؓ نے جب یہ سوال کیا کہ قرآن میں عورتوں کا ذکر کیوں نہیں ہے تو قرآن کی آیت 53 [سورۃ 33] نازل ہوئی جس میں عورت اور مرد کو برابر قرار دیا گیا اور انہیں ایک ہی برادری کے ارکان بتایا گیا۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ جنس خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں کرتی۔ یہ ایمان اور خدا کی اطاعت ہے جو کسی کو خدا کے قریب کرتی ہے۔ عورت کے لئے ایک پوری سورۃ نساء نازل کی گئی جس میں وراثت کے اصول طے کئے گئے اور مرد کو زیادہ مراعات سے محروم کیا گیا۔ آج بیسویں صدی کے آخری عشرے میں یہ اندازہ کرنا خاصا مشکل ہے کہ ایک قبائلی معاشرہ میں یہ اصول نافذ کرنا کتنا بڑا انقلابی قدم تھا اور ان قوانین نے مردوں کے اس معاشرہ پر کتنا مثبت اثر ڈالا۔ ان دنوں عورت ایک قیمتی اثاثہ سمجھی جاتی تھی۔

جنگوں میں وہ مال غنیمت بنتی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد خاندان کے مرد ترکہ کے طور پر اسے حاصل کرتے تھے۔ اور اسے کنیز کے طور پر فروخت کیا جاتا تھا۔ اسلام نے ایک تو مردوں کو اس قیمتی مال سے محروم کیا۔ اوپر سے وراثت میں انہیں حصہ دار بھی بنایا۔ پھر جنت میں بھی انہیں برابر کا درجہ دیا۔ مردوں کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ ان کے مال و اسباب میں عورت کو حصہ دار بنا دیا گیا تھا اور معاشرہ میں اسے مساوی درجہ عطا کیا گیا تھا۔

عام اور ذاتی زندگی یکجا کرنے سے عربوں کو بہت تکلیف تھی۔ سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی طور پر انہیں اس میں نقصان نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ عمر ابن الخطاب کی قیادت میں مکہ کے شرفاء کا ایک وفد آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اعلان کیا ہم اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان اسلام کی عظمت پر قربان کرنے کو تو تیار ہیں لیکن اپنی نجی زندگی اور عورتوں کے متعلق اپنی مراعات میں مداخلت برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس سبب غیر یقینی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا لیکن پھر قرآن کی آیت نازل ہوئی جس میں مردوں کی برتری کو تو تسلیم کیا گیا لیکن عورتوں کے مقام کو کم نہیں کیا گیا۔ اس سے حکمران اشرافیہ نے فائدہ اٹھایا اور عورتوں پر تسلط قائم رکھنے کے لئے اس سے کام لیا۔ ایسی ہی ایک آیت سورہ نساء میں [4 - 43] ہے جو سورہ 33 کی آیت 35 [ام سلمیٰؓ کے سوال پر نازل ہوئی تھی) سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس آیت کا ترجمہ ہے —— " مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعضوں پر فضیلت دی ہے۔ اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔ سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں مرد کی عدم موجودگی میں بحفاظت اپنی نگہداشت کرتی ہیں۔ اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔ [ترجمہ : مولانا اشرف علی تھانوی) اس طرح معاشرتی درجات میں مال خرچ کرنے کا عنصر داخل ہو گیا۔

مساوات کے ابتدائی پیغام کے بعد اس آیت کی وضاحت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ صرف عورت اور مرد کی نا برابری کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ مال و متاع میں مرد کا حق مانا گیا ہے اور عورت کو اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس آیت میں مرد کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ "نشوز" یا بددماغی پر اپنی بیویوں کو مارتے ہیں تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اتنے اختلافات ہیں کہ وہ مرد مفسرین بھی اس کی تفسیر کرتے ہوئے مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں جو مرد کی برتری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ آیت اس مساوات کے حق میں نہیں جاتی جو عام اور نجی زندگی کی دوئی ختم کرنے کے لئے اسلام سے منسوب کی جاتی ہے۔

حجاب [پردہ] جنس کی بنیاد پر فریق کی علامت

علماء اور مفسرین قرآن کی سورہ 53 کی آیت 33 کو عورت کے پردے یا حجاب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ یہ ان آیتوں کے سلسلے کی پہلی آیت ہے جو عورت کو زندگی کی نجی حدود میں بند کر لیتی ہیں اور مرد اور عورت کے حلقوں میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ جس موقع کی مناسبت سے یہ آیت نازل ہوئی اس کے اثرات اور نتائج عورتوں کے لئے خاصے دور رس ثابت ہوئے۔ یہ آیت اس رات نازل ہوئی جب آنحضرت نے اپنی عم زاد حضرت زینب سے نکاح کیا تھا۔ آنحضرت تخلئے کے متمنی تھے لیکن بعض بد اخلاق مہمان ضیافت کے بعد بھی وہاں سے اٹھنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر ایک صحابی انس ابن مالک نے اطلاع دی کہ تمام مہمان چلے گئے ہیں ابھی انس وہاں موجود ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اس وقت کمرے میں آنحضرت، زینب اور انس موجود تھے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس وقت آنحضرت نے اپنے اور انس کے درمیان ستر [یا پردہ] گرا دیا۔ اس طرح حجاب مرد اور عورت کے درمیان نہیں کیا گیا بلکہ دو مردوں کے درمیان کیا گیا۔ لیکن اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ عورت کو حجاب میں رکھا گیا ہے۔ اور یوں عورت کو پردہ کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ حجاب کی آیت پانچویں سال ہجری [627 عیسوی] میں نازل

ہوئی تھی۔ یہ وقت مسلمانوں کے لئے اچھا نہیں تھا۔ مدینہ کے باشندوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے اور آنحضرت سے درخواستیں کی جا رہی تھیں کہ عورتوں اور مردوں کی مساوات کے لئے جو اعلان کئے گئے ہیں انہیں واپس لے لیں۔ لوگوں نے حضرت عائشہ پر بھی یہیں تہمت لگائی تھی اور مدینہ کی گلیوں میں لوگوں نے مسلمان عورتوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے لئے پاک باز اور بد معاش عورت، کنیز اور آزاد اور مسلم اور غیر مسلم عورت کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے اگر مسلمان عورت حجاب کرنے لگے تو ان کے لئے آسانی ہو جائے گی۔ ہجری سال 6 اور 7 میں مدینہ کی فوجی حالت بھی اچھی نہیں تھی اس لئے آنحضرت مدینہ کی حفاظت کے لئے بھی مضطرب تھے۔ اس موقعے پر یہ آیت نازل ہوئی اور عورت پر حجاب واجب ہوا۔ اس سے مساوات کے بنیادی اصول سے انحراف کی نشاندہی ہوتی ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوین کے توہمات سے پُرعرب معاشرہ میں اسلامی روّیہ بہت ہی زیادہ جدید اور انقلابی رویہ تھا۔ فاطمہ مرنیسی اس پر سوال کرتی ہیں۔

"پردہ جسے مسلم عورت کی شناخت کہا جاتا ہے کیا قبل از اسلام کے دور جاہلیت کی وہ ذہنیت برقرار رکھنے کی ہی کوشش نہیں ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسلام اسے ختم کرنے آیا تھا۔؟" یقیناً اس حجاب یا پردہ کا رواج آنحضرت کا تصور نہیں تھا بلکہ قبل از اسلام کا رواج تھا جسے حالات سے مجبور ہو کر رائج کیا گیا تھا۔

قرآن و حدیث کی من مانی تفسیر و تشریح اور عورت سے نفرت

مسلمان حکمرانوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے قرآن و احادیث کی مان مانی تفسیر و تشریح کرائی۔ اس قسم کی تفسیر و تشریح کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسلام سیاسی نظام کے طور پر اشرافیہ اصل سے کبھی اوپر نہیں اٹھ سکا۔ حکمرانوں نے بھی اپنے اقتدار کا دائرہ وسیع کر کے اس میں عام لوگوں کو شامل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ عورتوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی من مانی

تفسیر و تشریح کی جو پالیسی اختیار کی گئی اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث بھی منسوب کی گئیں جن میں عورتوں کے لئے اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح قرآن کی تفسیر بھی اس طرح کی گئی جس میں عورت پر اتہام طرازی کی گئی ہے اور اسے دنیا میں فتنوں کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کی ایک تفسیر میں تو عورتوں، بچوں اور پاگلوں کو ایک ہی زمرہ میں رکھا گیا ہے۔ ان تینوں کو ایک ہی خانے میں رکھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ عورت کو وراثت کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ اسے اس کا پورا حق نہ دیا جائے۔ اس طرح مردوں کو یہ موقع ملا کہ وہ بچوں اور پاگلوں کی طرح عورتوں کی جائیداد کے بھی والی بن گئے۔

ایک حدیث بار بار نقل کی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ —— "جو لوگ اپنے معاملات عورتوں کے حوالے کریں گے وہ کبھی خوش حالی نہیں پا سکیں گے۔" —— عورتوں کو عام زندگی کے معاملات سے دور رکھنے سے متعلق یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پچیس سال بعد بیان کی گئی ہے اس کے راوی ایک صحابی ابوبکرا بیان کئے جاتے ہیں۔ [ابوبکر صدیق نہیں) یہ حدیث ایک خاص موقع پر یاد آئی ہے جب خلیفۂ چہارم حضرت علی جنگ جمل میں حضرت عائشہ کو شکست دینے کے بعد بصرہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ ابوبکرا بصرہ کے معززین میں سے تھا جس نے اس خانہ جنگی میں کسی فریق کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب اسے خطرہ تھا کہ حضرت علی اس سے اس کا بدلہ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر اس حدیث کے یاد آنے کا مطلب یہی تھا کہ شکست خوردہ دشمن کی قیمت پر فاتح خلیفہ سے سیاسی رعایت حاصل کی جائے۔ لیکن اس وقتی مصلحت نے عورت کی حیثیت اور مرتبہ پر انتہائی دور رس اثرات مرتب کئے اور آئندہ کے لئے اسے ایک مثال بنا دیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ شکست کھانے والی ایک عورت تھی۔ چونکہ احادیث اسلامی قوانین کا مآخذ ہیں اس لئے ان کی صحت اور عدم صحت پرکھنے کے لئے سائنسی طریقہ کار اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ صحیح اور ضعیف حدیث کا پتہ چلایا جا سکے اس کی ایک کسوٹی تو یہ ہے کہ حدیث کا راوی ثقہ

ہونا چاہئے۔ اگر بصرہ کے صحابی ابوبکرا پر اس اصول کا اطلاق کیا جائے تو وہ اس پر پورے نہیں اترتے۔ کیونکہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے انہیں جھوٹی گواہی دینے پر قذف کی سزا دی تھی اور انہیں کوڑے لگائے گئے تھے۔ ان کے اس مشتبہ اور قابل اعتراض کردار کے باوجود بہت سے مسلمان اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں وہ عورت کو سیاسی زندگی میں فیصلہ کن اختیارات سے محروم کرنے کے لئے یہ حدیث "سند" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

عورت کے خلاف ایک اور حدیث بھی پیش کی جاتی ہے جو اس طرح ہے۔ "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نماز پڑھنے میں اگر کتا، گدھا یا عورت سامنے سے گزر جائے اور وہ نمازی اور قبیلے کے درمیان آ جائے تو نیت ٹوٹ جاتی ہے۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ قبلہ ایک رخ ہے، وہ رخ جو نماز پڑھتے وقت مسلمان کعبے کی طرف کرتے ہیں۔ اس کی دینی [نماز] اور دینوی [نظم و ضبط) اہمیت کے علاوہ ایک آفاقی اہمیت بھی ہے۔ عورت کو قبیلے سے خارج کر کے اسے زندگی کے تمام دینی پہلوؤں سے اور ان قومی امور سے خارج کیا جا رہا ہے جو عربوں اور مسلمانوں کی مرکزیت کی بنیاد ہیں۔"

بعض مسلم محدثین جیسے ابن سعد اور امام النسائی نے وہ مساوات برقرار رکھنے کی کوشش کی جو آنحضرت نے پیش کی تھی۔ لیکن جلد ہی عربوں کی روایتی عورت دشمنی پھر فقہا میں عود کر آئی۔ اس لئے بہت سی احادیث میں نسوانیت سے وہ توہماتی خوف جھانکتا دکھائی دیتا ہے، نبی کریم جس کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔

"عورت قطبین کا منفی سرا ہے جو [مثلاً] ماہواری کے دنوں میں خدائی نظام میں رخنہ ڈالتا ہے یا اس کی موجودگی اسے تباہ کرتی ہے۔"

مذکورہ بحث کی روشنی میں کسی حد تک وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں "سرکاری اسلام" ایک ایسا مذہب ہے جو پدری نظام کے قیام کا حامی ہے اور جس میں جنس کی تفریق کا تعین کر دیا گیا ہے اور مردوں کی برتری جائز قرار دے دی گئی ہے اور اسے قدرتی طریقہ بتایا گیا ہے۔ تاہم حقیقت

یہ ہے کہ اسلام کا اصل تناظر جنسوں کے درمیان مکمل مساوات پر مبنی ہے۔ لیکن مساوات کے اس نئے اصول کی اتنی سختی کے ساتھ حمایت کی گئی کہ عارضی طور پر اصل کو ترک کر دیا گیا تھا۔ پھر بھی مسلمان عورتوں کے لئے بنیادی اصول کی انقلابی روح اور انسانی عظمت اور انسانی حقوق کا احترام ایک نصب العین کے طور پر برقرار رہا' اگرچہ اس سے مرد اشرافیہ کے حقوق پر زد پڑی۔"

دوسرا اہم مسئلہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام میں شریعت کی تعریف' نوعیت اور قانون سازی کی اس حیثیت پر غور کیا جائے جس کی بنیاد پر عورتوں کے خلاف متعدد قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ شریعت قوانین کی کوئی ایک مربوط دستاویز نہیں ہے۔ اس کا ارتقا کسی ایک قانون ساز ادارے کے ذریعہ نہیں ہو' بلکہ کئی ماہرین قوانین اور فقہا نے اس میں حصہ لیا۔ آج جو اسلامی شریعت موجود ہے وہ مختلف فقہا کی آراء پر مشتمل ہے ان فقہا میں شروع سے ہی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی تشریح اور توجیہہ کہیں نہیں ملتی اور نہ اس کا ایک جیسا اطلاق کیا جاتا ہے۔ شریعت دراصل قرآن میں بیان کئے گئے اصولوں و ضوابط کو سمجھنے اور انہیں نافذ کرنے کی انسانی کوشش ہے۔ لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ شریعت اگرچہ مذہبی تقدس رکھتی ہے تاہم وہ قرآن کی طرح تغیر و تبدل ترمیم و تنسیخ سے ماورا نہیں ہے۔ پرویز صاحب نے اس شریعت کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے۔

"شریعت صاف اور سیدھے راستے کی نشان دہی کرتی ہے یہ وہ سبیل ہے جہاں انسان اور حیوان سب پانی پینے آتے ہیں بشرطیکہ اس پانی کا منبع بہتا دریا یا چشمہ ہو۔" اس لئے جیسا کہ رفعت حسن نے پرزور الفاظ میں کہا ہے "کوئی معمولی سی ستم ظریفی یا المیہ اس شریعت کو دنیا بھر کے اتنے بہت سے مسلمانوں کے لئے جامد نہیں بنا سکتا جس شریعت کے معانی میں ہی تحریک کا تصور پوشیدہ ہے۔"

قرآن کی تفسیروں' احادیث اور فقہ کی کتابوں میں اکثر و بیشتر عورت کا ذکر اہانت آمیز انداز ہی آیا ہے اور اسے دنیا میں فتنے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ مرد کی پیدائشی برتری ثابت کرنے اور عورت پر اس کے غلبے کے جواز کے لئے قرآن

کی آیات پیش کی جاتی ہیں۔ آج بھی یہی خیالات اور یہی آراء فوقیت رکھتی ہیں چنانچہ شریعت کی اصل روح سے انحراف کی سب سے بڑی سزا عورت ہی بھگت رہی ہے۔

شریعت پر بات اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک ایک ثقافتی قوت کے طور پر اسلام کے اثرات کا جائزہ نہ لیا جائے کیونکہ اپنے ظہور کے ابتدائی چند برسوں میں جس غیر معمولی تیزی کے ساتھ اسلام پھیلا اس میں اس نے ان مختلف علاقوں اور مختلف قوموں اور قبیلوں کے رسم و رواج اور ادارے اپنے اندر سمو لئے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان معاشروں، مذہبوں اور ثقافتوں کے ساتھ میل جول سے ایک نئی ثقافت ابھری جو اسلامی ثقافت کہلائی۔ اس کے نمونے مختلف مسلم ملکوں کی مختلف اور رنگا رنگ ثقافتوں میں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان کے کردوفان اور دان فو علاقوں کے کاشت کاروں کو نسبتاً خود مختاری حاصل ہے۔ سوڈانی مصنف بدری کے بقول ان علاقوں میں بعض عورتیں زمین کی مالک ہوتی ہیں اور کئی تو اپنے قبیلے کی سردار بھی ہوتی ہیں۔ بعض قبائل میں عورتیں مردوں کے برابر ہی وراثت میں حصے دار ہوتی ہیں۔ یہ قبائل مسلمان ہیں لیکن وراثت کے اسلامی قوانین پر عمل نہیں کرتے جن میں ایک مرد دو عورتوں کی برابر مانا جاتا ہے اس کے برعکس پاکستان کے بعض علاقوں میں عورت کو وراثت خاص طور سے زمین کی وراثت میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کی تشریح مختلف انداز میں کی جاتی ہے اور ہر تشریح کو اسلامی اقدار اور روایات کے مطابق کہا جاتا ہے۔ اس طرح قومی اور بین الاقوامی سطح پر قانونی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے بھی مذہب کا سہارا لیا جاتا ہے۔

عورتوں کے انسانی حقوق کے لئے امکانات، چیلنج اور حکمت عملی

اسلام میں عورت کے مقام کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح میں جو من مانی کی گئی ہے اس نے عورت دشمنی کو ایک مسلمہ اصول بنا دیا ہے۔ ان رجحانات پر مبنی جو جامد شریعت پیش کی گئی ہے اس نے

ان قوانین کو جنم دیا ہے جو عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ [جیسے حدود آرڈیننس اور قانون شہادت) اس سے عورتوں کے سامنے یہ نازک مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے کہ مساوات حاصل کرنے کے لئے کس طرح جدوجہد کی جائے؟ کیا ہمیں اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے کام کرنا چاہئے یا اس کی بجائے سیکولر فریم ورک میں کام کیا جائے؟ حقیقت پسندانہ سطح پر محسوس کیا گیا ہے کہ سیکولر فریم ورک میں رہتے ہوئے جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ وہ ہماری معاشرتی' سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہے۔ گویا وہ مسلمان عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اگر مذہب سے علیحدہ ہو کر کوئی تحریک چلائی گئی تو عورتوں کی بڑی تعداد اس میں شامل نہیں ہو گی۔ اس کے علاوہ مذہب کو اس جدوجہد میں شامل نہ کرنے سے مذہبی عقائد اور دلائل' بنیاد پرستوں کے ہاتھ میں ہتھیار بن جائیں گے۔ پھر عورتوں کے حقوق کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دین کو سیاست سے علیحدہ کرنے کے بارے میں بھی خاصی وزنی دلائل دیئے جاتے ہیں اور کافی مدلل انداز میں بتایا جاتا ہے کہ سیکولر قوانین عورت اور مرد کی عدم مساوات زیادہ بہتر طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

اسلام کے اندر رہتے ہوئے جدوجہد

بہت سے علما نے نظریاتی سطح پر اسلام کے اندر رہتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنے پر زور دیا ہے۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ اسلامی قوانین کے مآخذ قرآن اور سنت میں ایسی حرکی اور نامیاتی قوت موجود ہے جو عورتوں کے انسانی حقوق کے موافق قرآن و سنت کی تشریح کو ممکن بنا دیتی ہے۔

اسلام کا ایک دینی مآخذ اجتہاد بھی ہے۔ لیکن اجتہاد کے لئے جو شرائط مقرر کی گئی ہیں وہ اتنی سخت ہیں کہ کوئی ایک فرد اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اس میں توسیع اور ارتقا پر سخت پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی کتاب "فکر اسلامی کی تشکیل نو" میں اجتہاد کے دروازے کھولنے پر زور دیا' وہ لکھتے ہیں۔

"روشن خیال مسلمانوں کی موجودہ نسل کا یہ دعویٰ میری رائے میں جائز ہے کہ ان کے اپنے تجربات اور جدید دور کی تبدیل شدہ صورت حال میں بنیادی قانونی اصولوں کی از سر نو تشریح کی جانی چاہیئے اقبال کے نظریہ اجتہاد پر بات کرتے ہوئے حال ہی میں رفعت حسن نے لکھا ہے کہ "اجتہاد کے ذریعہ شریعت کی اس طرح تشکیل نو کی جا سکتی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان عدم مساوات کا مسئلہ حل کر لیا جائے۔"

ایک جدید ماہر عمرانیات فاطمہ مرنیسی نے ساتویں صدی سے اب تک کے اسلامی ماخذوں کا جائزہ لے کر موجودہ اسلامی معاشروں میں عورتوں کے مقام پر کافی تحقیق کی ہے انہوں نے اپنی کتاب "عورت اور اسلام" میں لکھا ہے کہ مسلم ملکوں میں عورتوں کے انسانی حقوق غصب کرنے کے لئے دینی کتابوں کی تشریح و تفسیر اپنی مرضی کے مطابق کی گئی ہے اور تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے صحیح پیغام نے جو کامل مساوات کا پیغام ہے۔ توہمات اور فاسد خیالات سے معمور ساتویں صدی کے معاشرہ پر سطحی اثر ڈالا تھا اور وہ معاشرہ دنیا اور عورت کے بارے میں اسلام کے جدید رویہ کو ہضم نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ اسلام سے قبل کی روایات اور رسم و رواج دوبارہ زندہ کر لئے گئے تھے اور اس پیغام کی توسیع کا راستہ روک دیا گیا تھا۔ مرنیسی اپنی دلیل کی بنیاد قرآن کی آیت پر رکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ پردہ اٹھا کر' جس سے ہمارے معاصر علما ہمارا حال تاریک کرنے کے لئے اپنا ماضی چھپاتے ہیں' مسلمان عورتیں اسلام میں اپنے حقوق واپس لے سکتی ہیں۔"

سوڈانی مصلح استاد محمود محمد طٰہٰ نے اس سے بھی زیادہ انقلابی رویہ اپنایا ہے وہ اپنی کتاب "اسلام کا دوسرا پیغام" میں شریعت کی تشکیل نو کے لئے بالکل ہی نیا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآن کی خاص آیتوں سے قانونی ماٰخذ منتقل کر کے بعض دوسری آیتوں کو ماٰخذ بنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں تاکہ موجودہ معاشرہ کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عورت کی کمتر حیثیت' پردہ' ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا اور عورتوں اور مردوں کو الگ الگ رکھنا اسلام کا اصل تصور

ہے یہ امتیازی اقدامات عارضی طور پر کیے گئے تھے تاکہ دور جاہلیت سے آہستہ آہستہ اسلامی دور کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ کیونکہ ساتویں صدی کا عرب معاشر اتنی زیادہ انقلابی تبدیلیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پروفیسر طٰہٰ کے بقول اسلام کی اصل روح کامل مساوات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کا اصل پیغام جو آفاقی پیغام ہے مکہ کی ابتدائی زندگی کی قرآنی آیات اور سنت میں ملتا ہے۔ بعد میں نازل ہونے والی آیات کے باوجود یہ آیات فسخ نہیں ہوئی ہیں۔ ان پر عمل درآمد اس وقت کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا جب تک انہیں قانونی شکل دینا ممکن نہ ہو جائے۔ پروفیسر طٰہٰ کو ان متنازعہ خیالات کی وجہ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے کیونکہ سوڈانی حکومت نے انہیں اسے مرتد قرار دے کر پھانسی دے دی۔ لیکن طٰہٰ نے جو طریق کار پیش کیا ہے وہ نسل، جنس اور مذہبی عقائد میں کامل اتحاد و مساوات پیدا کرنے کے لئے نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں بنیاد پرستوں اور اسلام کے اندر رہتے ہوئے جدوجہد کرنے والوں کے لے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پروفیسر طٰہٰ کے خیالات اور افکار کو ان کے شاگردوں بالخصوص پروفیسر عبداللہ النعیم نے آگے بڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طٰہٰ کے انقلابی افکار کو عملی جامہ پہنا کر اسلامی شریعت کا ایک نیا دور شروع کیا جا سکتا ہے وہ شریعت عالمی انسانی حقوق کے مطابق ہو گی۔ مثال کے طور پر روایتی شریعت عورتوں اور غیر مسلموں کو مسلمان مرد کے برابر تسلیم نہیں کرتی۔ مسلم علما معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس تفریق کا جواز پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض قابل اعتراض باتیں اجتہاد کے ذریعہ دور کی جا سکتی ہیں۔ مگر یہی علما یہ نہیں بتاتے کہ اجتہاد کی شرائط کتنی سخت ہیں کہ وہ عملاً ناممکن ہی ہو جاتا ہے۔ نعیم کا بیان ہے کہ ان واضح اور قطعی اصولوں پر اجتہاد نہیں ہو سکتا جو قرآن و سنت پر مبنی ہیں اور بعض انتہائی امتیازی ضوابط واقعی قرآن اور سنت پر مبنی ہیں اس لئے ان میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے صرف یہی طریقہ ہے کہ تھوڑی تھوڑی اصلاحات کرنے کے بجائے بالکل نئے خطوط پر اسلامی قوانین وضع کیے جائیں - تھوڑی تھوڑی اصلاحات سے عورتوں کی خلاف عدم مساوات اور تفریق دور کرنے کا اخلاقی اور سیاسی مقصد حاصل ہو سکے گا۔

غلاموں کی آزادی

ڈاکٹر نوال سعدوی

توحیدی مذاہب نے عورتوں کی حیثیت اور مقام کا تعین کرتے وقت بھی اپنے اپنے عہد کے رائج پدری یا طبقاتی معاشرہ کی متعین کردہ اقدار سے راہ نمائی اور فیض حاصل کیا۔ یہ معاشرے زمینداروں اور غلاموں کی تقسیم پر مبنی تھے اور اس ضمن میں مرد وزن میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ ان مذاہب کے پیغمبروں نے اپنے عوام کو جو مقام دیا وہ دراصل اسی نظام غلامی کی ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کا پیغام تھا۔ ان پیغمبروں کے انقلابی پیغام اور طریق کار میں فرق تھا کیونکہ وہ مختلف زمانوں' مختلف مقامات اور مختلف معاشروں میں پیدا ہوئے' تاہم ان سب میں قدر مشترک یہی تھی کہ وہ غلاموں والے نظام کی برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف تھے۔ اس بغاوت کی گہرائی اور گیرائی میں فرق تھا تاہم بنیادی طور پر یہ بغاوت ہی تھی۔

عورت کی حیثیت ان معاشروں کے رائج معاشرتی اور معاشی نظام و ضوابط کے تابع تھی اس لئے لازم تھا کہ لوگوں کے ساتھ ہونے والے ناانصافیوں کو ختم کرنے اور معاشرے کی بنیاد میں تبدیلی لانے کی کوشش کسی نہ کسی حد تک عورتوں کی حیثیت پر بھی اثر انداز ہوتی۔ یہودیت' عیسائیت اور اسلام کی لائی تبدیلیوں کے ابتدائی ادوار میں یہ عمل زیادہ ہوا' لیکن تینوں مذاہب خصوصاً یہودیت میں مرد کے مقابلے میں عورت کا مقام کم تر ہی رہا۔

عبرانی یا یہودی گھرانے میں باپ کی حکمرانی ہوتی تھی۔ رومنوں کے گھرانوں میں مرد کی سربراہی کی طرح' باپ کو لامحدود اختیارات حاصل تھے اور کوئی فرد اس کے سامنے چون چرا نہیں کر سکتا تھا۔ "فرزندان اسرائیل" کا ہر گھرانہ متعدد بیویوں اور لونڈیوں' ان کے بچوں' بیٹوں کی بیویوں' پوتوں' نواسوں اور غلاموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس گھرانے کا سربراہ باپ ہوتا تھا جسے "روشے" کہا جاتا تھا اسے اس خاندان پر مکمل قانونی اور عدالتی اختیار حاصل تھا۔ اسے اپنی

خواہش کے مطابق اپنا وارث نامزد کرنے کا بھی اختیار تھا اور اپنی بیٹیوں کو بیاہنے یا فروخت کرنے کی بھی مکمل آزادی تھی۔ اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو سب سے زیادہ بولی لگانے والے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ بچے کی زندگی اور موت اس کی مرضی کے تابع تھی اگر وہ چاہتا تو بچے کو ختم کر سکتا تھا یا خدا کے نام پر اس کی قربانی دے سکتا تھا۔ گھرانے کے سربراہ مرد کو گھرانے کے سبھی افراد کی زندگی اور موت پر مکمل اختیار تھا۔ مثلاً اگر اس کے بیٹے کی موت کے بعد اس کی بہو زنا کی مرتکب ہو تو وہ اسے زندہ جلا سکتا تھا۔

یہودی گھرانے میں پیسے جائیداد اور غلاموں کی طرح عورت بھی ورثے میں ملنے والی اشیاء کا حصہ ہوتی تھی۔ یعنی عورتیں، مرد غلام، غلام عورتیں، بیل، گدھے اور دوسری اشیاء ورثے میں منتقل ہوتی تھیں۔ خاوند عورتوں کا خدا یا آقا کہلاتا تھا، اور عورتیں اسے آقا و مالک کہہ کر پکارتی تھیں۔ بیٹے کی ولادت مسرت وانبساط کا موقع ہوتا تھا اور بیٹی کی پیدائش پر گویا صف ماتم بچھ جاتی تھی۔

ایک طرف عورتیں اتنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں اور دوسری طرف مرد آزاد تھا کہ اپنی جنسی ہوس کے لئے جتنی چاہے بیویاں اور لونڈیاں رکھے حتیٰ کہ اپنی بیٹیوں سے بھی جماع کرے۔ لوط کی دونوں بیٹیوں سے باپ نے جماع کیا دونوں حاملہ ہوئیں اور دونوں کے ہاں بیٹے ہوئے۔

فرزندان اسرائیل خصوصاً امراء اور بادشاہ متعدد ازواج رکھتے تھے۔ ڈیوڈ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں کی لمبی قطار کے علاوہ متعدد بیویوں کا شوہر بھی تھا۔ ار یحوبوم کی اٹھارہ بیویاں، ساٹھ لونڈیاں، اور ان میں سے اٹھائیس بیٹے اور ساٹھ بیٹیاں تھیں۔ ابی گاہ کی چودہ بیویاں تھیں جن میں سے بائیس بیٹے اور سولہ بیٹیاں ہوئیں۔ مگر سولومان (سلیمان) باقی سب بادشاہوں سے بازی لے گیا اس نے سات سو عورتوں سے شادی کی، تین سو لونڈیاں رکھیں، وہ بڑے بھائی کو قتل کر کے بادشاہ بنا کیونکہ باپ کے چھوڑے ہوئے حرم کی ملکیت اور تقسیم پر اس کا مقتول بڑے بھائی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔

مردوں کو لامحدود جنسی آزادی حاصل تھی جبکہ اس کے برعکس عورتوں

پر شدید پابندیاں تھیں۔ شادی سے پہلے عورت کا کنوارا ہونا شرط اول تھا' اگر عورت مرد کے سامنے اپنا کنوارا ہونا ثابت نہ کر سکے تو مرد کو یہ اختیار تھا کہ وہ فوراً اسے طلاق دے دے تاہم جب ساتویں صدی کے آخر میں بدعنوانی اور بد اخلاقی عام ہو گئی تو پھر بعض معاملات میں مرد کو طلاق دینے کا حق نہیں رہا تھا۔ اگر مرد عورت پر جھوٹا الزام لگائے کہ وہ شادی سے پہلے کنواری نہیں تھی تو اس صورت میں لڑکی کی ماں اور باپ کپڑے پر اس لڑکی کے باکرہ ہونے کی نشانی آبائے شہر کے سامنے پیش کر سکتے تھے' جس پر یہ بزرگ' خاوند کو سو روپے (چاندی کے سکے) جرمانہ کرتے جو لڑکی کے والد کو ادا کیا جاتا۔ یہ دراصل لڑکی کی نیک نامی کو دھبہ لگانے کا ہرجانہ ہوتا تھا۔ مرد کو پابند کیا جاتا تھا کہ اس لڑکی کو بطور بیوی رکھے اور وہ مرتے دم تک اسے طلاق دینے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اگر مرد شادی سے پہلے کنواری لڑکی سے جنسی تعلقات قائم کرے تو اسے لڑکی کے باپ کو پچاس روپے ادا کرنا ہوتے' لڑکی سے شادی کرنا پڑتی اور تاحیات اسے بیوی کے طور پر رکھنا پڑتا۔ اگر ایک مطلقہ عورت دوسرے مرد سے شادی کرے اور یہ دوسرا خاوند اسے طلاق دے دے یا مرجائے اور وہ بیوہ ہو جائے تو اس کے پہلے خاوند کو اس سے دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ اس عورت کو اس کے لئے ناپاک قرار دے دیا جاتا تھا۔

ان دنوں اسرائیلی اپنے غلاموں والے نظام کے بوجھ تلے پس کر واویلا کر رہے تھے' اس معاشرہ میں زمینداروں کا زمین' مویشیوں' عورتوں اور غلاموں پر مکمل قبضہ تھا۔ خاندان پر باپ کی جابرانہ حکومت قائم تھی اور پھر جوروستم کی تیسری صورت بھی یہودی مولویوں کی شکل میں سامنے آگئی تھی۔ ان مولویوں کو تو وسیع معاشرتی اثرورسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ ان ہی کے توسط سے ان کو خودمختاری بھی مل گئی اور مادی مفادات بھی۔ ان دنوں اور رسومات یا معمولات کے علاوہ ایک یہ عمل بھی تھا جسے آب شور یا کڑوا پانی کہا جاتا تھا۔ اگر کسی عورت پر مرد کو شک ہو کہ اس نے بے وفائی کی ہے اور کسی اور سے بھی جنسی تعلق قائم کر لیا ہے تو اس عورت کو پادری صاحب یا مولوی صاحب کے پاس پیش کیا جاتا اور پھر اسے

معصوم یا گناہ گار ثابت کرنے کے لئے بھیانک تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اسے پیٹ تک ننگا کر دیا جاتا' بال کھول دیے جاتے اور زیورات اتار لئے جاتے' پھر اس پر کالا کپڑا ڈال دیا جاتا جس کی تنیاں اس کی چھاتیوں سے بندھی ہوتیں اس کے بعد اسے "کڑوے پانی" کے عمل سے گذارا جاتا۔ یہ کڑوا پانی دراصل آب مقدس ہوتا جس میں عبادت گاہ کا کوڑا یا خاک ڈالی جاتی اور پادری صاحب کی لکھی اس تحریر کی سیاہی اس میں گھولی جاتی' جس میں کہا گیا ہوتا کہ اگر وہ خطا کار ہے تو پھر اسے ساری عمر کے لئے مردود کر دیا جائے۔ عورت کو یہ گندا اور بدبودار محلول پینے پر مجبور کیا جاتا۔ اس محلول کے پینے کے بعد اگر بیماری کے آثار یا علامت (پیٹ کا سوجنا' یا رانوں میں پھوڑے نکلنا) ظاہر ہو تو اسے مجرم قرار دے دیا جاتا اور زانیہ کے لئے وضع کردہ کوئی بھی سزا اسے دی جا سکتی تھی۔ مرد کے لئے کوئی سزا نہ تھی۔

انسانی ارتقا کے مختلف مراحل پر زنا کاری کے بارے میں معاشی اور معاشرتی صورت حالات کے مطابق معاشرہ کا رویہ بدلتا رہا۔ ابتدائی قبائلی عہد یا مادری معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کو برابر کی جنسی آزادی حاصل تھی۔ تاہم جب نجی جائیداد رکھنے کا آغاز ہوا تو ہوس ملکیت کو تقویت حاصل ہوئی۔ پدری نظام مستحکم ہوا اور خاوندوں نے بیویوں سے مکمل وفاداری کا تقاضا شروع کر دیا' یعنی کوئی دوسرا مرد ان کی بیوی کے پاس پھٹک تک نہیں سکتا۔ جب لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے تھے ان سے مکمل کنوارا پن اور شرم و حیا کا تقاضا ہونے لگا۔ یورپی معاشروں کے ابتدائی ایام میں زانی عورتوں سے نمٹنے کے لئے طریق کار وضع کیا جانے لگا' یہ طریقہ ان معاشروں کے جابرانہ اور آمرانہ ڈھانچوں اور مردوں کے ظالمانہ غلبہ کے زیر اثر وضع کیا گیا۔ اسرائیلیوں کے سیاہ و سفید کے مالک راہ نماؤں نے فیصلہ کیا کہ جو عورت حرام کاری کی مرتکب ہو گی اسے قتل کر دیا جائے گا یا زندہ جلا دیا جائے گا۔ جیھودا نے اپنے بیٹے کی بیوی ثمر کے ساتھ یہی سلوک کرنے کی کوشش کی کہ اسے زندگی کے آخری سانس تک سنگ زنی کر کے زخم زخم کر دیا جائے۔ کتاب سفر میں یہ حکم درج ہے جبکہ مرد اپنی توفیق اور

خواہش کے مطابق جتنی بیویوں' کنیزوں' غلام عورتوں کے ساتھ چاہے جنسی اختلاط کر سکتا تھا۔ یا زنا کر سکتا تھا مگر اس پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا تھا۔

رومنوں کے قانون' یہودیوں کے قانون سے مختلف تھے کیونکہ اس ضابطہ کے تحت ایک زانی عورت کے خاوند کو حق حاصل تھا کہ وہ اسے جان سے مار دے۔ یعنی خاوند کو بیوی کی زندگی اور موت پر مکمل اختیار حاصل تھا۔

اسلامی معاشرہ بھی اسی پدری تسلسل کا حصہ تھا' معاشرہ طبقاتی تھا جس میں نجی ملکیت کی مالک ایک اقلیت کو بالا دستی حاصل تھی' یہ اقلیت بھیڑ بکریوں اونٹوں اور گھوڑوں کی مالک تھی۔ یہ لوگ جزیرہ نما عرب کے تجارتی راستوں پر سامان تجارت لے کر آتے جاتے تھے' اکثریت غلاموں کی تھی' ان غلاموں کا رابطہ نچلے طبقے کے نیم آزاد لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسلام میں بھی مرد کو سربراہ خاندان کی حیثیت سے مکمل اختیار حاصل ہے' مرد ہی خلیفہ (حاکم اعلیٰ) امام (مذہبی راہ نما) ہادی (گورنر) یا گواہ ہو سکتا تھا۔ یعنی ان تمام عہدوں پر صرف مرد ہی متعین ہو سکتا تھا۔ اسلام نے یہودی مذہب سے زانی عورت کو سنگسار کرنے کی سزا کا طریقہ اخذ کیا۔ تاہم قرآن میں آیا کہ زنا کی مرتکب عورت اور مرد دونوں کو سنگسار کیا جائے۔ لیکن جب ایک صاحب حیثیت مرد کو متعدد بیویاں' لونڈیاں اور غلام عورتیں رکھنے کی اجازت تھی' جو اس کے ابرو کے اشارے پر اسے نہال کر دیں' تو پھر اسے خلاف قانون حرام کاری کی کیا ضرورت تھی۔ مویشیوں کے گلوں اور اونٹوں کے ریوڑوں کے مالک امیر اور بااثر افراد جب چاہتے بیویاں تبدیل کر سکتے تھے۔ کسی خوبصورت چہرے کسی اٹھتی جوانی یا خوش اندام لونڈی (غلام لڑکی) کو جو اب منڈی میں قابل فروخت مال بن چکی ہوتی' اپنے بستر کی زینت بنا سکتے تھے۔ جب ایک مرد کو یہ اختیار ہو کہ وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا جب چاہے دوسری شادی کر لے' اور ہمہ وقت چار بیویاں رکھ سکے ان کے علاوہ جتنی چاہے کنیزیں اور لونڈیاں رکھ سکے تو ایسے شخص کو زنا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ مذہبی قواعد یعنی شرع کا اطلاق اس وقت ان عورتوں پر ہوتا تھا جو پدری نظام کو چیلنج کرنے کی جرات کریں کیونکہ یہ نظام عورت کو صرف یہ حق دیتا تھا کہ

وہ ایک وقت میں ایک خاوند، بچوں اور ایک چھت کی حق دار ہے۔ اور اگر کسی عورت کو کوئی شخص نہ بیاہنا اور نہ ہی خریدنا پسند کرے تو ایسی عورت کو تادم مرگ کنوارے رہ کر زندگی گزارنا ہوتی تھی۔

مذہبی قوانین یعنی سزائیں صرف غریبوں (چند بھیڑوں کے مالک، معمولی کاریگر یا تاجر) اجیروں اور غلاموں کے لئے تھیں۔ جن کی اکثریت شادی ہی نہیں کر سکتی تھی، یا ان کے وسائل اتنے محدود ہوتے تھے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں کو بیوی نہیں بنا سکتے تھے، بڑے لوگوں کی طرح کنیزیں اور لونڈیاں نہیں رکھ سکتے تھے، بیویوں کو طلاق دینے کی ہمت نہیں رکھتے تھے لونڈیوں کو سربازار بکتے اور خریدتے دیکھتے تھے اور دل ہی دل میں حسد پالتے تھے۔

عیسائیت، اسلام اور یہودی مذہب سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں نہ صرف عورتوں کی جنسی آزادی پر بلکہ مردوں پر بھی ایسی ہی قدغنیں لگائی گئیں۔ عیسیٰ مسیح نے سب سے پہلے اس قانون کا اطلاق اپنی ذات پر کیا، انہوں نے اپنی چھوٹی سی ہنگامہ خیز اور شاندار زندگی میں جنس سے مکمل اجتناب کیا۔ یعنی جنس سے دامن بچائے رکھا۔ انہوں نے اپنی ماں کنواری مریم کی طرح شادی نہیں کی اور نئے عہد نامے کے مطابق مریم کو یہ تصور تک نہیں تھا کہ ایک مرد کی آغوش، کیا صورت ہوتی ہے۔ عیسیٰ مسیح نے یہاں تک کہا ——— "جو اگلے وقتوں کے لوگوں نے کہا اور آپ نے سنا کہ آپ زنا نہیں کریں گے۔ مگر میں تو آپ سے یہاں تک کہوں گا جس نے کسی عورت کو ہوسناک نظروں سے دیکھا۔ اپنے دل کے اندر ہی زنا کا مرتکب ہوا ہے"

طلوع عیسائیت سے قبل نئے عہد نامے کے مطابق یہودی اس قانون پر عمل پیرا تھے کہ خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ عورت کو کوئی وجہ بتائے بغیر طلاق دیدے نئے عہد نامہ کے مطابق انجیل میں اس طریق کو خدا کی مرضی کے خلاف کہا گیا ہے۔ ریا کار فرقہ فریسیا والے اس کے یہودی Pharisis پاس آئے، اسے پھانسنے کے لئے پوچھا، کیا یہ عمل قانونی ہے کہ ایک مرد اپنی عورت کو وجہ بتائے بغیر طلاق دے دے، اس نے جواب دیا۔ ان سے کہو۔ "آپ نے نہیں پڑھا

کہ جس نے انہیں بنایا تھا۔ اس نے روز اوّل سے ہی انہیں عورت اور مرد کی شکل میں بنایا تھا اور بیوی کی خاطر مرد اپنے باپ اور ماں کو چھوڑ دے گا اور وہ دونوں (جوڑا) ایک جسم (گوشت) ہوں گے؟ چنانچہ وہ جوڑا نہیں یک جسم ہیں تو خداوند جس کو جوڑ دیا ہے کوئی مرد اس کو انجوڑ نہ کرے؟"

عیسیٰ مسیح نے اس عورت کو سنگسار کرنے کی مخالفت کی جو زانیہ تھی اور ریا کاروں (فاریسیوں) کو یہ کہہ کر سزا پر عمل نہیں کرنے دیا "جس نے کوئی گناہ نہیں کیا وہ اس کو پہلا پتھر مارے۔"

عیسائیت نے بھی یہودی مذہب اور اسلام کی طرح ایک پدری تہذیب اور غلام معاشرہ کے بطن سے ہی جنم لیا۔ ان دنوں روم والوں کو بالا دستی حاصل تھی اور ان کی سلطنت فلسطین سمیت بہت دور دور علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یسوع مسیح بلا شبہ ایک انقلابی لیڈر تھا جس نے معاشرے کے غریب طبقوں اور غلاموں کی امنگوں اور آرزوؤں کی ترجمانی کی۔ اس نے رومن حاکموں سے شیروشکر امیر یہودیوں کی مخالفت کی۔ وہ رومن حاکموں کی ناانصافیوں اور ظلم و ستم کیخلاف کھڑا ہو گیا اور اپنے ترقی پسند خیالات کو عام کرنے کے لئے ڈٹ گیا۔ جن کا مطلب یہ تھا کہ معاشرہ میں ایک انقلابی تبدیلی وقوع پذیر ہو۔ برسر اقتدار رومنوں اور اپنے ہی بھائی بندوں کی بدعنوانیوں اور استحصال کے خلاف اس نے اپنے ڈھنگ سے جدوجہد کی۔ تاہم اس نے غلاموں کے نظام کے خلاف انقلابی جدوجہد پر تکیہ کرنے کی بجائے عدم تشدد کی راہ اختیار کی۔ اس نے انسانی پاکیزگی، رحم اور ترس، اور ایک مضبوط ضابطہ اخلاق کی تبلیغ کی۔ عیسائیت نے زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا اور ان لوگوں کی سرزنش اور تادیب کی جو جنس سمیت زندگی کی مادی مسرتوں میں گم ہو گئے تھے۔ مرد غلام اور ان کی عورتیں رومنوں اور یہودی فریسیوں کے جنسی تشدد کا نشانہ بنی ہوئی تھیں، رومنوں اور یہودیوں کو یہ جنسی آزادی حاصل تھی۔ عیسیٰ مسیح نے بغیر کسی رو رعایت کے نہ صرف عورتوں میں زنا کاری کی بلکہ مردوں کی زنا کاری کی روایت پر بھی حملہ کیا۔ اس طرح دراصل وہ غلاموں اور معاشرے کے ان غریب طبقوں کے جذبات

و مفادات کی ترجمانی کر رہا تھا جن کی عورتوں کو قدم قدم پر انسانی بھیڑیئے چیر پھاڑ رہے تھے۔ عیسائیت کی روحانی قدروں کے سبب تعداد ازواج ممنوع ہوئی اور ان لوگوں کا کردار مشکوک ہوا جو بار بار شادیاں کرتے۔ تاہم بعد میں جب مذہبی راہ نماؤں اور مولویوں نے زیادہ خود مختاری حاصل کی تو انہوں نے بھی کنیزیں رکھنے کی اجازت دے دی۔ عیسائیت نے مرد کی جنسی آزادی پر حدیں لگا دی تھیں اس کے باوجود مرد کے مقابلے میں عیسائی معاشرے میں بھی عورت کا مقام پست ہی رہا اور اس کے کئی حقوق سلب رہے۔ اب بھی پدری نظام کے پھریرے بلند تھے اور رومن سلطنت کے آخری دنوں میں جاگیردارانہ نظام کی طرف منتقلی کے باعث معاشرہ زیادہ ہی وحشت ناک ہوتا چلا گیا۔ یہ تبدیلی سب سے پہلے رومن سلطنت کے ان دور دراز علاقوں میں عیاں ہونے لگی جہاں رومن حاکموں کا اثر و رسوخ کم تھا اور جہاں پر غیر مہذب قبائل نے مسلسل حملے شروع کر رکھے تھے اور رومن علاقوں میں ان کے داخلے کا سلسلہ جاری تھا۔

عیسائی بلکہ کیتھولک چرچ یسوع مسیح کی اصل تعلیمات سے بڑی تیزی سے دور ہوتا چلا گیا۔ کیتھولک رومن چرچ خود یورپ میں سب سے بڑا جاگیردار یعنی زمینوں کا مالک تھا اور تمام مزروعہ زمین کا پانچواں حصہ کھیتوں اور چراگاہوں کی شکل میں اس کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ فطری بات تھی کہ پادریوں' بڑے پادریوں اور ان سے بھی بڑے پادریوں کو اپنے اور جاگیرداروں کے مفادات سانجھے کرنے پڑے اور مذہبی تعلیمات کو اس طور وضع اور استعمال کیا کہ ایک طرف جاگیردارانہ نظام مضبوط ہوا اور دوسری طرف مزارعے آقاؤں کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔

جاگیردارانہ پدری نظام اور مضبوط ہوا اور لازم تھا کہ عورتوں پر قیدوبند کی سختیاں جاری رہیں۔ ان پر جبر کا بوجھ اور بڑھ گیا ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ شیطان کی چیلیاں ہیں انہیں تمام برائیوں اور عذابوں کا منبع کہا گیا اور ہر جگہ ان پر اسی قسم کی الزام تراشی ہوتی رہی۔ مرد ان سماجی رسوم اور قوانین کے ذریعے جو گھر اور باہر استعمال ہوتے تھے۔ عورتوں پر مکمل مختار بنتے رہے اور

معمولی سی بات پر عورتوں کو قتل کرنا یا جلا دینا ان کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔
پورے یورپ میں عورتوں پر تشدد کرنا ایک معمول کی بات تھی۔
چودھویں صدی میں کیتھولک چرچ نے اعلان کیا کہ اگر کوئی عورت کسی ایسے مرض یا بیماری کا علاج کرے جس کی اسے شدھ بدھ نہیں تو اس عورت کو جادوگرنی قرار دے دیا جائے اور اس کی سزا موت ہے۔ جسم اور روح کی صحت اور صفائی خداوند خدا کا کام ہے اور صرف وہی اپنے یہ اختیارات زمین پر اپنے نمائندوں' مرد پادریوں ——— کو سونپ سکتا ہے اس لئے جادوگر عورتوں کے لئے موت کی سزا عین مناسب ہے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں پادریوں کے بخشے آب مقدس کے چار قطرے ہر مرض کا شافی علاج سمجھے جاتے تھے اور اس کا راز اور اس کے استعمال کا حق صرف انہی کو حاصل تھا۔

عوام کی رائے بنانے والے مرد مفکر اور فلاسفر بھی عورت کو نہیں بخشتے تھے' عورت ان کا بھی نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ترتولین کا ذکر آ چکا ہے جو شیطان کے ساتھ عورتوں کے تعلق پر اصرار کرتا تھا۔ تھامس اکیوناس جیسے لوگ بھی اس موقف کے حامی تھے اور یہ نقطہ نظر بہت پہلے سقراط سے شروع ہوا تھا۔ جس نے کہا تھا کہ مرد کو اعلیٰ ترین مقاصد' علوم اور فکر وخیال کی رعنائیوں کے لئے خلق کیا گیا جبکہ عورت کو صرف جنسی لذت' بنی نوع آدم کی نسل کشی اور اس کی بقا کے لئے بنایا گیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے عیسائیت شروع میں تعدد ازواج کے خلاف نہیں تھی مگر جاگیرداری نظام کے قیام کے ساتھ ساتھ جب جنگوں اور قحط نے تباہیاں مچائیں' بے تحاشا اموات ہوئیں تو خاندان کے سربراہ نے جنسی تلذذ کے علاوہ اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کے لئے زیادہ اولاد کی خواہش کی۔ اس طرح زیادہ بیویاں اور لونڈیاں رکھنے کا رواج دوبارہ ہو گیا۔ دوسروں کے علاوہ عیسائی فلاسفر سینٹ آگسٹین نے مردوں کا زوردار دفاع کیا اور کہا کہ اس طریقے (زیادہ بیویاں اور کنیزیں رکھنے کا) کا یہ مقصد نہیں کہ جنسی بھوک مٹائی جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی رضا اور اس کے حکم کی تکمیل میں نسل انسانی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ

کیا جائے کیا رب نے اسرائیل زادوں کو نہیں کہا تھا جن سے مسیح موعود اٹھے گا کہ "بڑھاؤ اور اضافہ کرو"۔۔۔۔۔

اسی طرح ایک شادی کی پابندی عملاً صرف عورتوں کے لئے ہی ایک اخلاقی ضابطہ بنی رہی تاکہ پدری نظام بھر بھرا کر ڈھے نہ جائے۔ کنوارپنے اور کنواری کو اتنی عظمت دی گئی کہ چرچ نے کنواری مریم کو بھی بلند تر مقام دے کر دو جہاں کی دیوی قرار دے دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ مرتبہ ان دیویوں کو حاصل تھا جو یہودی مذہب سے پہلے پوجی جاتی تھیں۔ کنواری مریم کے سر پر چاند اور ستارے اور اس کی گود میں مقدس بچہ رکھ دگیا گیا تھا۔ یہ تصویر دراصل اسیس اور ہورس Isis / Horus کی ایک پرانی تصویر کا تھوڑا سا تبدیل شدہ عکس یا نقل تھی۔ مریم کو دیوی کے مرتبہ تک بلند کرنے سے کنوارپنے کی صفت کو آج تک ایک خاص تقدیس کے ساتھ قائم رکھا گیا ہے۔

اسلام عیسائیت کے سات سو سال بعد اس وقت شروع ہوا جب عیسائیت ایک مستحکم اور مضبوط مذہب بن چکی تھی۔ پیغمبر اسلام محمدؐ دوسرے دو بڑے توحیدی مذاہب سے متاثر تھے۔ تجارت کے سلسلے میں انہیں ارض حجاز سے باہر جو سفر کرنے پڑے ان میں ان کی ملاقات اکثر ایسے لوگوں سے ہوئی جو توریت اور انجیل کی آیات سنایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے جو آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا تھا جس میں حرص و ہوا کی آندھی چل رہی تھی جو معاشرہ عورتوں پر بڑا جبر کرتا تھا' شہوت پرست' بت پرست' بدی اور جہالت کا مارا ہوا تھا۔ پیغمبر اسلام کی ابتدائی تعلیمات غلاموں کے نظام پر مبنی طبقاتی سماج کے خلاف تھیں۔ ان تعلیمات' کے ذریعے غریبوں اور عورتوں کے حقوق کا دفاع کیا گیا تھا۔ لیکن چند ایک قبائل کو چھوڑ کر جن میں اس وقت بھی مادری تہذیب کے اثرات موجود تھے۔ باقی تمام قبائل میں پدری نظام انتہائی مضبوط تھا۔ اس نظام کا جو تانا بانا مرد کے لامحدود غلبہ کی بقا کے لئے بنا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح مضبوط اور ناقابل شکست ہی رہا۔ قبائل میں مسلسل جنگ و جدل جس میں مرد مرتے تھے' جنگوں میں مال غنیمت کے طور پر آنے والی متعدد جنگی قیدی خواتین اور

لونڈیاں اسی طرح نئے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت کے سبب، تعداد ازواج ایک معاشرتی ضرورت بن کر ابھری۔ چنانچہ اسلام نے مردوں کی جنسی آزادی، ایک سے زیادہ شادیوں کے علاوہ لونڈیاں اور کنیزیں رکھنے کے حق پر مذہب کی مثبت مہر لگا دی۔ عملاً ایک بار پھر غلاموں کے آقاؤں، قبائلی سربراہوں اور امیر لوگوں کو ایسے حقوق و فوائد سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا کیونکہ صرف ان ہی لوگوں کے پاس اتنی عورتیں خریدنے اور رکھنے کے وسائل تھے۔

قبل از اسلام کا معاشرہ جسے بعد میں الجاہلیہ کا نام دیا گیا، غلاموں والا قبائلی ڈھانچہ تھا۔ جنگی قیدی فاتحین کی ملکیت سمجھے جاتے تھے اور ہر صاحب خانہ اپنی توفیق کے مطابق جتنے چاہے ان قیدیوں کو بطور غلام لے جا سکتا تھا۔ اسلام اس شعبہ میں کوئی تبدیلی نہیں لایا اور مرد کو اختیار دیا کہ وہ ان عورتوں سے جنسی تعلقات رکھے مگر وہ ان سے نکاح کرنے کا پابند نہیں ہے، یہ کنیزی نظام اسے مجبور نہیں کرتا کہ وہ کنیزوں کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کو اپنی اولاد تسلیم کرے تاہم اگر مرد اسے اپنی اولاد تسلیم کر لے تو پھر اس بچے کو آزاد شہری تسلیم کیا جاتا تھا وہ غلام نہیں رہتا تھا، اور عورت یعنی اس کی ماں اپنے آقا کے انتقال کے بعد آزاد ہو جاتی تھی۔

عیسائیت کے ابتدائی دور کا جوش و خروش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد وہاں بھی لونڈیاں رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ حبشہ کے بعض عیسائی گھرانوں میں آج بھی لونڈیاں رکھنا ایک عام سی بات ہے۔ تاہم مصر میں دسویں صدی کے آخر میں قانونی جسم فروشی کی یہ انتہائی قبیح صورت ختم کر دی گئی تھی (یہ فیصلہ دینے کی بنا پر 970ء میں مفتی اعظم ابراہیم کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے)

مسلمانوں کی تاریخ اور ادب ان غلام لونڈیوں اور کنیزوں کے قصوں سے بھرا پڑا ہے، جنہیں مختلف طرز کے معاشی، معاشرتی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا ان کے گھر کو کام کاج) صفائی کپڑے اور برتن دھونے، کھانا کھانے اور ایندھن لانے کے علاوہ ناچنے گانے اور آقا کی جنسی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے فرائض بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات تو مالک کمائی کے لئے ان سے

جسم فروشی بھی کروا لیتا تھا۔

ابن حبیب نے لکھا ہے کہ جاہلیہ معاشرہ (قبل از اسلام) میں یہ رسم بھی عام تھی کہ منڈی میں تمام لڑکیوں کی رانوں کی نمائش بھی ہوتی تھی اور ان کے مالک خریداروں یا گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے سفید جھنڈے لہرایا کرتے تھے ابن عباس بتاتا ہے کہ کس طرح زمانہ جاہلیہ میں وہ اپنی غلام عورتوں کو جسم فروشی پر مجبور کرتے تھے اور پھر گاہکوں سے پیسے وصول کرتے تھے۔

باپ اپنی بیٹیوں کی مرضی کے خلاف سب سے زیادہ رقم دینے والوں سے انہیں بیاہ دیا کرتے تھے۔ جب کسی عورت کا خاوند مرجاتا تھا تو مرنے والے کا بھائی یا اس کا چچا اس عورت کے پاس آکر اور یہ کہہ کر اس پر چادر ڈال دیتا تھا کہ "اس پر میرا حق فائق ہے" اس کے بعد وہ اس عورت کو اپنے ساتھ رکھنے اس کی مرضی کے خلاف سربازار اسے فروخت کرنے اسے دوبارہ شادی سے منع کرنے یا اسے اپنے خاوند کے ترکے سے محروم کرنے کا حق دار تھا۔

بعض عرب قبائل میں یہ دستور بھی تھا کہ اگر اٹھانے والے مرد میں کس بل ہو تو وہ دوسرے قبیلے کے مردوں پر غلبہ پا کر ان کی عورت کو زبردستی اٹھا لے جا سکتا تھا۔ اگر وہ ایک بار عورت ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر یہ اس کا حق بن جاتا کہ وہ اسے اپنی بیوی بن کر رہنے پر مجبور کر دے۔ زبردستی اغوا کی یہ واردات، جنگ کر کے، اچانک حملہ آور ہو کر یا سازش کے ذریعے کی جاتی تھی۔ شاعر حاتم الطائی ایک شعر میں اس طریق کا بڑے فخر سے ذکر کرتا ہے۔

"ہم ان کی بیٹیوں کو ان کی اجازت سے نہیں بیاہ کر لاتے، بلکہ انہیں تلوار کی نوک کے آگے رکھ کر لے آتے ہیں۔"

عورتوں نے اپنے اس مقدر کے خلاف بارہا جنگ کی اور یہ جانتے ہوئے بھی جدوجہد کی کہ اس جدوجہد کی سزا موت ہے۔ ان عورتوں نے ایک نعرہ بنا رکھا تھا "المانیہ ولا الدنیا" (اس ذلت سے موت اچھی) فاطمہ بنت الخورشیب کو جب جمال ابن بدر اٹھا لایا، فاطمہ محمل میں بیٹھی تھی، اس نے اپنے آپ کو سر کے بل گرا لیا اور موقع پر جاں بحق ہو گئی۔

تاریخ میں ایسی بے شمار عورتوں کی خصوصاً غلام عورتوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے بڑی بہادری سے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کی' ان کی حکم عدولی کی' اپنے آقاؤں یا قبائلی سربراہوں یا اقتدار والوں کے خلاف گانا گایا' ان عورتوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے اور اس باعث وہ دم توڑ گئیں۔ مسلمانوں کے خلاف غلام عورت سارہ نے ابو جہل کے کہنے پر گانے گائے تھے۔

جو عورتیں مردوں کے ظلم و ستم کے خلاف جرأت کا مظاہرہ کرتیں انہیں بڑی ظالمانہ سزائیں دی جاتیں' ان کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے' دانت نکال دیئے جاتے یا زبانیں گدی سے کھینچ لی جاتیں۔ موخر الذکر سزا گانے والیوں کے لئے مخصوص تھی۔ ان عورتوں پر الزام لگتا تھا کہ وہ مہندی سے اپنے ہاتھ رنگ لیتی ہیں اور بے حیائی سے اپنے حسن کی نمائش کرتی ہیں۔ طنبورہ اور دف بجاتی ہیں یوں خدا اور اس کے رسول کے حکم سے سرتابی کرتی ہیں چنانچہ ان کے ہاتھ کاٹنا اور زبانیں گدی سے کھینچنا ضروری تھا۔

بہرطور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے غلام مردوں اور عورتوں کو وہ حقوق دیئے جو انہیں اسلام سے پہلے حاصل نہیں تھے۔ اسلام نے غلاموں اور غریبوں پر ظلم و ستم کے خلاف جنگ کی۔ ناانصافیوں اور بدعنوانیوں کی مخالفت کی۔ عربوں کو شراب' نشہ اور جوا چھوڑنے کی تلقین کی اور سود خوری کی ممانعت کی۔ تاہم عورت کے مقابلے میں مرد کی غیر معمولی اہمیت کو نہیں چھیڑا۔ مرد آقا و راہبر ہی بنا رہا' شادی بھی اصولاً ایک طرح ملکیت کا حق یا معاہدہ ہوتی تھی' شوہر عورت کو جہیز کے حوالے سے دیکھتا تھا' یہ سچ ہے کہ وہ اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ عورت کا فرض تھا کہ وہ خاوند کا حکم بجا لائے۔ خاوند جب چاہے اسے طلاق دے سکتا تھا ایک وقت میں ایک سے زائد عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔

چنانچہ مسلم عرب عورت بھی مرد کی ذاتی ملکیت ہی رہی۔ بعض عرب ممالک' جن میں مصر بھی شامل ہے عورتوں پر آج بھی ابتدائی دور کے شادی کے قانون نافذ کئے جاتے ہیں جن میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ ماں اور بیوی کے طور پر عورت کی حیثیت میں بہتری کی جو بھی صورت مصر' عراق اور شام ایسے

ممالک میں پیدا ہوئی ہے وہ سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی مرہون منت ہے۔ قانون کا اس میں کوئی فیض نہیں کیونکہ قانون سازی تو اب بھی طاقتور مذہبی اور قدامت پسند عناصر ہی کرتے ہیں۔

ہمارے معروف ہم عصر ادیبوں میں سے مرحوم عباس محمود العقاد اکثر قبائلی پدری معاشرہ کے گُن گایا کرتے تھے، جس میں عورت کو مرد کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک صحرا میں رہنے والوں کی زندگی میں اپنے تحفظ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے لازم تھا کہ اپنے دشمنوں اور دوسرے لوگوں میں انہیں یہ شہرت بھی حاصل ہو کہ وہ اپنے ننگ و ناموس اور مال متاع کی حفاظت کرنا جانتے ہیں حالانکہ جائداد اور مال و متاع میں سے ، اولین جائیداد جسے بچایا جانا چاہئے وہ عورت ہے۔

مذہب کے حوالے سے عورت اور مرد کا رشتہ

ڈاکٹر رفعت حسن سے ایک مکالمہ

سوال:۔ کیا خدا نے عورت اور مرد کو مساوی پیدا کیا ہے

قرآن پاک میں عورت اور مرد میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنا دیئے زوجین [آیت 51 - 49] قرآن کی کئی اور آیتوں میں بھی تخلیق کے ضمن میں جوڑوں کی خاصیت کو واضح کیا گیا ہے [آیت 53 - 54 - 8،78 - 7،50 - 5،22 - 36] اللہ چونکہ تخلیق نہیں کیا گیا۔ اس لئے اس کا کوئی زوج نہیں ہے۔

انسانی تخلیق میں عورت اور مرد' زوج بناتے ہیں' ہر وہ چیز جو تخلیق کی گئی' وہ لازمی مذکر اور مونث اشکال میں ہے کہ تخلیق کی تعریف کے ضمن میں یہ جنسیت لازمی ہے۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے پہلے نہیں آتا۔ مطلب یہ کہ خدا کی تخلیق کہ جس میں انسان شامل ہیں۔ ان میں کسی کی اولیت یا بڑائی بحوالہ عورت' مرد کے وجود نہیں رکھتی۔

البتہ عبرانی اور عیسائی اثرات اور تاریخی وجوہات کے باعث' پرانی انجیل میں درج مسئلہ تخلیق کو بہت سے مسلمان بھی اسی طرح باور کرتے ہیں:

... خدا نے عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا۔ اس لئے عورت اصل میں مرد سے پیدا ہے۔ پس ثانوی درجہ رکھتی ہے۔

... باغ عدن سے نکالے جانے کی ذمہ دار عورت تھی' اس لئے حوا کی بیٹیاں حقارت' نفرت اور شک کی مستحق ہیں۔

... عورت چونکہ مرد سے پیدا ہے۔ اس لئے اس کا وجود بنیادی اہمیت نہیں بلکہ معاون کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان تینوں اعتقادات کو' مرد کی برتری اور فوقیت کو استحکام دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عورت کے خلاف ان تاویلات نے مسلمان کی نفسیات کو اس

طرح قابو کیا ہے کہ گزشتہ صدیوں، تمام تر ماضی و حال میں عورت کے بارے میں سوچ، عمل اور سلوک ان ہی تاویلات کے باعث ہے۔

حالانکہ یہ تاویلات، قرآن کی روح کے سراسر منافی ہیں۔ اول تو اس لئے کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہر مخلوق زوج کی شکل میں پیدا کی گئی۔ اس لئے نہ کوئی کسی سے پیدا ہے نہ پہلے آیا ہے۔ زوجین، ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ عورت، مرد کے لئے تخلیق نہیں کی گئی۔ بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے باہمی فائدہ اٹھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن میں زمین پر آدم و حوا کے بھیجنے سے متعلق حوالوں میں ہر جگہ "دونوں" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ "وہ دونوں بھول گئے" "دونوں نے کھایا" "دونوں نے توبہ کی اور انہیں معاف کر دیا گیا" [23 - 19 : 7] عورت کسی بھی حالت میں زمین پر گرا دیے جانے کی ذمہ دار نہیں ٹھہرتی ہے۔

سوال کیا عورت اور مرد کو یکساں بنایا گیا

نہیں دونوں کو یکساں نہیں بنایا گیا بدنی طور پر دونوں ایک جیسے نہیں ہیں۔ مگر اس فرق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت، مرد، دونوں کی اقداری حیثیت میں فرق ہے۔ خدا کی نظر میں مسلمان عورت اور مرد، اسلامی طرز زندگی میں برابر کے شریک ہیں۔ قرآن کی متعدد آیات میں [97: 16, 40: 40, 195: 3, 124: 4, 71: 9, 36 - 35: 33] اللہ خاص طور پر عورتوں اور مردوں دونوں کو مخاطب کرتا ہے۔ روحانی زندگی اور اسلامی جدوجہد میں برابر کے فرائض اور کردار تفویض کرتا ہے اور اس طرح ان کے اعمال کے جواب میں برابر کی سزا یا انعام کا مستحق قرار دیتا ہے۔

قرآن میں عورت مرد کا روحانی برابری کا درجہ نہ صرف متعین کیا گیا ہے بلکہ بار بار اس پر زور دیا گیا اور دہرایا گیا ہے۔ اس لئے زندگی کے عملی میدان میں بھی عورت اور مرد کی برابر کی سطح پر حقوق اور فرائض کی ادائیگی کرنی چاہیے۔

سوال اسلام میں عورت اور مرد کے کون کون سے حقوق برابر تسلیم کئے گئے ہیں

اسلام نے روحانی، سماجی، سیاسی اور معاشی سطح عورتوں اور مردوں کو

برابر کے حقوق دیئے ہیں۔ ان حقوق کا ذکر مندرجہ ذیل آیتوں اور سورتوں میں واضح طور پر درج ہے۔

زندہ رہنے کا حق 6:29-30,6:92-93 کام کرنے کا حق 9:125

کمانے کا حق 6:32 ملکیت کا حق 6:6

علم حاصل کرنے کا حق "علم حاصل کرنا ہر عورت اور مرد پہ فرض ہے۔"

عزت کا حق 69:11-13 آزادی کا حق 60:10-12 انتخاب کا حق 2:256,60:12

سوچنے کا حق 60:12 نقل و حمل کا حق 60:10 سچ بولنے کا حق 55 33:35,33:

شادی کا حق 2:32,2:34 وراثت کا حق 6:7,6:11 بچوں کا حق 2:223

ہجرت کا حق 3:195,60:10 جہاد کا حق 3:195 مسلح جدوجہد کا حق 3:195

سوال :۔ کیا عورت اور مردوں کے لئے معاشرے میں کارکردگی کے بارے میں تخصیصی ہدایات ہیں

علم الاالبدان کی رو سے بچہ پیدا کرنا' عورت کی خاصیت ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی ہدایت نہیں کہ جو خاص کر صرف مردوں کے لئے ہو۔ حتیٰ کہ رسالت بھی صرف مرد کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ رسالت کے لئے حکم ہے کہ صرف منتخب افراد ہی اس درجے پر متمکن ہو سکتے ہیں۔

البتہ کچھ مسلمانوں کا خیال ہے کہ رہنمائی کرنا صرف مرد کا حق ہے۔ یہ محض مفروضہ ہے کہ نہ قرآن اور نہ حدیث یہ کہتی ہے کہ عورت رہنما نہیں ہو سکتی ہے۔ درحقیقت قرآن تو بلقیس یعنی ملکہ سبا کی رہنمائی کا حوالہ دیتا ہے۔ [44 -27:23]

ملکہ سبا کی صلاحیتوں کو بطور اچھے رہنما کے' کسی خاص جنس کے توسط نہیں جانچا گیا تھا بلکہ یہ دیکھا گیا تھا کہ :

[الف] وہ اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔
[ب] ان کے اندر سیاسی تدبر بدرجہ اتم تھا۔
[ج] ان کا اعتقاد جامع تھا۔
[د] ان میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کی صلاحیت تھی۔

یہاں قابل عمل اصول یہ طے پایا کہ جو کسی عہدے کے لئے بہترین اہل ہو' متاثر کن رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہو' اسی کو فرض کی ادائیگی کے لئے منتخب کیا جائے۔ اگر ایک عورت قابل ہے' مذکورہ صلاحیت رکھتی ہے اور کام سرانجام دینے کے لئے بہترین ہے تو قرآن کی کوئی آیت نہیں کہ جو اسے محض جنس کی بنیاد پر ذمہ داری کی ادائیگی سے منع کرتی ہو۔

سوال :۔ اسلام میں عورت مرد کے مساوی حقوق کے سلسلے میں قرآنی آیات کی تفسیر میں کیا قباحتیں اور مسائل ہیں۔

مسلمان عورتوں پر جبر ایک بنیادی مفروضے کے باعث روا رکھا گیا ہے اور وہ یہ کہ عورت اور مرد' اسلام میں مساوی درجہ نہیں رکھتے ہیں۔ ایسے مفروضے کے اسباب درج ذیل ہیں :

1... بعض علماء قرآنی آیت کو اس کے پورے متن سے جدا کر کے پیش کرتے ہیں اور اس کو عالم گیر قانونی ضابطہ یا اخلاقی ہدایت نامہ بنا کر نافذ کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ مسلمان' قرآن کسی بھی موضوع پر جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب پڑھیں۔ کسی ایک آیت کے ٹکڑے یا حصے کو متن سے الگ کر کے' اپنے مطلب کے معانی متعین کرنے کی کوشش نہ کریں کہ قرآن بہت جامع اور مربوط صحیفہ ہے۔

2... قرآن مرحلہ وار نازل ہوا۔ لہٰذا قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ اور اللہ کے احکامات کو حتمی اور کامل نمونہ سمجھ کر قبول کرنا لازمی ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی وحی میں شراب پینے اور جوا کو منع کیا گیا [2:219, 4:43] بعد کی وحیوں میں ان برائیوں کو لائق تعزیر قرار دیا گیا اور قطعی حرام کیا گیا [5:93 - 94] لہٰذا اگر کوئی فرد آیت 2:219 کی بنیاد پر یہ کہتا ہے کہ

قرآن شراب نوشی کی اجازت دیتا ہے۔ تو ہم اس کی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ قطعی وحی آیت [5:93-9] میں ان اعمال کو حرام گردانتی ہے۔

3... قرآن نازل ہوا تھا' قرآن کے مفسرین کے الفاظ میں "وحی کے نازل ہونے کے مواقع پر کچھ روایتوں پر علما کو یہ احتمال ہے کہ یہ چند ایک وحی کسی خاص موقع کے مطابق نازل ہوئی' وہ وحی عمومی اطلاق کے لئے بھی بعینہٖ واجب ہو گی۔ مثال کے طور پر آیت 2:228 میں کسی تحریری معاملات یا سودے کی شکل میں دو گواہوں کے ہونے کی شرط لازمی ہے۔ یہ گواہ دو قابل اعتماد مرد یا ایک مرد یا دو عورتیں ہو سکتی ہیں۔ تاکہ "اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرا دے۔" اس آیت کے نزول کے وقت' خواتین عموماً تجارت کے پیشوں سے منسلک نہیں ہوتی تھیں اور اس لئے مالی معاملات کو انفرادی سطح پر طے نہیں کرتی تھیں۔ انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے" اب کچھ قدامت پرست اس زمانے کی صورت حال کو عالم گیر تصور کرتے ہوئے' آج کے زمانے میں بھی دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر متصور کر رہے ہیں۔

اسی طرح کی تفسیر "وحی کے نزول کے موقع" کی اہمیت سے انکار کرتی ہے۔ گویا ایسی تفسیر احکامات کی قدروقیمت اور واقعات کو فراموش کر دیتی ہے۔ قرآنی احکامات کو ان کے نزول کے پس منظر میں سمجھنا بہت ضروری ہے اور پھر ان احکامات کی تعمیل کے لئے اقدار اور اصولوں کو مدون کیا جانا چاہئے۔ قرآن اور قرآنی احکامات پر صرف لفظی اطلاق کے لئے زور دینا اور زمانے میں ہونے والی تبدیلیوں پہ آنکھ بند کر لینی۔ یہی آج کل کے زمانے میں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح قرآنی احکامات کے سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو جان بوجھ کر نظرانداز کرنے اور ان احکامات کو نعوذ باللہ' جامد ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس طرح عورت کی گواہی کا مرد کے مقابلے میں کم قابل اعتبار ہونے کا مسئلہ' محض اس وقت کے سماجی مسائل کے پیش نظر تھا۔ مگر آج کے بدلے ہوئے سماج میں جبکہ عورت تجارت اور مالی معاملات کی خود نگہداشت کرتی ہے' قرآنی

احکامات کی یہ تفسیر قطعی بر محل اور قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے۔ مذکورہ قرآنی احکام کا مطلب' انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔ اب جبکہ عورت تجارت میں مرد کے شانہ بشانہ شریک اور اپنے اثاثوں کی خود مالک ہے۔ ایسے سماجی ماحول میں عورت کی گواہی کسی صورت میں مرد سے کم نہیں ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی گواہی کی اس تفسیر سے انکار کرتا ہے یا اس پر معترض ہوتا ہے تو وہ قرآن کی انسانی مساوات اور انصاف کی اساس پر شک کرتا ہے۔ یہ یاد رکھا جائے کہ ایک طرف قرآن جامع اور معین تاریخی معاملات کا حل بتاتا ہے دوسری طرف ان احکامات اور معاملات کے حل کے پس منظر میں جو دانش اور غائیت پوشیدہ ہے' ان پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ان ہی عقلی استدلال کی بنیاد پر' عمومی ضوابط اور اصول مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ یہ عمومی ضوابط اور معین سماجی تاریخی واقعات' ابدی ضابطے تسلیم کئے جاتے ہیں۔

سوال اسلام کے نام پر عورت کا تابع بنانے کے لئے قرآن کی سورۃ چار کی آیت 34 کو پیش کیا جاتا ہے۔ صحیح صورت حال کیا ہے؟

اس آیت کی صدیوں پرانی تفسیر کو ہی شعوری یا غیر شعوری طور پر مرد عورت کا رشتہ متعین کرنے کی بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت 34 میں کہا گیا ہے۔

> "مرد "قوامون" ہیں عورتوں پر [کیونکہ] اللہ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے [اس سب سے) کہ انہوں نے [مردوں نے) اپنے مال خرچ کئے ہیں [عورتوں کی کفالت کے لئے) اس لئے جو عورتیں صٰلِحٰتٌ و قٰنِتٰتٌ ہیں' وہ تنہائی میں حفاظت کرتی ہیں اس کی جس کی اللہ حفاظت کرتا ہے۔ اور جو عورتیں ایسی ہوں جن سے تمہیں "نشوز" کا خوف ہو ان کی سرزنش کرو اور انہیں ان کے بستر پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر مت ڈھونڈو۔"

اس آیت کی اس طرح غلط تفسیر کی گئی ہے کہ:

1 ـــــ مردوں کو عورتوں پر بالا دستی حاصل ہے۔

2 ــــ تمام مرد عورتوں سے برتر ہیں۔
3 ــــ بیوی کو شوہر کی اطاعت کرنی چاہیئے۔
4 ــــ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو شوہر اسے پیٹ سکتا ہے۔
یہ تما تفسیر مردوں نے کی اور اپنے مطلب کی تفسیر کی۔
سوال :۔ کیا مردوں کو عورتوں پر بالادستی حاصل ہے؟

اس آیت کے شروع میں قرآن ثابت کرتا ہے کہ مرد عورتوں کا "قوامون" (ذمہ دار) ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتیں اپنے معاملات چلانے کی اہل نہیں ہیں یا جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے عورتوں کی یا عورتوں اور مردوں دونوں کی یا قوم کی لیڈر بننے کی وہ اہل نہیں ہیں۔ بلکہ اس میں ایک محدود معاشرتی تناظر میں مرد کو عورت کی حفاظت اور کفالت کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ طبعی طور پر مسلمانوں کی آئندہ نسلیں صرف عورت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ عورتوں کے اس طبعی وظیفہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے مردوں کو یہ ذمہ داری سونپ کر قرآن دراصل معاشرہ میں توازن پیدا کرتا ہے۔ یہ آیت مردوں کی پیدائشی برتری اور بالادستی قائم نہیں کرتی بلکہ وہ عورتوں اور مردوں کے درمیان "عملی رشتہ" کا تعین کرتی ہے جو معاشرتی نظام میں باہمی ذمہ داریوں کی ایک آئیڈیل شکل ہے۔

قرآن میں ذمہ داری اور استحقاق باہم مربوط ہیں جسے زیادہ استحقاق اور مراعات حاصل ہیں اس کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ اسی طرح جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اس کا استحقاق بھی زیادہ ہے۔ قرآن میں مردوں کو جو مالی ذمہ داریاں دی گئیں ہیں یعنی یہ کہ وہ عورت کی کفالت کے لئے خرچ کریں تو انہیں اس کا فائدہ بھی دیا گیا ہے یعنی وراثت میں انہیں زیادہ حصہ ملتا ہے۔

2۔ کیا تمام مرد تمام عورتوں سے برتر ہیں؟

قرآن یہ نہیں کہتا کہ تمام مرد تمام عورتوں سے برتر ہیں یا بہتر ہیں۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ اللہ کے نزدیک مرد عورت پر فوقیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں استحقاق کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔ مردوں کو مالی طور پر چند استحقاق ہیں جس کی بنا

پر اس پر بعض ذمہ داریاں بھی ڈالی گئی ہیں یا یوں کہئے کہ ان ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی استحقاق حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ بعضوں کو [متعین نہیں ہیں) بعضوں پر اللہ نے فضیلت دی ہے۔ یہاں عمومی زبان اختیار کی گئی ہے جس کا تعلق براہ راست تخلیق کی حقیقت سے ہے۔ بعض جاندار واقعی دوسرے جانداروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس طرح بعض انسان دوسرے انسانوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ تمام مرد تمام عورتوں پر فوقیت رکھتے ہوں یا تمام عورتیں تمام مردوں پر فوقیت رکھتی ہوں۔

استحقاق اور ذمہ داریوں کے باہمی تعلق پر بات کرتے ہوئے تخلیق کی اس آفاقی ترتیب کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ بعض کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے تو ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ مردوں کو مالی فضیلت حاصل ہے تو انہیں عورتوں کی حفاظت اور کفالت کے لئے خرچ کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے۔

اس آیت کو ان دو وجوہ کی بنا پر درج بالا حقائق تک محدود کرنے کی ضرورت ہے کہ:

[الف] اس کے بعد ہی اس معیار کو سمجھا جا سکے گا جو قرآن نے بنی نوع انسان کی قدر و منزلت کا تعین کرنے کے لئے مقرر کیا ہے۔

[ب] اللہ کے نزدیک آپ میں سے وہ شخص افضل ہے جو متقی ہے [13-49]

من مانی تفریق سے دونوں جنسوں کے درمیان عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے [پیدا ہو گیا ہے) یہ دونوں وجوہ مرد کی روحانی نشوونما پر منفی اثرات مرتب کر سکتی تھیں۔ اگر غلطی سے انہیں یہ یقین دلا دیا جاتا کہ مرد ازلی طور پر عورتوں سے برتر ہیں تو وہ تقویٰ کی اس معراج کو پہنچنے کی کبھی کوشش نہ کرتے جو اللہ کی نظر میں فضیلت کا درجہ رکھتی ہے۔

سوال:۔ کیا عورت کو مرد کی اطاعت ضرور کرنی چاہیئے؟

ہمیں اس مفروضہ کا بغور جائزہ لینا چاہیئے کہ عورت کو ضرور مرد کی

اطاعت کرنی چاہئے۔ قرآن کہتا ہے کہ صالح عورتیں "قٰنِتٰتٌ" ہیں یعنی وہ "قنوت" رکھتی ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ صالح مردوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے [35 - 33 : 17 - 30] غیر انسان کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے [117 - 2 - 9 : 39] قٰنِتٰتٌ سے مراد ایک انسان کی طرف سے دوسرے انسان کی اطاعت نہیں ہے خواہ وہ کسی بھی جنس سے تعلق رکھتا ہو۔ اس سے مراد اللہ کے نزدیک عاجزی و انکساری کی روح ہے۔

اس آیت میں جہاں کہا گیا ہے کہ "اگر وہ تمہاری اطاعت کریں" تو اس میں لفظ "طع" استعمال کیا گیا ہے جس کے اصل معنی حکم کی بجا آوری ہے۔ یہ حکم ایک انسان کی طرف سے دوسرے انسان کے لئے ہے [محض عورت کے لئے حکم کی بجا آواری نہیں ہے۔ بلکہ مرد کے لئے بھی ہے کہ وہ حکم بجا لائیں [59 - 4] میں کہا گیا ہے کہ اگر عورت اطاعت کرتی ہے تو مرد کے اوپر لازم ہے کہ اس پر بہانہ نہ ڈھونڈے۔ یہاں بھی اصرار مرد کی ذمہ داری پر ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کریں بالخصوص اس وقت جب وہ [عورتیں] ان کی باتوں پر عمل کر رہی ہیں۔

سوال:۔ اگر عورت اطاعت نہ کرے تو کیا مرد کو اسے مارنے کا حق ہے؟

قرآن میں نشوز کی بحث صرف اس آیت میں ہی کی گئی ہے۔ اسے عورت اور مرد دونوں کے لئے [34 - 4] اور مرد کے لئے [128 - 4] بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے نشوز کے معنی "عورت کی طرف سے شوہر کی نافرمانی" نہیں ہے یہ استنباطی معنی ہیں۔ سید قطب کے مطابق اس کا مطلب شادی شدہ زندگی کے توازن و ہم آہنگی کا خاتمہ ہے۔ اس صورت میں قرآن ہم آہنگی بحال کرنے کا طریقہ بتاتا ہے ہمیں ان تمام طریقوں پر غور کرنا چاہئے جو اس آیت میں اور 128 - 4 میں بتائے گئے ہیں۔ ان میں بات چیت' مہلت دینا اور مارنا تینوں طریقے شامل ہیں۔

شادی میں توازن و ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے قرآن میں جس طریقے کو ترجیح دی گئی ہے وہ طریقہ وہی ہے جو لوگوں کے تمام گروہوں کے

درمیان معاملات طے کرنے کے لئے بتایا گیا ہے یعنی بات چیت اور مشاورت۔ یہ بات چیت دو افراد [یا دو گروہوں) کے درمیان [34 - 4] ہو سکتی ہے یا ثالث کی موجودگی میں دونوں فریقوں کے درمیان ہو سکتی ہے۔ [128 - 4]

اگر بات چیت سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوں [شادی میں توازن و ہم آہنگی پیدا نہ ہو) تو دوسرا راستہ مہلت دینے کا بتایا گیا ہے۔ مہلت دینے کی اصطلاح کھیلوں اور نفسیات میں اس مقصد کے لئے استعمال کی جاتی ہے کہ دو افراد [یا دو گروہوں) کے درمیان زمانی یا مکانی جدائی یا فاصلہ پیدا کر دیا جائے۔ یہ محض فوری طور پر غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یا پھر اس کا سلسلہ طویل ہو جائے جو آخر کار طلاق پر منتج ہو سکتا ہے۔

اگر یہ دونوں راستے اپنی ترتیب کے مطابق پوری طرح اختیار کئے جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد تیسرے طریقہ اختیار کرنے کی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔ تاہم چونکہ قرآن میں "مارنے" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسے نفسیاتی اور تاریخی تناظر میں رکھ کر بھی دیکھا جائے۔ غصے اور طیش کی حالت میں عام طور سے [جسے قرآن "اگر خوف ہو" سے ظاہر کرتا ہے) مرد عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر ہاتھ اٹھاتی ہیں چنانچہ قرآن میں ترتیب وار جو تین طریقے بتائے گئے ہیں اس کا مقصد یہی ہے کہ غصے میں ہاتھ اٹھانے اور مارنے سے روکا جائے۔ مار پیٹ کی نوبت عام طور پر اس وقت آتی ہے جب پہلا اور دوسرا طریقہ پوری طرح استعمال کر لیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے گھریلو مار پیٹ ہوتی ہے۔ قرآن واضح طور پر اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو اسلام سے قبل عوتوں کے حقوق غصب کئے جاتے تھے اور ان پر بے تحاشہ تشدد کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ بچیوں کو مار دیا جاتا تھا۔ قرآن میں اس کے لئے "ضرب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے (جس کا مطلب عربی زبان میں "ایک" چوٹ مارنا ہے) اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مار پیٹ کو روکنا چاہتا ہے۔ وہ مارنے کی کوئی تجویز پیش نہیں کر رہا ہے۔ گویا اس نے ایک حد مقرر کر دی ہے۔

سوال:۔ قرآن کی اور کون کون سی آیات ہیں جو عورت مرد کے تعلقات میں معیار اور باہم رفاقت کے بارے میں بحث کرتی ہیں؟

سورۃ النسا کا نزول ایام مدینہ میں اس وقت ہوا تھا جب عورتوں پر مردوں کا ظلم و ستم عام تھا۔ بعد کی آیات میں مردوں کے عورتوں پر "قوامون" ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ مدینہ میں اسلامی معاشرہ ایک آئیڈیل مملکت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس لئے خدا نے عورتوں اور مردوں کو برابری اور باہم رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ تلقین اور اصرار کئی ایسی آیات میں بھی ملتا ہے جنہیں علماء مرد و عورت کے رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فراموش کر جاتے ہیں۔

قرآن نے دوسری سورۃ کی آیت 187 میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مرد اور عورت ایک دوسرے کی مدد' ایک دوسرے کی آرام و آسائش اور ایک دوسرے کی حفاظت کے لئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح باہم منسلک ہیں جیسے لباس جسم کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے۔"

قرآن کی سورۃ 3 - آیت 195 میں کہا گیا ہے "تم خواہ مرد ہو یا عورت آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو۔ اس آیت میں ہجرت' جہاد اور دوسری اسلامی جدوجہد میں مرد و عورت کے برابر حصہ لینے کا ذکر کیا گیا ہے حتیٰ کہ اس اجر میں بھی برابر کی حصہ داری رکھی گئی ہے جو اس کے صلے میں ملے گا۔

سورۃ 9 کی آیت 71 جو عورت مرد کے رشتے سے متعلق آخری آیت ہے اس میں قرآن نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا "اولیا" قرار دیا ہے یعنی وہ ایک دوسرے کے دوست اور کفیل ہیں۔ اس میں عورت اور مرد کے فرائض کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ وہ نیک کاموں پر عمل کریں اور برے کاموں سے پرہیز کریں نماز پڑھیں زکواۃ دیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ اب قرآن عورتوں کے لئے مردوں کے "قوامون" ہونے کا ذکر نہیں کرتا۔

یہ آیت آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری دور میں آٹھ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ اس آیت میں مرد عورت کے رشتے میں ایک دوسرے کا دوست اور

محافظ ہونے سے متعلق اسلامی طرز حیات کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ قرآن عورت اور مرد کے درمیان برابری اور باہم رفاقت کی جو تعلیم دیتا ہے اس آیت میں اس کی روح پیش کر دی گئی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی آفاقی سچائی اور علم و دانش ہمارے روز مرہ کے معاملات میں ہی رہنمائی نہیں کرتی بلکہ اس کے مقدس پیغام کو غلط سمجھنے سے جو گمراہی پیدا ہوتی ہے اسے دور کرنے میں بھی وہ برابر ہماری مدد کرتی رہتی ہے۔ عورت اور مرد کے رشتے کے سلسلے میں جو مسائل پیدا ہو گئے ہیں انہیں دور کرنے کے لئے قرآن کے اس مقدس پیغام کو پوری طرح سمجھنا اور اس کی اصل روح تک پہنچنا ضروری ہے۔ قرآن کے مطابق عورت اور مرد میں اتنی قربت پیدا ہونا چاہئے کہ "میاں بیوی میں محبت اور رحمت" پیدا ہو جائے [30-21]

عسکری اصطلاحات اور جنسیات

کیرل کوہن

جنگی منصوبہ بندی کرنے والے عسکری دانشوروں کی دنیا ایک ہولناک اور لرزہ خیز دنیا ہے۔ اس دنیا میں یہ دانشور آپ کو نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سنجیدگی سے سر جوڑے ایٹمی ہتھیاروں' ایٹمی حکمت عملی اور ایٹمی جنگ کے بارے میں گفتگو کرتے ملیں گے۔ اس گفتگو میں ٹھوس دلائل پیش کیئے جا رہے ہوں گے' باریک سے باریک نکتے اٹھائے جا رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہوگی اور ان کے دل میں کہیں بھی کسی خوف' دہشت یا تکلیف و تشویش کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

لیکن ان کی گفتگو سے یہ کہ اندازہ لگانا بالکل صحیح نہیں ہوگا کہ وہ بے رحم اور سنگدل لوگ ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ لوگ اپنے سینے میں دل رکھتے ہیں وہ بڑی پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے اندر حس مزاح پر موجود ہے۔ وہ ذہین ہیں' دانشمند ہیں اور نہایت بااخلاق اور نفیس انسان ہیں۔ مجھے وہ پسند ہیں۔ میں ان میں سے بہت سے لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ چونکہ میں انہیں پسند کرتی ہوں اس لئے میرے اوپر یہ جاننے کا بھوت سوار ہوگیا کہ آخر وہ کونسی چیز ہے جو انہیں ایسے تخریبی کاموں میں دلچسپی ظاہر کرتی ہے۔ یہ وہ عینک ہے جس کے ذریعہ میں نے ان کی دنیا میں اپنے تجربات کا جائزہ لیا۔

ابتدائی مرحلے میں مجھے اس زبان نے بہت محسور کیا جس میں وہ ایٹمی جنگ کی باتیں کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تجریدی اصطلاحات اور میٹھے محاوروں میں ان کی گفتگو تھی جس میں یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا جاتا کہ اس نرم و نازک اور شیریں گفتگو کے پیچھے ایٹمی جنگ کی قیامت خیزیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سب باغوں بہاروں اور پھولوں پیڑوں کی باتیں کر رہے ہیں۔

جو لوگ ہیرو شیما میں ایٹم بم سے جھلسے ہوئے لوگوں اور انسانوں کے جسم میں چبھی ہوئی شیشے کی کرچیاں اور ان کی تصویریں دیکھ چکے ہیں وہ لوگ یقیناً "پاکیزہ بم" کی اصطلاح پر یقین نہیں کریں گے۔ وہ اس بات کا اعتبار بھی نہیں کریں گے کہ ایسے بم بھی بنائے جاسکتے ہیں جن سے زیادہ تابکاری پیدا نہ ہو۔ "پاکیزہ بم" کا استعارہ' دفاعی تجزیہ نگاروں یا اسلحہ کنٹرول کرنے والوں کے کام تو آسکتا ہے ہمارے کام نہیں آسکتا۔ یہ زبان اپنے اندر زبردست تخریبی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے پیچھے انسانی قتل عام' دور دور تک بکھرے انسانی اعضا' چیختے چلاتے زخمی انسان اور ناقابل بیان اذیتوں کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ عسکری دانشور شہروں کے شہر تہس نہس کرنے کو "دفاعی اقدار کا نشانہ" کہتے ہیں۔ ایٹمی اصطلاح میں انسانی اموات کو "متوازی تباہی" کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے ایک دفاعی ماہر نے فرمایا۔ "ہم انسانوں کو نشانہ نہیں بناتے صرف شہروں کو نشانہ بناتے ہیں۔"

پاکیزہ بم والے بعض فقرے تو بالکل ہی الٹ معانی رکھتے ہیں۔ ایم ایکس میزائل' چار وار ہیڈ اٹھا سکتی ہے اور ہر وار ہیڈ کی طاقت 300 سے 475 ٹن تک ہوتی ہے۔ اس طرح ہر میزائل' ہیرو شیما پر پھینکے جانے والے ایٹم بم سے 240 سے 400 گنا تک زیادہ تباہ کن ہوتی ہے۔ رونلڈ ریگن نے اس میزائل کو "امن کی محافظ" کا نام دیا تھا۔ دفاعی حلقوں میں اس نام کا تو مذاق اڑایا گیا تھا لیکن ایک ماہر نے اسے "تباہی کم کرنے والا ہتھیار" قرار دیا تھا۔

ان فقروں نے فنی اصطلاحوں میں استعمال کی جانے والی زبان کی شکل بھی بگاڑ دی ہے۔ انہوں نے تصور اور حقیقت کے درمیان زبردست فرق پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ ایٹمی ہتھیاروں نے ہمارے ادراک کا حلیہ بھی بگاڑ دیا ہے۔ اب ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ کوئی "پاکیزہ بم" بھی ہوتا ہے اور صرف ریڈیو ایکٹو ہی ایسی گندی چیز ہے جو انسانوں کو مارتی ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ صرف "پاکیزہ بم" ہی نہیں ہوتا ایسے ہتھیار بھی ہوتے ہیں جو صرف دشمن کے ٹھکانوں اور اس کے ہتھیاروں کو تباہ کرتے ہیں۔ انسانوں سے کچھ نہیں کہتے۔ یہ بات اس وقت مضحکہ خیز بن جاتی ہے جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ایٹم بم یا ایٹمی ہتھیار ڈاکٹر کا نشتر نہیں ہوتے جو نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جاتا

ہے بلکہ ایسے ہتھیار ہوتے ہیں جن میں نشانے کی غلطی کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ (عراق کی جنگ میں اس کا بار بار ثبوت ملا ہے۔ امریکہ کے بہت سے میزائل غلط نشانوں پر گرے تھے) بلکہ ہم تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ڈاکٹر کے نشتر سے بھی خون نکلتا ہے۔

تحریک نسواں کی حامیوں نے اکثر یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اسلحہ کی دوڑ کا ایک اہم پہلو "لنگ پوجا" یا Phallic Worship ہے اور ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں "میزائل سے حسد" کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیادہ تر ایک الزامی جواب ہی ہے۔ میں اس سے اور بھی زیادہ معانی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور یہی تلاش مجھے عسکری دانشوروں کی دنیا میں لے گئی تھی۔ میری سادگی یہ تھی کہ میں نے اپنے آپ کو تحریک نسواں کا ایسا سراغ رساں سمجھ لیا تھا جو اس موت کے گھر میں دیوار کے ساتھ کان لگا کر یہ کن سوئیاں لینے آئی تھی کہ یہ لوگ اپنی گفتگو اور اپنی اصطلاحوں میں "جنسی پیکر" کتنے اور کیسے استعمال کرتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ لوگ کم سے کم دوسروں کے سامنے تحریک نسواں کی آرا کا احترام ضرور کرتے ہوں گے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سنجیدہ لوگ "دخول کی سہولت" (Penetration Aid) کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کسی وقت گھبرا کر اوپر بھی ضرور دیکھتے ہوں گے اور سوچتے ہوں گے کہ تحریک نسواں کے رہنماؤں کی اس حیرت کی وہ تصدیق کر رہے ہیں کہ "اندر کیا ہو رہا ہے؟"

ظاہر ہے میں غلطی پر تھی۔ اس دنیا میں تو تحریک نسواں کی رائے کا گزر ہی نہیں ہے۔ ان کے دماغ تو دور کی بات ہیں ان کے کانوں تک بھی ہماری بات نہیں پہنچتی ہے۔ امریکہ میں ایٹمی ہتھیاروں پر اخراجات کی توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ آپ کم پیسے میں زیادہ دھماکے کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس طرح بات کرتے ہیں کہ ایم ایکس میزائل نئی مائنیوٹ مین میزائل کے گودام میں اس لئے رکھی جا رہی ہیں کہ اس طرح انہیں "گندے سوراخ" میں رکھنے کے بجائے "بہترین سوراخ" میں رکھا جا رہا ہے۔ ایک اور صاحب نے تقریر کرتے ہوئے "افقی طور پر کھڑا کرنے والے لانچر" اور "تشنجی کیفیت والے حملے" اور طویل حملے کی باتیں کیں۔ اسی طرح دوسرے ماہرین بھی خالص جنسی اصطلاحوں میں ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں اس پروگرام میں واحد عورت تھی جو ان اصطلاحوں پر

چونکتی تھی باقی کسی کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔

جنگی اصطلاحوں میں جنسی پیکر کیوں استعمال کئے جاتے ہیں؟ اسے سمجھنے کے لئے پورے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ جنسی پیکروں کا استعمال ایٹمی ہتھیاروں کے وجود میں آنے سے پہلے بلکہ طبیعات کے ماہرین کے ان انکشافات سے پہلے ہی ہوا کرتا تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی تاریخ تو جنسی پیکروں کے استعمال سے بھری پڑی ہے۔ اس میں مردانہ جنسی الفاظ بے تحاشہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور اسلحہ ساز ادارے تو مردانہ عضو کی علامت کو برابر استعمال کر رہے ہیں۔ دفاعی امداد پر جو کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں ان میں تصویریں اور پیکر بہت ہی واضح انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ امریکی فضائیہ کے رسالے میں ایک اشتہار ایسا شائع ہوا جسے مشہور جنسی رسالے "پلے بوائے" کا اشتہار ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں سب سے اوپر جلی حروف میں چھپا تھا۔ SPEAK SOFTLY AND CARRY A BIG STICK یہ اے وی-ایس بھی ہیریئر 2 کا اشتہار تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ "اس سے فوری اور خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔" پھر خیال کرکے کہ شاید اس سے بھی بات واضح نہ ہوئی ہو آخر میں وضاحت کی گئی ہے۔" بالکل ویسا ہی اسٹک (ڈنڈا) جیسا 1901ء میں ٹیڈی روز ویلٹ کے ذہن میں تھا۔"

اور BKEP (BLU-106/B) کا اشتہار یہ ہے۔

The only way to solve some problems is to dig deep the Bomb, Rinetic energy penetrator.

جنگی اور دفاعی زبان میں جنسی اشارے استعمال کرنے والے تنہا ہم ہی نہیں ہیں۔ فرانس نے جنوبی بحرالکاہل کے علاقوں میں جو ایٹمی دھماکے کئے ان سے پیدا ہونے والے تمام گڑھوں کے نام عورتوں کے اعضاء کے نام پر ہی رکھے گئے اور فرانسیسی خواتین نے اس کا نوٹس بھی لیا۔ ادھر ایٹمی دھماکے میں بھی مردانہ عضو کی ایمجری تلاش کی گئی ہے اخباری رپورٹر ولیم لارنس نے، جسے ناگا ساکی پر ایٹمی دھماکے کا نظارہ کرنے ساتھ لے جایا گیا تھا، بعد میں لکھا۔ "اس وقت جب ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے اور صورتحال نے دائمی شکل اختیار کرلی ہے تو اچانک دیوہیکل مشروم کی چوٹی پر دھماکے شروع ہوئے اور دھویں کا وہ ستون 45000 فٹ کی بلندی تک اٹھتا چلا گیا۔

مشروم کی چوٹی ستون سے زیادہ متحرک تھی' اس پر سفید دودھیا جھاگ ابل رہے تھے' بل کھا رہے تھے۔ اوپر اٹھ رہے تھے اور پھر زمین کی طرف آرہے تھے اور ہزاروں کھولتے چشمے یکجا ہو رہے تھے میں اس جانور کی طرح غصے میں کھول رہا تھا جو اپنے بندھن توڑ کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔"

عسکری دانشوروں کی دنیا میں جس قسم کا ماحول ہوتا ہے اس میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ جنسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ان کے نیت پر شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میرے نزدیک اس امیجری کی نفسیاتی اہمیت سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات اہم ہے کہ یہ دانشور اپنے ہولناک کاموں میں اس زبان سے کیسے مدد لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی دلچسپ کہانیاں ہیں۔

سمر پروگرام کے دوران ہم نیولندن میں بحریہ کے اڈہ پر گئے جہاں ایٹمی آبدوز کھڑی تھی پھر ہم جنرل ڈائنمک الیکٹرک بوٹ کے ڈاک یارڈ پر گئے جہاں ٹرائیڈنٹ آبدوز بنائی جا رہی تھی۔ اس دورے میں ہم ایٹمی آبدوز کے اندر چلے گئے۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں میزائل نصب تھے تو ہمارے ساتھ موجود افسر نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور بولا۔ "میزائل کے اندر ہاتھ ڈال کر ذرا اسے سہلایئے اسے تھپ تھپایئے۔"

اس امیجری سے ہمیں بعد میں بھی سابقہ پڑا۔ ایک ماہر نے لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے مغربی یورپ میں کروز اور پرشنگ میزائل اس لئے نصب کی ہیں کہ ہمارے اتحادی ان پر "ہاتھ پھیر" سکیں۔ انہیں سہلا سکیں۔ اسی طرح ہم نارتھ امیریکن ایرو اسپیس ڈیفنس کمانڈ کے دورے پر گئے تو پتہ چلا کہ وہاں B-1 طیارہ کی مشق کی جا رہی ہے۔ ہمارے ساتھ جو لوگ تھے وہ جھانک جھانک کر اس کی پرواز دیکھتے رہے۔ جب ہم وہاں سے واپس آئے تو ایک افسر نے جو ہمارے ساتھ نہیں گیا تھا بڑے افسوس کے ساتھ کہا "آپ لوگوں نے B-1 طیارے پر ہاتھ ضرور پھیرا ہوگا۔"

"ہاتھ پھیرنا اور سہلانا" خالص جنسی اشارے ہیں۔ ان سے یہ مرد اپنی برتری اور اپنی بے تکلفی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ میزائل کو سہلانے کا کہہ کر انہیں جو خوشی حاصل ہوتی ہے اس کا تصور اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ تاہم سہلانے یا تھپکی دینے سے صرف جنسی اشارہ ہی مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ بچے کو بھی تھپکی دی جاتی ہے اور پالتو جانور

کو بھی سہلایا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان اس چیز کو تھپکی دیتا ہے جو اس سے چھوٹی ہوتی ہے اور بے ضرر ہوتی ہے۔ کسی خطرناک اور تباہ کن چیز کو تھپکی نہیں دی جاتی۔ آپ اسے تھپکی دیجئے اور اس کی تباہ کن طاقت ختم ہو جائے گی۔

یہ امیجری دراصل مرد کی جنسی طاقت اور ہتھیاروں کے درمیان ایک قسم کا مقابلہ بھی ہے اور مفاہمت بھی تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہولناک ہتھیاروں کی وجہ سے جو سنگین ماحول پیدا ہو جاتا ہے اسے کم کرنے کے لئے بھی یہ پیکر استعمال کئے جاتے ہیں۔ گویا بظاہر اسے لڑکوں کا کھیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کے خطرناک اثرات کی طرف سے توجہ ہٹی رہے۔

کنواری عورت:

ایٹمی ہتھیاروں پر بات کرتے ہوئے کنوار پن کا بھی بار بار ذکر آتا ہے۔ سمر پروگرام میں ایک پروفیسر نے کہا کہ ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کرکے اپنا "کنوار پن" کھو دیا۔ اس موقع پر امریکہ کے ردعمل کا سوال آیا تو اس زبان میں ردعمل ظاہر کیا گیا کہ کیا اسے (ہندوستان کو) گھر سے نکال باہر کیا جائے؟" یہ اشارہ کا پیچیدہ استعمال تھا۔ گویا ایٹمی دوڑ میں داخل ہونے کا مطلب تھا اپنی دوشیزگی کھو دینا' اپنی بے حرمتی کروا لینا۔ اپنی معصومیت ختم کر دینا۔ اگرچہ اس میدان میں امریکہ بھی کنوارا نہیں تھا اور اپنی اس حیثیت پر مغرور بھی تھا لیکن یہاں اس کا دوسرا معیار اس طرح ظاہر ہوا کہ دوسرے ملک کا کنوار پن لٹ جانے پر اسے اعتراض ہوا اور اس نے یہ سوال پیدا کیا کہ "کیا کوئی عورت اپنی عصمت لٹانے کے بعد مرد کے کام کی رہتی ہے؟"

نیوزی لینڈ کے ساحل پر ایٹمی توانائی سے چلنے والے جہازوں کے لنگر انداز ہونے کا سوال آیا تو وہاں بھی یہی کنوار پن کا سوال پیدا ہوا۔ امریکی فضائیہ کے ایک ریٹائرڈ جنرل روس نے ایئر فورس میگزین میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔ "ایٹمی دوشیزگی" اس میں اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے کسی لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ہو۔ نیوزی لینڈ کے اس احتجاج پر وہ ناراض تھے کہ نیوزی لینڈ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک صاف اور معصوم رہنا چاہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا موقف اخلاقی طور پر بہت ہی مضحکہ چیز ہے۔ انہوں نے نہایت ہتک انگیز انداز میں لکھا کہ جس عورت کی ہم نے قیمت ادا کر دی ہے اسے

بھلا احتجاج کا کیا حق ہے؟ ان کی زبان ایسی تھی کہ اچھا ہم اپنا تمام سامان اور اپنی تمام خدمات اٹھا کر لے جاتے ہیں پھر دیکھتے ہیں۔ وہ کیسے اپنی دوشیزگی بچا کر رکھے گی۔ اس سے زیادہ مردانہ رعونت کا اظہار اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کی مردانگی کا ثبوت ہمیں ایک اور جگہ بھی ملا۔ اس سمر پروگرام کی دوران ایک پروفیسر "تادیبی حکمت عملی" پر تقریر کر رہے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک مثال دی کہ ان کا بیٹا جس کی عمر سترہ سال ہے ٹی وی بہت دیکھتا ہے۔ انہیں اس کی یہ عادت پسند نہیں ہے۔ ایک دن انہوں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے یہ عادت نہ چھوڑی تو وہ اس کا بازو توڑ دیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ خطرہ روکنے کا یہ ہی ایک طریقہ ہے۔ اس مثال میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بظاہر یہ دھمکی کوئی انہونی سی بات نہیں معلوم ہوتی۔ دو ملک ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے حملے سے بچنے کے لئے اپنی حفاظت کی غرض سے ایٹمی ہتھیار تیار کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ جو ملک زیادہ طاقتور ہوگا وہ دوسرے ملک سے اپنی حفاظت نہیں کرے گا بلکہ اسے مجبور کرے گا۔ اس پر دباؤ ڈالے گا۔

ان مباحث میں امریکہ کا رویہ ایک باپ کا سا ہوتا ہے جو کبھی تو دباؤ ڈالتا ہے' کبھی پیار سے بات کرتا ہے مگر ہر صورت میں اپنی مردانگی کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ ایک موقع پر تو صاف صاف کہا گیا ہے کہ چھوٹے ملکوں کے ہاتھ میں ایٹمی ہتھیار آگئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ ان کا کیا کریں۔ ان سے کسی وقت بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ گویا ماں باپ ہی زیادہ جانتے ہیں کہ ان کے بچوں کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

گھریلو محاورے:

چلو مانے لیتے ہیں کہ جنگی اصطلاحات میں جنسی استعارے کام آسکتے ہیں لیکن مجھے جو چیز بہت ہی عجیب لگی وہ گھریلو محاوروں کا استعمال تھا۔ میرا خیال ہے یہ محاورے کسی طرح بھی جنگی استعاروں اور اصطلاحوں کے لئے موزوں اور مناسب معلوم نہیں ہوتے۔

ایٹمی میزائل "باورچی خانے کے گودام" میں رکھے جاتے ہیں۔ ٹرائڈنٹ

آبدوز میں جہاں ایٹمی وار ہیڈ سے لیس میزائل رکھے جاتے ہیں اسے فوجی جوان "کرسمس ٹری فارم" کہتے ہیں۔ دیکھ لیجئے کونسی زبان استعمال کی جا رہی ہے۔ گودام' فارم اور کرسمس ٹری؟

دوستانہ ماحول میں بھی اسی قسم کی زبان بولی جاتی ہے۔ دو دشمن ایٹمی وار ہیڈز کا "تبادلہ" کرتے ہیں جنگ نہیں کرتے۔ "ملاپ" کا لفظ تو بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ انتباہ کرنے اور اس کا جواب دینے کے لئے جوڑنے والے تاروں کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں میزائل کے وار ہیڈ گرتے ہیں اسے "نقش پا" کہا جاتا ہے۔ ایٹموں ہتھیار گرائے نہیں جاتے۔ بلکہ انہیں "بس" پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایٹم بم کو بم یا وار ہیڈ نہیں کہا جاتا بلکہ انہیں "دوبارہ داخل ہونے والی گاڑی" کہا جاتا ہے۔ اسے مختصر طور پر "آر وی" کہتے ہیں۔ اس سے قطعاً" یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کسی بہت ہی خطرناک اور تباہ کن ہتھیار کا ذکر کیا جا رہا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی گاڑی کا ذکر ہے جو گھر بھر کو پکنک پر لئے جا رہی ہے۔

ایسی زبان استعمال کر کے دراصل اس ہولناک اور دہشت انگیز دنیا کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے صرف ٹھوس چیزوں کو مجرد ہی نہیں بنا دیا جاتا بلکہ جنسی زبان کا استعمال بھی دل خوش کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ جس انداز سے بم گرتا ہے اسے "نقش پا" کہنا دانستہ طور پر حقیقت کو مسخ کرنا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ جواب دہ ہونے کا خوف انسان کو ایسے کام کرنے سے روکتا ہے۔

گھریلو محاورے اور زبان استعمال کرنے کا ایک اور مقصد وحشی طاقت کو قابو کرنا' اسے سدھانا اور ایٹمی تباہ کاریوں کو بے ضرر کر کے پیش کرنا بھی ہے۔ یہ استعارے ان ہتھیاروں کا خوف کم کرتے ہیں اور آپ کو وہ بہت چھوٹے اور بے ضرر محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح انسان کو ان پر اپنی فوقیت کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ان پر قدرت حاصل کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ آگ اگلنے والا اژدھا آپ کے بستر کے نیچے ہے' وہ آپ کے سارے خاندان اور سارے گھر کو تباہ کر سکتا ہے۔ پوری کائنات کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ آپ اسے محض اپنی لفاظی سے پالتو جانور بنا لیتے ہیں۔

روزمرہ کی زبان استعمال کر کے خود جنگی ماہرین بھی اپنی زندگی کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایٹمی وارہیڈ کو بلا اجازت چھوڑنے کے لئے جو الیکٹرانک سسٹم بنایا گیا ہے اس کا پیارا سا نام رکھا گیا ہے۔ PAL یعنی دوست' اینٹی بیلسٹک میزائل سسٹم کے لئے ابتداء میں جو نام رکھا گیا تھا اس کا نام "بامبی تھا" صدر کی طرف سے ہر سال ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے لئے جو منصوبہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ کیا بنانا ہے اور کس تعداد میں بنانا ہے؟ اسے "شاپنگ لسٹ" کہا جاتا ہے۔ یعنی خرید کی جانے والی اشیاء کی فہرست۔ جب ایٹمی ہتھیاروں کے نشانے طے کئے جاتے ہیں تو نیشنل کمانڈ اتھارٹی ہوٹل کے "مینیو" سے اس کا انتخاب کرتی ہے ایک خاص ایٹمی حملے کا نام "بسکٹ کاٹنے والا آلہ" رکھا گیا ہے۔ محکمہ دفاع نیوٹرن بم کے لئے بھی یہی لفظ استعمال کرتا ہے۔

ان الفاظ اور ان استعاروں سے انسانی زندگی اور انسانی جانوں کی طرف سے بھی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ ان علاقوں میں یہ سارے تباہ کن ہتھیار اس لئے بنانا ممکن ہوتے ہیں کہ وہاں انسانی جان اور انسان کی اذیتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہاں گھریلو چیزوں' انسانی جذبوں اور کرسمس ٹری کا گزر ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ دنیا اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے حتیٰ کہ اس میں موت اور تباہی بھی موجود ہوتی ہے۔ وہاں انسان نہیں مرتے' ہتھیار مرتے ہیں۔ "باپ کا قتل" اس وقت ہوتا ہے جب آپ کا ایک وارہیڈ دوسرے وارہیڈ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بقا اور موت کی وہاں بہت باتیں کی جاتی ہیں لیکن یہ بقا اور موت انسانوں کی نہیں ہوتی بلکہ ہتھیاروں کی ہوتی ہے——

نرینہ بچے کی پیدائش اور تخلیق:

چند گھریلو محاورے اور اصطلاحیں ایسی ہیں جن پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ ایسی امیجز ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مرد عورت سے بچہ پیدا کرنے کی طاقت بھی چھین لینا چاہتا ہے اور پیدائش اور تباہی کو یکجا کردینا چاہتا ہے۔ بم کے پراجیکٹ میں نرینہ اولاد کی پیدائش کی بے شمار امیجز موجود ہیں۔ دسمبر 1942ء میں ارنیسٹ لارنس نے طبعیات کے ماہروں کو شکاگو تار دیا۔ "نئے والدین کو مبارکباد' نئے آنے والے کا انتظار مشکل ہورہا ہے۔" لاس ایلاماس میں ایٹم بم کو "اوپن ہائمر کا بچہ" کہا جاتا تھا۔ لاس ایلاماس میں کام کرنے والے ایک ماہر طبعیات نے لکھا ہے کہ میری بیوی کی موت ہوگئی تو

میں گھر چلا گیا۔ وہاں مجھے تار ملا کہ "بیٹے کی پیدائش فلاں دن متوقع ہے۔" لارنس لیور مور میں ہائیڈروجن بم کو ٹیلر کا بچہ کہا جاتا تھا اور جو لوگ ایڈورڈ ٹیلر کو ذلیل کرنا چاہتے تھے وہ کہتے تھے کہ ٹیلر ہائیڈروجن بم کا باپ نہیں ہے اس کی ماں ہے۔ گویا ماں ہونا ذلت کی نشانی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اسٹینی سلاواولام اس کا حقیقی باپ ہے۔ اس خیال کا مطلب تھا کہ ٹیلر نے تو "اسے پیٹ میں پالا ہے۔"

چالیس سال تک ایٹمی سائنس دانوں کی ذہنیت نے اسی خیال کو تقویت پہنچائی کہ تخلیق کے عمل میں عورت کا کام صرف پیٹ میں بچہ پالنا اور اسے پیدا کرنا ہے۔ اصل کام تو مرد کا ہوتا ہے۔ کولاراڈو سپرنگ میں جب میں یو ایس سپیس کمانڈ میں گئی تو مجھے اس کا اندازہ ہوا مجھے جس گفتگو میں شرکت کا موقع ملا وہ مواصلاتی سیاروں کے نئے نظام کے بارے میں تھی۔ اس کا نام مل سٹار سسٹم تھا۔ جو افسر بتا رہا تھا اس نے بڑے جوشیلے انداز میں اس کی طاقت اور اس کی صلاحیت کا ذکر کیا اور اس میں سپیس کمان کا جو رول تھا اس کی بھی وضاحت کی۔ اس نے انکساری کے ساتھ کہا کہ ہم (سپیس کمان) تو صرف ماں کا کردار ادا کریں گے یعنی ٹیلیمٹری، ٹریکنگ اور کنٹرول ہی کریں گے۔

نرینہ بچے کی امیجری کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ہیروشیما اور ناگا ساکی کو جن ایٹم بموں نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا ان کے نام "ننھا بچہ" اور "موٹا مرد" تھے۔ یہ قیامت خیز ہتھیار ایٹمی سائنس دانوں کی اولاد تھے، صرف اولاد ہی نہیں ان کے بیٹے تھے۔ جب ان بموں کا تجزیہ کیا جا رہا تھا اور ان کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ کامیاب ہوں گے یا نہیں تو اس وقت کہا جاتا تھا۔ "خدا کرے بیٹا ہی ہو، کہیں بیٹی نہ ہو جائے۔" فتح کے نشے میں چور جنرل گروو نے پوسٹڈم کانفرنس میں شرکت کرنے والے امریکی وزیر دفاع کو اس موقع پر جو تار دیا تھا وہ خفیہ اشاروں میں تھا۔ اسے صاف لفظوں میں منتقل کیا گیا تو لکھا تھا۔ "ڈاکٹر بہت خوش اور پر اعتماد لوٹا ہے کہ بیٹا اپنے بڑے بھائی کی طرح ہی صحت مند اور ہٹا کٹا ہے۔ اس کی آنکھوں کی روشنی یہاں سے ہائی ہولڈ تک نظر آ رہی ہے اور میں اس کی چیخ یہاں سے اپنے کھیت تک سن سکتا ہوں——" امریکی وزیر دفاع نے چرچل کو اس طرح مطلع کیا۔ "بیٹے آرام سے پیدا ہو گئے۔" 1952ء میں مارشل جزائر میں جب ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا گیا تو ٹیلر نے لاس ایلاماس تار دیا۔ "بیٹا ہوا ہے۔" ایٹمی سائنس

دانوں نے ایٹمی بیٹے پیدا کئے تاکہ "مادر فطرت" پر ظالمانہ قابو پایا جاسکے۔ عسکری دانشوروں کا منصوبہ یہ ہے کہ ایسے تجریدی محاورے اور استعارے بنائے جائیں کہ سائنس داں جو تباہی کی قوت پیدا کر رہے ہیں اسے بے ضرر بنا کر پیش کیا جاسکے اور ان کے تباہی و بربادی والے اقتدار میں شرکت کی جاسکے۔

ایٹم بم بنانے کی پوری تاریخ ایسی امیجری سے بھری پڑی ہے جس سے تخلیق کے بجائے انسان کی تخریبی قوت کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ یہ امیجری ایسی ہے جو تباہی کی قوت کو کمتر کر کے پیش کرتی ہے اور اس کی جگہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ نئی دنیا تخلیق کی جا رہی ہے۔ گویا تخریب کو نئی تخلیق کہا جاتا ہے۔ ولیم لارنس نے پہلے ایٹم بم کا تجربہ دیکھا تھا۔ اس نے لکھا۔ "زبردست چکا چوند کے تقریباً ایک سو سیکنڈ بعد ہولناک دھماکہ ہوا' یہ نوزائیدہ دنیا کی پہلی چیخ تھی —— وہ زمین سے اچھلے تو تالیاں بجا رہے تھے۔ زمین زاد انسان ایک نوزائیدہ طاقت کی علامت بن رہا تھا۔" "موٹا مرد" نام کا بم اس نے ناگا ساکی پر گرنے سے ایک دن پہلے دیکھا تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر لکھا کہ "وہ تو جیتا جاگتا معلوم ہو رہا تھا۔"

خدا اور ایٹمی پروہت:

ایٹمی ہتھیاروں اور ایٹمی نظریہ میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں مذہبی امیجری بھی کافی دکھائی دیتی ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ زبان کے اس قسم کے استعمال سے تخلیقی طاقت پر بھی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایٹمی سائنس کی دنیا خالصتاً مادی حقیقت پسندی اور معقولیت کی دنیا ہے' یہ ایسی دنیا ہے جہاں اس بات پر فخر کیا جاتا ہے کہ وہاں جذبات کا گزر ہی نہیں ہوسکتا۔ جہاں لوگ گفتگو میں کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کرتے۔ اس دنیا میں مذہبی امیجری نظر آئے تو زبردست حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ سائنس کو تو مذہبی جکڑبندیوں سے آزادی کا اظہار مانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک تو عورت' اور جذبات کی طرح مذہب بھی غیر سائنسی چیز ہی ہے۔ لیکن مذہبی امیجری اس کی زبان میں پہلے بھی ملتی تھی اور اب بھی ملتی ہے۔ پہلا ایٹمی تجربہ جو کیا گیا تھا اسے عیسائی مذہب کی اصطلاح کے مطابق "مقدس تثلیث" کا نام دیا گیا یعنی باپ بیٹا اور روح القدس۔ ان تینوں کے امتزاج سے گویا ایٹمی طاقت پیدا کی گئی۔ اور یہ تینوں تخلیق کی

مردانہ علامت ہیں۔ ماہر طبعیات رابرٹ اوپن ہائیمر نے پہلا دھماکہ دیکھ کر کہا تھا۔ ”ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے تخلیق کائنات کے پہلے دن کا ہم نظارہ کر رہے ہیں۔“ وہ اس وقت بھگوان کرشن کے وہ الفاظ دہرا رہے تھے جو انہوں نے بھگوت گیتا میں کہے ہیں۔“ میں موت بن گیا۔ دنیا کو ریزہ ریزہ کرنے والا۔“

سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ایٹمی سائنس کے ماہرین اپنے قبیلے کو ”ایٹمی پروہتوں کا قبیلہ“ کہتے ہیں۔ اب اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ایٹمی سائنس داں جو اپنے آپ کو ٹھوس حقیقت پسند کہتے ہیں وہ کسی نئے مذہب کی تشکیل کا دعویٰ کر رہے ہیں یا پھر خدانخواستہ خود خدا ہونے کے دعویدار ہیں کہ انہوں نے خدائی طاقت حاصل کرلی ہے؟

بہرحال ہم نے ایٹمی سائنس دانوں کی اس دنیا میں چند دن گزار کر جب ان کی زبان خود بھی بولنا شروع کی تو ہمیں محسوس ہوا کہ ان کی بہت سی اصطلاحیں براہ راست جنسی عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دشمن کے علاقے میں دور تک حملہ کرنے کے لئے Deep Penetration کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ دشمن کے فضائی دفاع کو مفلوج کرنے والا کم فاصلے کا میزائل Sram کہلاتا ہے۔ آبدوز کے ذریعہ چھوڑی جانے والی کروز میزائل کو SLCM نہیں کہا جاتا بلکہ اسے "Slick" EMS کہا جاتا ہے اور زمین سے چھوڑی جانے والی میزائل Glick' MS کہلاتی ہے۔ فضا سے چھوڑی جانے والی میزائل Alchems کہلاتی ہے یعنی جو عام دھات کو سونا بنا دیتی ہے۔

میں نے اس پروگرام میں جو کچھ سیکھا وہ یہ تھا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے گویا وہ سب مذاق ہے۔ میں بالکل سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔ جو زبان وہ بولتے ہیں اس کے الفاظ چٹ پٹے اور جنسی اشاروں سے پر ہوتے ہیں وہ سارے الفاظ اور اصطلاحیں بغیر سوچے روزمرہ ایسے بولی جاتی ہیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے کوئی اور معانی بھی ہیں۔ ان سے کسی اور طرف بھی دھیان جا سکتا ہے۔

میں جس زبان کا ذکر کر رہی ہوں وہ بدمعاش لوگ نہیں بولتے۔ حالانکہ اس زبان میں ساری بدمعاشی بھری ہوتی ہے۔ وہ لوگ یقیناً مہذب اور معقل لوگ ہیں لیکن یہ زبان اور یہ اصطلاحیں استعمال کرتے ہوئے وہ بھی لذت حاصل کرتے ہیں۔ وہ بھی

مزے لیتے ہیں۔ ہم پروفیسر ہوں یا طالب علم، سائنس داں ہوں یا عام مکینک یہ زبان سب ہی سیکھتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اپنے لہجہ میں طنز بھی رکھتے ہوں گے لیکن ہم سب اس سے مزہ ہی لیتے ہیں۔

میرے لئے تو خوشی بات تھی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی۔ ان کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور ان کی دنیا میں شامل ہو گئی تھیں۔ میں ان کی زبان سیکھ کر ان کی خفیہ سلطنت میں داخل ہو گئی تھی۔

عورت ہی چڑیل کیوں ہوتی ہے؟

میری نیلسن

چڑیل یا ڈائن عورت ہی کیوں ہوتی ہے ــــــ؟ چڑیل یا ڈائن جتنی ہیبتناک' بے رحم اور سنگدل ہوتی ہے مرد راکشس یا دیو اتنا ظالم اور بے رحم کیوں نہیں ہوتا؟ چڑیل انسان کو کھا جاتی ہے' ماں کے پیٹ میں بھی بچہ اس سے محفوظ نہیں رہتا۔ وہ جس شخص پر بد نظر ڈالتی ہے وہ دیکھتے ہی دیکھتے گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ اس کی بد نظر سے ہرے بھرے درخت سوکھ جاتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں سیلاب آتے ہیں' آندھیاں چلتی ہیں یا سوکھا پڑ جاتا ہے۔ مرد کی ایسی بد نظر نہیں ہوتی یا ہماری کہانیوں اور داستانوں میں ایسی نظر نہیں آتی۔ مرد کو بھکانے والی عورت ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ وشوامتر کی تپسیا' بھنگ کرنے والی مینکا ہو یا حضرت آدم کو جنت سے نکلوانے والی حوا۔ عورت بے وفا ہوتی ہے۔ اس کی شہوانی خواہشات بے حد و حساب ہوتی ہیں اس لئے وہ شیطان کے قابو میں جلدی آجاتی ہے۔

یہ تو ہے مشرق کا تصور' مغرب میں عورت کے چڑیل یا جادوگرنی ہونے کا تصور دراصل ان کے مذہبی عقیدے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے "تو جادوگرنی کو جینے نہ دینا۔" اس ایک آیت نے لاکھوں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اسے مذہبی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا گیا اور سیاسی مقاصد کے لئے بھی۔ مشرق کے توہمات محض توہمات ہی تھے اس لئے وہ کوئی مسئلہ نہیں بنے۔ عیسائی عقیدے کے مطابق یورپ نے اسے ایک نہایت سنگین مسئلہ بنا دیا۔ ذیل میں میری نیلسن نے عیسائی عقیدے اور یورپ کی تاریخ کے حوالے سے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مشرق بالخصوص جنوبی ایشیا میں اسے اس انداز سے سمجھنے کی کوئی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ مرد عورت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتا تھا اسے کسی قسم کی آزادی

نہیں دینا چاہتا تھا اس لئے اسے نفرت اور خوف کی تصویر بنایا گیا۔

ایک معاشرتی نظام جب دوسرے نظام کو اپنے راستے سے ہٹاتا ہے تو لازمی طور پر کئی مسائل، کئی آویزشیں، جنم لیتی ہیں۔ جہاں بھی نیا اور پرانا ملتے ہیں اور ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں چنگاریاں ضرور پیدا ہوتی ہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں جادوگری کے جرائم اس وقت سامنے آئے جب صنعتی نظام پرانے جاگیرداری نظام کی جگہ لے رہا تھا۔

اس وقت سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوا کہ انسانی رویہ کا ذمہ دار کلیسا ہے یا ریاست؟ اس سے مذہبی عدالت اور ریاستی عدالت کے درمیان چپقلش پیدا ہوئی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ انسانی توانائی پر جاگیردارانہ خاندانوں کا پہلا حق ہے یا صنعتی مالکوں کا۔ اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا کہ اس معاشرہ میں عورت کا کیا مقام ہے؟ گویا اس دور کی زبان میں یوں سوال کیا جاسکتا ہے کہ چڑیل کون ہے؟ یورپ میں جادوگرای کی روایت پتھر کے زمانے سے چلی آرہی تھی لیکن جادوگری کرنے والوں یا چڑیلوں کے بارے میں یہ جو تصور دیا کہ وہ جھاڑو پر بیٹھ کر آسمان میں اڑتی ہیں اور راتوں کو جنگل میں جاکر شیطان سے ملاپ کرتی ہیں اور وہاں بچوں کو آگ میں بھون کر جشن مناتی ہیں۔ دراصل یہ تصور پرانے توہمات اور عورتوں میں شیطنیت کی موجودگی سے خوف کھانے کے نئے عقیدے کا ملغوبہ تھا۔ لیکن یہ کوئی بے ضرر سی پریوں کی کہانی نہیں تھی بلکہ اس نے لاکھوں انسانوں کی جان لی۔ سن 1400 سے سن 1700 تک پانچ لاکھ کے قریب انسان جادوگری کے الزام میں آگ میں جھونکے گئے ان میں آدمی سے زیادہ عورتیں تھیں۔

قرون وسطیٰ میں مغربی یورپ میں جادوگری پر ریاست کی طرف سے سزا دی جاتی تھی وہ بھی اس صورت میں کہ اس سے کوئی جانی نقصان ہوجائے۔ کلیسا اس بارے میں نرم رویہ اختیار کرتا تھا اور اسے محض ایک واہمہ قرار دیتا تھا۔

تیرھویں صدی کے آغاز میں ایسے واقعات پیش آئے جن سے جادوگری کو ایک مذہبی جرم بنالیا گیا اور ہزاروں چڑیلوں کو الاؤ میں جھونک دیا گیا۔ اس کی ابتداء جنوبی فرانس کے علاقے طلوس سے ہوئی۔ بحیرۂ روم کے راستے تجارت کے فروغ نے اس علاقے میں آزاد خیال اور وسیع القلب طبقہ پیدا کردیا تھا۔ اس لئے وہاں مصوری اور

رزمیہ شاعری فروغ پا رہی تھی۔ اس معاشرہ میں بلغاریہ کے راہبوں نے اپنا ایک فرقہ پیدا کیا جس نے صرف شہری لوگوں کو ہی متاثر نہیں کیا۔ بلکہ اشرافیہ اور پادریوں میں سے بھی بہت سے لوگوں کو اپنا پیروکار بنالیا۔ اس سے پوپ بہت ناراض ہوا۔ اسے خطرہ تھا کہ اس طرح اس کی اپنی مذہبی بادشاہت کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے اس نے پہلے تو پیار محبت سے انہیں واپس اپنے فرقے میں لانے کی کوشش کی۔ جب اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے اس طرح جہاد کا اعلان کر دیا جیسے مسلمانوں کے خلاف کیا گیا تھا۔ شمالی فرانس کے سورما پہلے ہی جنوب کی زمینوں پر نظریں لگائے بیٹھے تھے۔ فوراً ان کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ لیکن نئے فرقے کے ماننے والے اور مقامی لوگ بھی شمال کے خلاف اکٹھے ہوگئے۔

پوپ نے ان لوگوں کو اپنا عقیدہ چھوڑنے کے لئے بہت لالچ دیئے۔ پھر اس نے مذہبی عدالتیں بنائیں جو صرف پوپ کے سامنے جواب دہ تھیں۔ ان عدالتوں کے کارندوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ "مرتد" لوگوں کو تلاش کریں ان سے اقبال جرم کرائیں اور انہیں شدید سے شدید سزائیں دیں حتیٰ کہ ان کی جائیداد بھی ضبط کرلیں۔ کوشش یہ کی جاتی تھی کہ متعلقہ شخص اپنے گناہوں سے توبہ کرلے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے حکومت کے حوالے کر دیا جاتا جو اسے آخری سزا دیتی۔ 1245 میں نئے فرقے کے آخری قلعہ کو بھی فتح کر لیا گیا اور صرف ایک دن میں دو سو انسان قتل کر دیئے گئے۔ جو بچ گئے وہ نارمنڈی بھاگ گئے یا روپوش ہوگئے جن کی تلاش اگلی صدی میں بھی جاری رہی۔ 1326ء تک ہر پوپ کی پالیسی یہی رہی کہ ان "مرتدوں" کو دوبارہ اصل عقیدے پر واپس لایا جائے لیکن اس سال پوپ جان نے سزا کا اختیار حکومت سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پوپ کو شبہ ہوگیا تھا کہ اس کے لئے اپنے محل میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو جادو گری کے ذریعہ اسے مار ڈالنے کی سازش کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے فرمان جاری کیا کہ جادوگری کفر ہے اس لئے تمام جادو کرنے والوں اور جادو کے اثر سے چڑیل بننے والیوں کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ اس کے ساتھ ان کی تمام کتابوں کو بھی نذر آتش کر دیا جائے اس کے ساتھ ہی طلوس اور نارمنڈی میں کافروں اور جادوگروں کی تلاش اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی جو پوری ایک صدی جاری رہی۔ اس میں

ہزاروں آدمیوں کو نذر آتش کیا گیا ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ اس زمانے میں کافروں اور جادوگروں کو سزائیں دینے کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں ہدایات دی جاتی تھیں کہ انہیں کیسے تلاش کیا جائے اور کیا کیا سزائیں دی جائیں۔

1451ء میں پوپ نے ایسے افسر مقرر کئے جو جگہ جگہ سے ان لوگوں کو تلاش کرکے آگ میں جھونکتے تھے۔ اب تک اس مقصد کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی تھیں ان کی تقسیم محدود ہوتی تھی لیکن پرنٹنگ پریس ایجاد ہونے کے بعد ایک کتاب چھپی جس کا نام تھا Malleus اس کتاب نے ساری عیسائی دنیا تک یہ آگ ہی نہیں بھڑکائی بلکہ یہ بھی بتایا کہ عورت ہی چڑیل کیوں ہوتی ہے؟ اس کے مطابق عورت چونکہ کمزور ہوتی ہے اس لئے اس کی روح اور اس کا عقیدہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ شیطان عورت پر جلدی غلبہ پالیتا ہے اور وہ جلدی چڑیل بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شیطان کے ساتھ یہ بات منسوب کی جاتی تھی کہ وہ فری سیکس کا قائل ہے اور عورت میں چونکہ جنسی خواہشات بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لئے وہ جلدی شیطان کی چیلی بن جاتی ہیں۔

مذہبی عدالتوں اور ان کے افسروں کے اختیارات اتنے بڑھ گئے تھے کہ حکومتوں کے ساتھ بھی ان کا تصادم ہونے لگا چنانچہ انہیں فرانس' اٹلی اور جرمنی سے نکالا بھی گیا لیکن ان کے اثرات کسی طرح کم نہیں ہوئے۔ اور انہوں نے مذہب کے نام پر پکڑ دھکڑ کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ سیاسی مقاصد کے لئے بہت بعد تک جاری رکھا گیا۔

سن 1500 میں اصلاح دین اور اس کی مخالف تحریکوں کے سلسلے میں بھی چڑیلوں اور جادوگروں کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ کیتھولک عیسائیوں نے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو کافر اور جادوگر کہہ کر مارا اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے کیتھولک عیسائیوں کو مارا۔ ملکہ ایلزبتھ اول کے زمانے میں چڑیلوں کے خلاف مہم دراصل کیتھولک عقیدہ رکھنے والوں کے خلاف تھی۔ سوئٹزر لینڈ کے بشپ نے ملکہ کو لکھا کہ وہ چڑیلوں کے خلاف فوری کارروائی کریں ورنہ وہ ان کی سلطنت پر قبضہ کرلیں گی۔ ڈنمارک کے بشپ نے فرمان جاری کیا کہ کیتھولک عقائد کے تحت عبادات کرنے والے جادوگر اور کافر ہیں اس لئے انہیں آگ میں جھونک دیا جائے۔ بعد میں جب کیتھولک فرقہ کو پھر اقتدار ملا تو انہوں نے چن چن کر پروٹسٹنٹ لوگوں کو مارا۔

اس سارے جھگڑے میں سب سے زیادہ مظلوم عورت ہی رہی۔ کیونکہ پہلے کسی عورت کو چڑیل قرار دے کر اسے پکڑ لیا جاتا۔ اس پر تشدد کر کے اس سے کہلوایا جاتا کہ فلاں فلاں مرد جادوگر ہیں۔ پھر دونوں کو آگ میں جھونک دیا جاتا۔ عورتوں کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن انہیں اس طرح استعمال کیا جاتا گویا مذہب کے نام پر پوری طرح سیاسی مخالفوں کا صفایا کیا جا رہا تھا چڑیلوں کے خلاف مہم سے کچھ اور لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ مذہبی ججوں کا ایسا طبقہ پیدا ہوگیا۔ جو چڑیلوں اور جادوگروں کی جائیدادوں سے دولت مند بن گیا۔ جادوگر کا الزام اکثر امیر لوگوں پر لگایا جاتا۔ انہیں سزا دی جاتی تو ان کی جائیداد بھی ضبط کر لی جاتی اور یہ جائیداد ججوں کے قبضے میں آجاتی۔

یہ پاگل پن یا سیاسی مہم 1630 کے قریب کہیں جا کر کم ہوئی جب سویڈن نے میکلین برگ پر حملہ کیا اور فریڈرک دوئم نے تیس سالہ جنگ کے بعد امن و امان قائم کرنے کے نام پر ان عدالتوں کے مقدمات ختم کرائے۔ ویسے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سترھویں صدی میں یہ پاگل پن اس لئے ختم ہوا کہ لوگوں میں سائنسی فکر پیدا ہونے لگی تھی اور چڑیلوں اور جادوگروں کو مذاق سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیسا کے جس ادارے نے اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے یہ مہم شروع کرائی تھی اس کے اپنے اختیارات کم ہوگئے تھے۔ ادھر ریاست اور بادشاہ نے بھی زیادہ اختیارات حاصل کر لئے تھے اور اسے اس پاگل پن سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔

ہم نے دیکھا کہ اس مہم کا نشانہ کمزور طبقہ ہی بنا۔ عورت سب سے زیادہ کمزور تھی اس لئے پہلا نشانہ اسے ہی بنایا گیا۔ اس کے بعد یہودی، مسلمان (اسپین میں) اور بچے اس کا نشانہ بنے۔ کسی حد تک کوڑھی لوگوں کو بھی اس میں گھسیٹا گیا۔ تاہم یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ چڑیل عورت ہی کیوں بنی؟

جن لوگوں نے کتاب Malleus لکھی تھی انہوں نے عورتوں اور چڑیلوں کو عیسائی دنیا کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ انہوں نے لکھا کہ چڑیلیں صرف فصلیں ہی تباہ نہیں کرتیں، سمندروں میں سفر کرنے والوں کو طوفانوں میں ہی نہیں گھیرتیں بلکہ ماؤں کے پیٹ میں بچے بھی مار دیتی ہیں اس طرح نسلیں کی نسلیں تباہ کر دی ہیں۔ یہ خوف اور یہ خطرے فرضی بھی نہیں تھے کیونکہ جن دنوں یہ جنون اور یہ پاگل پن چل رہا

تھا' اسی دور میں سماجی نظام کے ساتھ عورت کے رشتے میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ قرون وسطیٰ میں یورپ کا ایک خاندان صاحب جائیداد ادارہ ہوتا تھا اور عورت یا بیوی کا اصل کام نرینہ وارث پیدا کرنا اور جہیز کے ذریعہ اس کی دولت میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ جو عورتیں شادی نہیں کرتی تھیں وہ نن بن جاتی تھیں اور کانونٹ میں داخل ہوجاتی تھیں۔ عام طور پر ایسی عورتیں دولت مند ہوتی تھیں۔ غریب عورتیں اپنے خاندان کے لئے محنت مزدوری کرتی تھیں۔ صنعتی دور شروع ہوچکا تھا اور عورت بھی مزدوروں کی صف میں شامل ہوگئی تھی۔ اب کوئی بھی خاندان یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا کوئی فرد اس کی آمدنی میں حصہ نہ بٹائے۔ اس لئے عورت گھر سے باہر آگئی تھی۔

نئے حالات نے دو بنیادی مسائل پیدا کئے۔ ایک تو صنعتی مزدوروں میں عورت کی شمولیت اور دوسرے افراد خاندان کی تعداد کم رکھنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف ذرائع۔ اسے صرف ایک سوال میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ خاندان کے ساتھ عورت کا کیا رشتہ ہے؟ قدیم معاشروں نے اس پر دو رویئے اپنائے تھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ عورت کے روایتی رول کے خوب گن گائے جائیں۔ اس کی خوب تعریف کی جائے۔ نئے فرقے کے خلاف مذہبی مہم شروع ہونے سے پہلے اور چودھویں صدی تک عورت قابل احترام ہستی مانی جاتی تھی حتیٰ کہ اسے قابل پرستش بھی قرار دیا جاتا تھا۔ ان دنوں فرانس اور اٹلی کے بہت سے شاعر پاکباز اور عصمت مآب عورتوں کی شان میں قصیدے لکھ رہے تھے۔ اسی زمانے میں کنواری مریم کی عبادت کا رواج بڑھا جن کی پرستش ایک آدرشانہ عورت کے روپ میں کی جاتی تھی۔ انہیں شہوانی جذبات سے پاک مانا جاتا تھا۔ دوسرا رویہ اسے کنواری مریم کی ضد یعنی چڑیل کے طور پر پیش کرنے کا تھا۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے معاشی اور معاشرتی حالات کو جاننا ضروری ہے۔

نئے صنعتی معاشرہ میں عورت پر دو قسم کے دباؤ پڑے۔ ایک تو اسے نقد آمدنی کا محتاج ہونا پڑا دوسرے اس کی شادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ شادی کرنے والے مردوں کی تعداد کم تھی۔ اس کے علاوہ جو مرد ٹیکسٹائل اور کان کنی کے ساتھ وابستہ تھے ان کی اپنی آمدنی اتنی کم ہوتی تھی کہ وہ شادی ہی نہیں کرسکتے تھے۔ ادھر صنعتوں کے گلڈ نے بھی یہ پابندی لگادی تھی کہ جب تک کوئی شخص "ماسٹر" کا درجہ حاصل نہ کرلے

اس وقت تک وہ شادی نہیں کرسکتا۔ اور یہ درجہ حاصل کرنا خاصہ دشوار تھا۔ نیا صنعتی مزدور دیہات سے ہی آیا تھا۔ اس کے پاس اتنی زمین نہیں تھی کہ وہ اس پر اپنا خاندان پال سکے۔ دیہی مزدوروں کی تعداد بڑھنے کیوجہ سے اجرتیں بھی بہت کم تھیں اور کاروباری اتار چڑھاؤ کی وجہ سے نوکریاں بھی پکی نہیں تھیں۔

سوال یہ ہے کہ جن عورتوں کو شوہر نہیں ملتا تھا ان کا کیا حشر ہوتا تھا؟ بہت کم عورتیں ایسی تھیں جن کے خاندان ان کی کفالت کرسکتے تھے۔ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ جن لڑکیوں کو کام نہیں ملا وہ طوائف بن گئیں یا کسی بڑی فیکٹری میں عام سی نوکر ہوگئیں یا دونوں کام شروع کردیئے۔ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ مالکوں نے ہڑتال توڑنے کے لئے عورتوں اور دیہی مزدوروں کو استعمال کیا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں بعض شہروں میں ایسے قانون بنائے گئے کہ کسی شریف عورت کو طوائف کہنے پر سزا دی جاتی تھی۔ جرمنی کے چند شہروں میں جہاں صنعتیں کافی ترقی کر رہی تھیں طوائفوں کے لئے الگ علاقے مخصوص کئے گئے۔

ایسی کوششیں بھی کی گئیں کہ جسم فروشی کے متبادل کاروبار عورتوں کو فراہم کیا جائے۔ چنانچہ چند کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتوں نے ایسے ادارے قائم کئے جو کہلاتے تو کانونٹ تھے لیکن مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا ان اداروں میں بے سہارا عورتیں رہتی تھیں اور وہاں رہ کر ملازمتیں اور دست کاریاں وغیرہ کرتی تھیں۔ کلیسا نے اس پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ ان میں لامذہبیت سکھائی جاتی ہے اور کفر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس لئے انہیں مرد پادریوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ انؑ پادریوں نے عورتوں کو جنسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی تو اس پر ہنگامہ ہوگیا۔ پوپ سے شکایت کی گئی تو اس نے حکم دیا کہ ان اداروں کے نگران چالیس سال سے زیادہ عمر کے مرد ہی ہوسکتے ہیں۔ ادھر صنعتی اور کاروباری اداروں کو بھی ان سے مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے قوانین نافذ کرائے جنھوں نے اداروں کو بند ہی کرا دیا۔ آخر کار یہ ادارے ان پادریوں کے لئے رہ گئے جو خانقاہوں میں رہنے کے بجائے عام لوگوں کے ساتھ ہی رہنا چاہتے تھے۔ بعد میں وہ ہسپتالوں اور محتاج خانوں میں تبدیل کردیئے گئے۔

تیرھویں صدی میں صنعتی ارتقاء کے ساتھ محنت کا نیا نظام پیدا ہوا اور کسانوں

اور بالخصوص عورتوں کے رہن سہن اور ان کی زندگی کا انداز بدلا اس کے ساتھ ہی نئے شہر بھی بنے۔ معیشت کا نیا نظام بھی سامنے آیا اور آبادی کی منتقلی بھی بہت زیادہ ہوئی۔ چودھویں صدی کے آغاز تک چند قدرتی آفات نے اس میں رکاوٹیں ڈالیں۔ 1315 سے 1317 تک شدید قحط پڑا۔ اس نے جو تباہی پھیلائی یورپ نے اس سے پہلے ایسی تباہی نہیں دیکھی تھی۔ اس سے بھی زیادہ ہولناک وہ طاعون تھا جس نے 1347 سے 1350 تک سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھا۔ اس طاعون نے یورپ کی ایک تہائی آبادی کو ہڑپ کر لیا۔ اس صدی کے آخر تک یہ بیماری مختلف مقامات پر پھیلتی رہی۔ زیادہ اموات شہروں میں ہوئیں۔ جو لوگ اس سے بچنے کے لئے دیہات کی طرف بھاگے وہ اپنے ساتھ یہ وبا دیہات میں بھی لے گئے۔

طاعون نے آبادی اتنی کم کر دی تھی کہ بچ جانے والے مزدوروں نے اپنی اجرتوں میں اضافہ کرایا اور کسانوں نے اپنی پیداوار کی منہ مانگی قیمت وصول کی۔ اس ہولناک وبا کے بعد اچانک بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اٹھارھویں صدی تک یورپ کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہی نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ بتائی جاتی ہے کہ تھوڑے عرصے کے بعد یہ وبا پھر پھوٹ پڑتی تھی۔ دوسرے انگلستان اور فرانس کے درمیان ہونے والی ایک سو سالہ جنگ بھی اس کی ایک وجہ تھی۔ لیکن تیسری اور سب سے اہم وجہ کام کی نوعیت تھی عورتیں کام کرنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرتی تھیں یا نوزائیدہ بچوں کو مار ڈالتی تھیں۔ بچوں کی پیدائش کم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اچانک ان لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملا تھا اور کچھ لوگ عیش کی زندگی بھی بسر کرنے لگے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ زیادہ بچے پیدا کر کے اپنی اس خوشحالی کو نقصان پہنچائیں بہت سے لوگ تو شادی ہی نہیں کرتے تھے اور جو کرتے تھے وہ بچے کم پیدا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کلیسا کی طرف سے یہ شکایت کی گئی کہ بچے روکنے کے لئے لوگ "عزل" کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان دنوں خاندانی منصوبہ بندی کا یہ طریقہ عام تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں انگلستان میں پیدا ہونے والے بچوں میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ خاص طور سے خوشحال خاندانوں میں لڑکیاں کم ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے وہاں بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا۔

چڑیلوں اور جادوگروں کا جنون شروع ہونے سے پہلے اس صدی میں عورتیں اپنے گھروں سے باہر قدم رکھتی اور کارخانوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ مرد مزدوروں کی کمی پوری کرنے کے لئے وہ کارخانوں میں کام کر رہی تھیں یا شادی کے بجائے طوائف کا پیشہ اختیار کر رہی تھیں۔ اس کی علاوہ کلیسا کی تعلیم کے خلاف بہت سی عورتیں خاندان چھوٹا رکھنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف طریقے اختیار کر رہی تھیں یا بچوں کو مار رہی تھیں۔ ان حقائق کے پیش نظر کلیسا کا یہ الزام ایسا غلط بھی نظر نہیں آتا کہ "چڑیلیں" مردوں کی تخلیقی قوت برباد کر دیتی ہیں' بچوں کو کھا جاتی ہیں اور کھلے عام اپنی جنسی خواہش پوری کرتی ہیں اور ان کا جنسی عمل بچوں کی پیدائش کے لئے نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں دائیوں کو سب سے زیادہ قصوروار قرار دیا جاتا تھا کیونکہ ایسے کام وہی کراتی تھیں۔ کلیسا نے یہ سب کچھ شیطان اور اس کی چیلی چڑیلوں کے ساتھ منسوب کر دیا کہ شیطان اپنے مقاصد کے لئے عورتوں سے ایسا کراتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس فعل سے باز رکھنے کے لئے کلیسا نے یہ اصطلاح استعمال کی ہو تاکہ لوگ ڈر جائیں۔

چڑیل در اصل قرون وسطی کی بری یا بدمعاش عورت ہے۔ وہ خود بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے بچے بھی ضائع کرتی ہے' اس کے علاوہ جنسی طور پر بدمعاش اور شہوت پرست ہوتی ہے۔ نن اور کنواری مریم کے برعکس چڑیل خدا کے بجائے اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیتی ہے۔ کچھ مردوں کو بھی اس کا مجرم قرار دیا گیا۔ لیکن اصل میں چڑیل عورت ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا تعلق پیدائش اور فطرت کے اتار چڑھاؤ سے ہوتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یورپ میں جادوگری اور چڑیلوں کا ہوّا دراصل جاگیرداروں اور ان کے گماشتوں نے کھڑا کیا جو معاشرہ میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے خلاف تھے۔ ان کا بس سماج کے دوسرے طبقوں پر تو چلتا نہیں تھا اس لئے انہوں نے کمزور طبقے یعنی عورت کو اپنا نشانہ بنایا۔ اس دور میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں واضح طور پر ان تبدیلیوں سے خوف کھانے کا احساس ملتا ہے۔ خاص طور پر خاندانی ڈھانچے میں جو تبدیلی ہو رہی تھی یہ لوگ اس سے بہت خوفزدہ تھے۔ اصلاح پسند بھی عورت کو اچھی بیوی اور اچھی ماں سے زیادہ اور کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ لوتھر بھی عورت کو شادی کرنے اور اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت کرنے کی

ہی تلقین کرتا ہے۔

پندرھویں صدی میں ڈومینکن چرچ کو یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کوئی اور بہانہ چاہیئے تھے۔ اسپین میں صنعتی انقلاب نہیں آیا تھا۔ وہاں عورتیں ایسا مسئلہ نہیں بنی تھیں۔ اس لئے وہاں یہودیوں اور مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی مہم شروع کی گئی۔ اس سے بھی دل نہ بھرا تو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو کافر اور جادوگر کہنے لگے۔ اس طرح مخالف فرقے کے گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے اور ان کی املاک پر ججوں نے قبضہ کرلیا۔ آخر میں حالت یہ ہوگئی اس سے سیاسی مقاصد بھی حاصل کئے جانے لگے۔

آج عورت سماجی ڈھانچے کے لئے جس طرح خطرہ بن رہی ہے اس نے آج بھی ہمارے درمیان اسی قسم کے جنون کو برقرار رکھا ہے۔ ہم ابھی تک برتھ کنٹرول اور لیبر مارکیٹ میں عورت کی شمولیت کا مسئلہ حل نہیں کرپائے ہیں۔ ابھی تک جاگیرداری نظام کی جگہ صنعتی نظام کے قیام کا عمل مکمل نہیں ہوا ہے۔ (پاکستان میں تو اس معنی میں صنعتی اور سائنسی دور آیا ہی نہیں ہے) ادھر صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں انتہائی مرکزیت کا حامل کاسموپولیٹن' بیوروکریٹک' اور کمیونیکیشن پر انحصار کرنے والا ایک ایسا نظام تشکیل پا رہا ہے جہاں خاندان کی موجودگی اور عورت کے مقام کا سوال ہی غیر متعلق ہوتا نظر آتا ہے۔ جوں جوں نیا نظام مضبوط ہوگا اور پرانے صنعتی نظام کو پیچھے دھکیلے گا ویسے ہی نئے سوال پیدا ہوں گے اور نئے مسائل بھی سر اٹھائیں گے۔

(میری نیلسن نے تاریخی واقعات پیش کرتے ہوئے چند نہایت اہم واقعات اور اعداد و شمار کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اول تو یہ کہ یورپ میں 1484 سے 1782 تک چڑیل بن جانے یا جادوگری کرنے کے الزام میں تین لاکھ سے زیادہ افراد کو مارا گیا۔ ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ سترھویں صدی میں امریکہ کی ریاست میسا چیوسٹس میں سلیم کے مقام پر چڑیلوں کا جو واقعہ پیش آیا اس نے بعد میں آرتھر ملر کے مشہور ڈرامہ The Crucible کو جنم دیا۔ اس پر کئی اچھی فلمیں بھی بنائی گئیں۔ سلیم میں ایک پادری کی سیاست نے 19 عورتوں کی جان لی۔ انہیں چڑیل کہہ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ انگلستان میں اس قسم کا آخری واقعہ 1716 میں اور اسکاٹ لینڈ میں 1722 میں پیش آیا۔ (مترجم)

عورت اور فلم

ٹریساڈی لاریٹس

سلویا بوو۔لنشن نے 1976ء میں جب یہ سوال اٹھایا تھا کہ کیا کوئی عورتانہ (Feminine) (یہ مردانہ کا متبادل ہے) جمالیات بھی ہوتی ہے تو اس نے خود ہی یہ جواب بھی دیا تھا کہ ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ یعنی اگر جمالیاتی شعور اور جنسی ادراک کی بات کی جائے تو جواب ہاں میں ہے اور اگر فنکارانہ تخلیق کے غیر معمولی تنوع اور کسی دقت طلب اور مبسوط نظریہ فن پیش کرنے کا حوالہ ہو تو جواب نفی میں ہے۔

بظاہر اس میں ایک قسم کا تضاد دکھائی دیتی ہے لیکن یہ تضاد گزشتہ پندرہ سال کی عورتوں کی تحریک میں بھی نظر آتا ہے۔ دراصل اس تحریک کو دوہرے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک طرف تو عورت کا مثبت کردار پیش کرنا تھا یعنی معاشرتی شخصیت کے طور پر عورت کا مثبت کردار اور دوسری طرف مردوں کے بور کلچر کا ازلی منفی رجحان تھا۔ بقول بوو۔لنشن (مسئلہ یہ تھا کہ ہم کس طرح سوچتے ہیں؟) اور ہم جس منطقی انداز میں سوچتے ہیں کہیں وہ بھی مردوں کی ہی کوئی چالاکی تو نہیں ہے؟ کیا ہماری خواہشات اور خوشی و مسرت کے انداز' علم' ثقافتی روایات اور ثقافتی ماڈل سے مختلف ہیں یا ان جیسے ہی ہیں؟

عورتوں کی فلموں' ان کی سیاست اور ان کی زبان پر جب بحث کی جاتی ہے تو اس میں بھی یہی تضاد نظر آتا ہے۔ 1970ء کی دہائی میں بنائی جانے والی فلموں میں عورتوں کی تحریک اور عورتوں کی سیاست کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا جو مردوں کا ہی انداز تھا۔ دوسری طرف عورتوں نے جو فلمیں بنائیں ان میں ایک اور انداز سے عورت کو موضوع بنایا گیا۔ لیکن اس دہائی کے وسط سے اس کے آخر تک عورتوں کی تحریک کی فلموں کا جو کلچر نظر آتا ہے اس میں دو قسم کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف عورتوں کی تحریک اور اس کی سیاست کو جوں کا توں دستاویزی انداز میں پیش کرنے پر زور دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف فلم کو سوشل ٹیکنالوجی کے طور پر اس کے خالص فن کارانہ

انداز میں پیش کرنے پر اصرار نظر آتا ہے۔ اس میں جدت پسندی کا رجحان نمایاں ہے۔

بوو۔لنشن خواتین کی آزادی کے تقاضوں اور فن کارانہ تخلیق کے درمیان فرق کو زیادہ پسند نہیں کرتی۔ وہ کہتی ہیں کہ فلم ساز خواتین اس مخمصے میں مبتلا دکھائی دیتی ہیں کہ تحریک کی سرگرمیوں اور عورت کے ابھرتے شعور کو بھی جوں کا توں پیش کیا جائے اور اس کے ساتھ فلم کے اپنے تقاضوں کا بھی پورا خیال رکھا جائے۔ لارا ملوی اس قسم کی فلم سازی کے دو دور متعین کرتی ہیں اول دور وہ تھا جب فلموں کا موضوع تبدیل کرنے پر اصرار تھا۔ یعنی عورت کے اصل تجربات حقیقی انداز میں پیش کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ دور عورت کے شعور بیدار کرنے کے لئے ایک قسم کے پروپیگنڈہ کا دور تھا۔ دوسرا دور وہ تھا جب جمالیاتی اصولوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔

دوسرے دور میں فلموں سے باہر جو موضوعات زیر بحث تھے انہیں جمالیاتی انداز میں فلموں میں پیش کیا گیا اس بات کی کوشش کی گئی کہ حقیقت پسندانہ واہمہ پیدا کرنے کے بجائے فلم کو تیکنیکی طور پر جدت پسندانہ انداز میں پیش کیا جائے۔ یعنی فلم کو جمالیاتی بنیاد سے الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے مقصدیت اور افادیت پسندی کا تابع نہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں سلویا پلاتھ کی نظم The Bell Jar کا حوالہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سلویا نظم میں اس بات پر دکھ کا اظہار کرتی ہے کہ جو قالین دیوار پر لگانے کے لئے ہاتھ سے بنا گیا تھا اسے فرش پر بچھا دیا گیا ہے اس طرح اس کی خوبصورتی ضائع کردی گئی ہے۔ بوو۔لنشن کا بیان ہے کہ ہر تخلیق وجود میں آنے کے بعد اپنی تخلیق کے مقصد سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور وہ فن کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اب اس کی مارکیٹ آرٹ گیلری، کتب خانہ یا میوزیم بن جاتا ہے۔ اس کی قدروقیمت اس کے انفرادی استعمال میں نہیں ہوتی بلکہ اس کے اظہار اور ابلاغ میں ہوتی ہے۔ اس کی قدر کا تعین معاشرتی طور پر مسلمہ جمالیاتی اصول کرتے ہیں۔

ملوی بھی فلم کے دستاویزی انداز کی مخالفت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ہمیں فلم سازی کے اس جدید رجحان کی پیروی کرنی چاہیئے جو آئین سٹائن اور وارٹوف سے ہوتا بریشت اور گودراد تک پہنچتا ہے وہ اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ عورتوں کی فلموں میں

سستی جذباتیت سے گریز کرنا چاہیے۔ ایسی فلمیں بنانا چاہئیں جن میں ہر عورت کو اپنی تصویر نظر آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ فلم میں کون سی ایسی چیز ہونی چاہیے کہ عورت اس میں اپنی شناخت کر سکے؟ فلم میں تضادات ابھار کر کس طرح اس تبصرہ اور تنقید بنایا جائے؟ اور پھر یہ کہ یہ تمام عوامل مل کر کسی فلم کو عورتوں کی تحریک کی فلم کیسے بنا سکتے ہیں؟

عورتوں کی تحریک کے بنیادی سوال ہیں کہ عورت کیا ہے؟ معاشرہ میں اس کا کیا مقام ہے؟ اسے تخلیق کا موضوع کیسے بنایا جائے؟ فلم میں عورت کی شناخت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد کردار کے بجائے عورت کا کردار رکھ دیا جائے بلکہ اس کا مطلب اس سے زیادہ ہے۔ عورت کے آج کے تجربات کیا ہیں؟ اسے کن تضادات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟ اور مردوں کے بنائے ہوئے ضوابط اس کی راہ میں کیسی رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں؟

معروضی اور موضوعی جدلیات کے بارے میں نظریاتی تصورات خواہ ہیگل کے ہوں یا لاکاں کے ان پر اعتراض کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔ یہ تصور مغربی کلچر کے مباحث میں ہمیشہ سامنے آتے ہیں۔ اس میں جنسی تفریق غلط مفروضے کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ یعنی انسان معروضی شکل میں مذکر ہے۔ لیکن افلاطونی روایات کے تحت جو دیومالائی تصور ہم تک پہنچا ہے اس کے مطابق انسانی تخلیق میں جو چیزیں خاص اہمیت رکھتی ہیں جیسے دماغ' روح' زبان' آرٹ وہ کسی خاص جنس کی شکل نہیں رکھتیں۔ بلکہ اگر فطرت کا تصور سامنے لایا جائے تو وہ منطقی شکل میں ہی سامنے آتا ہے۔ فطرت ماں کی کوکھ ہے رحم مادر ہے باقی تمام چیزیں اس کا نمونہ یا ماڈل ہیں۔ لیا میلنڈری کا کہنا ہے۔

"عینیت پسندی یا آئیڈیلزم' دماغ کے مقابلے میں جسم اور حقیقت پسندی کے مقابلے میں مجرد مادہ کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ دو خانوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک خانہ ہے عورت کا جسم اور دوسرا خانہ ہے عورت کی قوت تخلیق تاہم کسی شے کی تخلیق سے پہلے عورت کا جسم ہوتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ عورت اب ایک معاشی مشین بن چکی ہے جو انسانی نسل پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ وہ دولت سے زیادہ آفاقی حیثیت رکھتی ہے۔"

یہ خیال جدید جمالیات اور جدید فلموں کے رجحان پر زیادہ صادق آتا ہے۔ یہ خیال مائیکل سنو اور گودراد کی فلموں پر تو صادق آتا ہے لیکن ایو' رینو' والی ایکسپورٹ' شینال ایکرمان یا مارگریٹ دور اس کی فلموں پر اسطرح صادق نہیں آتا۔ فاس بیندر کی فلمیں بھی اس زمرہ میں آتی ہیں یہی بات پر تلوچی اور پاسولینی کی فلموں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان فلموں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ہمیں اپنے سوال کی نوعیت تبدیل کر لینی چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ کون سی فارم' سٹائل یا موضوع ایسا ہے جس سے یہ احساس ہو کہ اس فلم میں کیمرے کے پیچھے عورت تھی؟ یعنی یہ کہا جا سکے کہ عورت اپنے انداز میں معاشرہ اور دنیا کو دیکھ رہی ہے ایک ایسی فلم جس سے آرٹ اور کلچر کی نئی تعریف ہمارے سامنے آئے۔ اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیا کوئی نسوانی جمالیات ہے؟ لیکن ایسے سوالوں پر غور کرتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے (مالک) کے گھر میں بند ہو کر اس گھر کو اس کے اوزاروں سے گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اوڈری لوڈرے نے مالک کے گھر کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسا کر کے ہم س کلچر کے مفادات کے لئے ہی جواز پیش کرتے ہیں جسے ہم تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ مالک کے اوزار اپنے گھر کو گرانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن معمولی رد و بدل بھی اکثر عورتوں کے لئے قابل قبول ہی نہیں ہے۔ اب تو یہ وقت آگیا ہے کہ جمالیات' بیانیہ' فلم سازی کا انداز' اور بصری لذت کے تصور کو ہی سرے سے بدلا جائے اور اس کے مقابلے میں نسوانی تصور دیا جائے۔

ایکومان کی فلم Jeane Dielman اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ یہ فلم بیلجیئم کے ایک متوسط طبقے کے خاندان اور اس کی ایک ادھیڑ عمر کی ایک عورت کی کہانی ہے۔ اس میں "قبل از جمالیات" کو جمالیات کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس فلم کی اس خوبی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس میں امیجز بہت خوبصورت ہیں 'فریموں کی کمپوزیشن متوازن ہے' ریورس شاٹس سے گریز کیا گیا ہے' اسٹل کیمرے کے شاٹس کی ایڈیٹنگ بہت اچھی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عورت کا کام' اس کے تاثرات اس کا جسم اور اس کا

دیکھنے کا انداز تماشائیوں کے لئے دیکھنے کا ایک خاص دائرہ مقرر کرتا ہے اور تماشائیوں پر ایک نیا افق روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ فلم میں بیانیہ کا تعطل کسی خاص واقعہ کے انتظار کے لئے نہیں ہے (حالانکہ ایسا واقعہ پیش آتا ہے) بلکہ وہ ایک معمولی سے واقعہ پر مبنی ہے۔ عورت کی ایک چھوٹی سی بھول پر آلو چھیلتے ہوئے' کافی بناتے ہوئے وہ جو غلطی کرتی ہے چیزوں کو جس طرح وہ بھول جاتی ہے وہ فلم کی کہانی کو نئے معانی دیتی ہے۔ فلم میں نہایت فن کارانہ انداز میں جو چیز پیش کی گئی ہے وہ عورت کا اپنا خالص نجی تجربہ' اس کا اپنا تصور اور واقعات کے ساتھ اس کے رشتے کا خاص انداز ہے۔ اس طرح قبل از جمالیات کو جمالیات کی شکل دی گئی ہے جیسے گودراد کی فلم

Two or Thre Things I know about her میں یا پولانسکی کی Repulsion یا انتونیانی کی Eclipse میں دوسرے انداز سے پیش کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایکومان کی فلم اپنے تماشائیوں سے ایک عورت کی طرح خطاب کرتی ہے۔ ایکومان نے ایک انٹرویو میں کہا

"میں اس فلم کو عورتوں کی تحریک کی فلم محض اس لئے نہیں کہتی کہ اس میں وہ چیزیں پیش کی گئی ہیں جو اس سے پہلے کسی فلم میں نہیں پیش کی گئیں بلکہ میں اس لئے کہتی ہوں کہ اپنے موضوع سے زیادہ پیش کش کا انداز اسے خالص عورت کی فلم بناتا ہے۔ اگر آپ کس عورت کے تاثرات یا اس کے چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے کو تفصیل کے ساتھ دکھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ ان تاثرات کو قبول کرتے ہیں جنہیں اب تک نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔

میرے خیال میں عورت کی فلم کا مسئلہ اس کا موضوع نہیں ہے۔ بلکہ عورت کو پیش کرنے کا انداز ہے۔ عورت میں اتنا اعتماد مشکل سے ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصل جذبات کھل کر بیان کر سکے۔ وہ یہ بتائے کہ وہ کیا چاہتی ہے؟ چیزوں کو دیکھنے کا اس کا اپنا سلیقہ کیا ہے؟ اس کی اپنی لے اور اپنا ردم کیا ہے؟ بے شمار عورتیں تو اپنے جذبات سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ لیکن میں ایسا

نہیں کرتی۔ مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد ہے اس لئے میں کہتی ہوں کہ یہ فلم عورتوں کی تحریک کی فلم ہے۔اس لئے نہیں کہ وہ کیا کہتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ کیا دکھاتی ہے اور کیسے دکھاتی ہے۔"

تماشائیوں اور فلم سازوں کے درمیان جو مکالمہ ہوتا رہا ہے اس کی روشنی میں یہ کہنا خاصہ مشکل نظر آتا ہے کہ کوئی فلم عورت کی حیثیت سے اپنے تماشائیوں سے مکالمہ کرتی ہے یا نہیں۔؟ ایک فلم ہے Redupers اس فلم میں بظاہر برلن کی دیوار کو تقسیم کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن یہ تقسیم اور تفریق صرف دو حصوں کی ہی نہیں ہے بلکہ فلم میں اسے جنسی تفریق بھی بتایا گیا ہے اس میں ایک اندرونی تضاد اور ایک دوری بھی نظر آتی ہے یہ تضاد اور دوری وہی ہے جو ورجینیا وولف کے Room of ones own میں موجود ہے یہ اندرونی کشمکش کے ساتھ باہر کی دنیا سے ایک قسم کی آویزش بھی ہے۔ خاتون فن کار' اور لکھنے والیاں اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار کرتی رہی ہیں۔

لیکن گر ٹرڈ کوچ سوال کرتی ہیں کہ کیا واقعی عورتوں کی فلموں نے اس ماڈل کو توڑ دیا ہے جو کیمرہ نے اپنے پیچھے سے دیکھنے کے لئے تیار کر رکھا ہے؟ کیا عورت دنیا کو' مرد کو اور اشیاء کو کیمرہ کے پیچھے سے مختلف انداز میں دیکھتی ہے؟ میرے خیال میں کیمرے کے پیچھے عورت کی موجودگی کے سوال پر زیادہ زور نہیں دینا چاہئے بلکہ فلم ہمارے دوسرے ثقافتی شعبوں پر عورت کے نقطہ نظر سے جس طرح اثر انداز ہوتی ہے اس پر غور کیا جانا چاہئے اور ہمارے معاشرتی تصور کے لئے اس کے مفید اور غیر مفید ہونے کے امکانات کا جائزہ لینا چاہئے۔ ہمیں جمالیات اور فلم سازی کے نئے تصور کی نئی تعریف تلاش کرنا چاہئے۔

اس سلسلے میں عورتوں کی تحریک کے ابتدائی تصورات میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہو گئی۔ جیسا کہ شیلا روتھ نے کہا ہے۔ "ہمیں اپنے ثقافتی تصورات' اپنی تخلیقات' اپنے عمل اور اپنی فلم پر غور کرتے ہوئے یہ سوچنا چاہئے کہ اب عورت کے سینما کو معاشرتی فکر کے طور پر پیش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اسے سیاسی

تبصرہ یا تنقیدی سیاست بنایا جائے اور عورتوں نے سماجی شعور سے معاشرتی اور تاریخی رشتوں کا جو تجزیہ کیا ہے اور عورتوں کی تحریک نے عورت کو ایک نئے معاشرتی موضوع کے طور پر جس طرح پیش کیا ہے اور اسے ایک مقرر، ایک اداکار، قاری، تماشائی، چیزوں کو استعمال کرنے والی، ثقافتی پیکروں کی خالق اور ثقافتی عمل کی تخلیق کار کے طور پر اسے جس طرح سامنے لایا گیا ہے اسے فلم میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اب عورتوں کی فلموں کا مقصد مردوں کے بنائے ہوئے ثقافتی ڈھانچے کو توڑنا ہی نہیں ہے بلکہ ایک نیا وژن اور ایک نیا نقطہ نظر دینا بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اس نئے موضوع کو نئے انداز میں پیش کرنے کے لئے حالات بھی پیدا کئے جائیں۔ میرے خیال میں عورت کو مثبت یا منفی انداز میں پیش کرنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فلم اپنے تماشائیوں سے عورت کی حیثیت سے تخاطب کرے۔ یہ فلم خواہ عورت نے بنائی ہو یا مرد نے۔

عورتوں کی فلموں کا پہلا میلہ 1972 میں نیویارک اور ایڈنبرا میں ہوا۔ اور عورتوں کی تحریک کے حوالے سے فلموں پر جائزہ لینے والا رسالہ 1972 سے 1975 تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد عورت کے اظہار ذات کا سوال عورتوں کے درمیان مکالموں تک ہی محدود رہا۔ اگر عورت کی فلم کو اس طرح دیکھیں کہ کون فلم بنا رہا ہے اور کس کے لئے بنا رہا ہے؟ کون سن رہا ہے اور کون بول رہا ہے تب بھی تھیوری اور عمل کے درمیان جو دوری نظر آئے گی وہ فلم کی خوبی ہی ہو گی خرابی نہیں ہو گی۔ میری این ڈون، پیٹریشیا میلن کیمپ اور لنڈا ولیمز نے اپنی مشترکہ کتاب Re Vision:Essays in feminist film criticism میں لکھا ہے۔

"اگر عورتوں کی تحریک سے متعلق فلمیں زیادہ سے زیادہ نظریاتی ہوتی جا رہی ہیں اور ان میں سیاسی عمل زیادہ نظر آنے لگا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تھیوری بذات خود غیر پیداواری چیز ہے یا عورتوں کی تحریک نے مکتبی مباحث کی شکل اختیار کرلی ہے --- عورتوں کی تحریک میں تمام کام ہر چیز کو ساتھ ملا کر ہی کئے جاتے ہیں۔ فلم سازی میں بھی عورتوں کی تحریک کے تمام عوامل ہیں۔"

اس کتاب کا نام دراصل ایڈرین رچ سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب ہے مڑکر دیکھنا۔ نظرثانی کرنا۔ نئی نظر سے دیکھنا عورتوں کے لئے اپنی بقا کا مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب ہے "فرق کو ایک فرق" کے ساتھ دیکھنا۔ بصارت اور سماعت کو اس طرح منظم کرنا کہ اک نئی تصویر سامنے آئے۔ میرے خیال میں انقلابی عمل کا تقاضہ ہے کہ صرف جنسی تفریق تک اس ے محدود نہ رکھا جائے بلکہ عورت اور عورت کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے کیونکہ بہرحال مختلف عورتوں کا پس منظر مختلف ہوتا ہے ایسی عورتیں بھی ہیں جو سب کے سامنے مردوں کے ساتھ رقص کرتی ہیں ار ایسی عورتیں بھی ہیں جو پردہ کرتی ہیں۔ ایسی عورتیں بھی ہیں جو سب کے سامنے آتی ہیں اور ایسی عورتیں بھی ہیں جو مردوں کی نظر سے پوشیدہ رہنا چاہتی ہیں۔

عورتوں کی تحریک کے حوالے سے سب سے زیادہ جاندار فلم اب تک جو سامنے آئی ہے وہ لزی بورڈن کی فلم Born in Flames ہے۔ اس فلم کے واقعات مستقبل قریب کے ایک ایسے شہر میں پیش آتے ہیں جو مین ہٹن جیسا ہے۔ فلم کا انداز سائنس فکشن جیسا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ عورتوں نے معاشرتی انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اس انقلاب کو دس سال ہو چکے ہیں لیکن اب وہ انقلاب زوال پذیر ہے کیوں کہ زوال پزیر ہے؟ فلم میں اس کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ کس طرح بائیں بازو نے بھی عورت اور اس کے مسائل کو نظرانداز کیا۔ فلم میں مردوں کی برتری کا دور واپس آ رہا ہے تو تمام طبقوں اور تمام نسلوں کی عورتیں اکٹھی ہو کر اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ان میں کالی عورتیں ہم جنسی کی شوقین عورتیں تنہا رہنے والی مائیں، سیاسی کارکن اور پنک مل کر اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ مقابلہ جنس تفریق کو نظرانداز کر کے نہیں بلکہ اسے تسلیم کر کے کیا جاتا ہے۔

بورڈن کی یہ فلم اپنے تماشائیوں سے عورت بن کر مخاطب ہوتی ہے۔ اس کا مبہم بیانیہ، تیز رفتار شاٹس، ساؤنڈ کا سلو مونتاژ، آوازوں اور مکالموں کی زبان کی رنگا رنگی، اور کہانی کی دانستہ سائنس فکشن والی شکل تماشائیوں کو ایک نیا مقام عطا کرتی ہے انہیں موضوع فراہم کرتی ہے۔ میرے نزدیک اس میں "فرق کو ایک فرق" کے ساتھ

دکھایا گیا ہے۔ اس میں عورتوں کے اپنے اندر کا تضاد بھی ابھارا گیا ہے۔

یہ فلم میرے ساتھ ایک عورت اور عورتوں کی تحریک کی ایک کارکن کی حیثیت سے مکالمہ کرتی ہے۔ ایسی عورت جو تاریخ کے ایک خاص لمحے میں زندہ ہے۔ فلم کے واقعات اور تصویریں سائنس فکشن کے اصطلاح میں ایک "متبادل دنیا" میں سامنے آتی ہیں۔ ایک ایسے زمانے اور ایسے وقت میں جو کہیں اور ہے لیکن اپنا ہی زمانہ اور اپنا ہی وقت معلوم ہوتا ہے جیسے میں (اور تمام عورتیں) ایک ایسے کلچر میں زندہ ہیں جو اپنا ہے بھی اور اپنا نہیں بھی ہے ایسی محال مگر ممکن دنیا میں عورتیں ایسی جدوجہد کے لئے اکٹھی ہوتی ہیں جو انہیں منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ اس طرح یہ فلم میرے اور دوسرے تماشائیوں کے اندر اپنی شناخت کا احساس اجاگر کرتی ہے۔ یہ مجھے ایک مقام دیتی ہے۔ میری اپنی تاریخ میری ذات اور میری سیاست کے تضادات سامنے لاتی ہے اور میرے اندر جو تضادات ہیں انہیں نمایاں کرتی ہے۔

ہیلن فیہرویری نے جرمن فلموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخ اور معروضی عمل کے درمیان رشتہ تلاش کرنے کا مطلب تاریخ کی صداقت کو کسی موضوع شے کی طور پر اپنی گرفت میں لینا نہیں ہے بلکہ اس طرح تجربہ کی سچائی تلاش کرنا ہے۔ یہ سچائی، خود شناسی اور اس کی اپنی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ ہماری تاریخ اور ہمارا تجربہ کس طرح مختلف ہے؟ ہمارا شعور کیونکر علیحدہ ہے؟ یہی وہ باتیں ہیں جنہیں عورت کی فلم پیش کرتی ہے۔ اس عمل میں بقول ٹونی موری سن کچھ اور ہی تخلیق ہوتا ہے۔ اس فلم کی دونوں ہیروئنیں دریافت کرلیتی ہیں کہ وہ ہر قسم کی آزادی سے محروم ہیں اس لے انہیں ایک نئی دنیا تخلیق کرنی ہے۔

عورتوں کی تحریک کی کامیابی نے مردوں کو بھی اس قسم کی فلمیں بنانے پر اکسایا۔ یہ فلمیں مالی اعتبار سے بھی کامیاب رہیں۔ ان میں

Places in the heart اور Liana, Personal Best, silk wood, frances.

ایسی ہی فلمیں ہیں لیکن یہ فلمیں عورتوں کی تحریک کو زیادہ ہی سادہ بنا کر پیش کرتی ہیں۔

وہ ایسے مباحث چھیڑتی ہیں جو شریف مردوں کے لئے ہی قابل قبول ہیں۔ ان فلموں میں جنسی فرق کو معاشی اختلاف کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔ اسے نسوانی آزادی یا فیمینزم کے بجائے انسان دوستی کا رنگ دے دیا گیا ہے۔

آزادی نسواں کو نسل یا طبقے کے ساتھ وہ عورتیں بھی جوڑتی ہیں جو جو مساوی مواقع حاصل کرنے والی نہیں ہوتیں بلکہ ان مواقع کا شکار ہوتی ہیں۔ اس تحریک کے جاندار کردار وہ ہیں جو لبرل فیمینزم کے دھوکے میں نہیں آتے اور جو جانتے ہیں کہ فیمینزم اپنے تمام تضادات کے باوجود اگر سیاسی اور ذاتی آزادی کا سوال نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں۔ میرے خیال میں عورت کے سینما میں اپنے آپ کو دوبارہ دیکھنے اور اپنے بارے میں نئے سرے سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ عورتوں کی فلموں میں اس سمت میں پوری طرح قدم نہیں اٹھایا گیا۔

فلم Born in Flames آزادی نسواں کی تحریک کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس میں عورتوں کے مسائل کو نسل، رنگ، زبان اور طبقوں کے حوالے سے بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے درمیان ایک فرق ان کے اپنے اندر کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس فرق کے باوجود فیمینزم برقرار رہتا ہے۔ فلم کو دیکھ کر جو تصور ابھرتا ہے وہ عورت کے موضوع کا تنوع اور مسلمہ سماجی ماڈل سے اس کی دوری اور عورتوں کے اندرونی تضاد کا تصور ہے۔

اس فلم کے علاوہ جن فلموں میں موثر طور پر اندرونی فرق، زبان، کلچر اور ذات کے فاصلے کو پیش کیا گیا ہے ان میں

Absence of malice, network, Underfire شامل ہیں۔ لیکن بورڈن کی فلم ان سب سے اعلیٰ اور بلند ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فلم میں میرا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہر عورت اس میں اپنی شناخت کر سکے۔ اس کی فلم میں کالی عورتیں سفید فام عورتوں کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ دعوت دیتی ہیں کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر کام کرو۔

میرے خیال میں عورتوں کی فلموں میں ایک خاص تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلی جدیدیت یا واں گارد جمالیات کی پیش کش کے ساتھ اس انداز کی فلمی پیش کش پر

بھی توجہ دیتی ہے جس پر جمالیات کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آپ آرٹ کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ فلم میں کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ تماشائی کو اپنے ساتھ کیسے شریک کیا جائے۔ فلموں میں تماشائیوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی روایت بالکل نئی بھی نہیں ہے کیونکہ بریشت اور پرانڈیلو کے ڈرامے بھی فلموں میں پیش کئے جا چکے ہیں البتہ یہاں تماشائیوں کے مختلف گروہوں اور طبقوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

بورڈن نے اپنی فلم میں مکالمے اور خاموشی کے لمحات اس انداز میں پیش کئے ہیں کہ ہر سطح کا تماشائی اپنی سطح کے لحاظ سے اس سے لطف لے سکتا ہے۔ اس میں موسیقی کو بول چال کی زبان کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ نقادوں نے اسے اس لئے ترقی پسند فلم قرار دیا ہے کہ وہ دیکھنے والوں کو پریشان کرتی ہے اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ فلم میں آگ سے ابھرنے والی عورت جب اعلان کرتی ہے کہ ''کالی عورتوں تیار ہو جاؤ' سرخ عورتوں تیار ہو جاؤ' گوری عورتوں تیار ہو جائے ہوشیار ہو کہ ہمارا زمانہ آگیا ہے'' تو فلم دیکھنے والی ہر عورت محسوس کرتی ہے کہ صرف اسے مخاطب کیا جا رہا ہے۔

فلم کی تاریخ میں ایسا ہی ایک موقع اس سے پہلے بھی آچکا ہے جب ڈرو تھی ایزنر کی فلم Dance Girl Dance کی ہیروئن اسٹیج پر گانا گاتے گاتے نیچے اتر آئی تھی اور اس نے عورت کی حیثیت سے حاضرین اور تماشائیوں کو مخاطب کیا تھا۔ یہ بظاہر فلم کی مسلمہ تیکنیک کے خلاف ہے لیکن اس سے لوگ پریشان ہوتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسی فلموں میں یہ بات بھی مدنظر رکھی جاتی ہے کہ خواتین فلم کو کیسے دیکھتی ہیں؟ وہ فلم میں اپنی شناخت کیسے کرتی ہیں؟ فلم کا مخاطب عورت بحیثیت عورت اور مختلف طبقوں اور نسلوں کی عورت ہوتی ہے۔ فلم میں عورت کو جس طرح پیش کیا جاتا ہے اس کے بارے میں ایکو مان کہتی ہیں۔ ''میرے لئے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ عورت کے جسم کو اس طرح فلمایا جائے جیسے پہلے نہیں فلمایا گیا۔ میں عورت کو اپنے نظریہ اور موقف کے ثبوت کے طور پر پیش کرتی ہوں۔ میں اشیا کو وہ مقام دیتی ہوں جو پہلے کبھی نہیں دیا گیا۔ اگر آپ کسی تاثر یا عمل کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو اس کا مطلب

یہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔"

جنس کی تخصیص کے ساتھ عورت کی جو فلم بنائی جا رہی ہے اس میں ایک نئی سوسائٹی اور نیا کلچر تخلیق کرنے پر زور دیا جا رہا ہے زبان اور کلچر میں عورت کے اعتبار سے جو تضاد موجود ہے اسے پیراڈاکس یا قولِ محال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ عورت کو سماجی موضوع بنانے کے لئے ہم جو اصطلاحیں استعمال کرتے آ رہے ہیں انہیں ان فلموں میں توڑا جا رہا ہے۔ ایسے بصری پیکر پیش کئے جاتے ہیں جو ان تمام چیزوں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ ہم عورت کے جسم کو مروجہ جمالیات تک سے عاری کر کے پیش کرتے ہیں۔ ہم تشدد سے جنس کو خارج کرتے ہیں اور بیانیہ کو منقطع کرتے ہیں۔ اس پیش کش کی بنا پر بھی انہیں عورتوں کی فلمیں کہا جاتا ہے۔

اب ہم بووینشن کے اس سوال کی طرف پھر آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ کیا کوئی نسوانی جمالیات بھی ہوتی ہے؟ اس کا جواب ہم اس طرح دیتے ہیں کہ ہم ان موضوعات کو جس طرح پیش کرتے ہیں انہیں جمالیات سے زیادہ "رد جمالیات" کہا جا سکتا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ لفظ آپ کو اچھا لگتا ہے یا برا۔

ٹریشا ڈی لاریٹس نے جن فلموں کا ذکر کیا ہے اور عورتوں کی فلم میں جن تحریکوں کا حوالہ دیا ہے وہ تمام مغربی فلمیں ہیں۔ اگر ہم اپنی فلموں پر (جن میں پاکستان اور ہندوستان دونوں کی فلمیں شامل ہیں) غور کریں تو خاصی مایوسی ہوتی ہے۔ اول تو ہمارے ہاں فلم ساز خواتین کی تعداد ہی اتنی زیادہ نہیں ہے (مغرب میں بھی بہت زیادہ نہیں ہے دوسرے خواتین فلم سازوں یا ڈائریکٹروں نے جو فلمیں بنائی ہیں ان میں مردوں کی فلموں کے فارمولے کو ہی دہرایا گیا ہے بلکہ ان میں جذباتیت کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ ان فلموں میں عورت کو کچھ اتنا مظلوم بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ہمدردی کے بجائے کراہت سی ہونے لگتی ہے۔ ان کے ہاں عورت دیوی ہے یا پھر چڑیل اس کے بیچ میں کوئی چیز نہیں ہے۔ عورت کے اپنے مخصوص مسائل، معاشرہ کے عام مسائل سے ہٹ کر کچھ نہیں ہیں۔ مردوں کی فلموں میں بھی عورت کو یا تو "صاحب بی بی اور غلام" والی عورت بنا دیا گیا ہے یا پھر ڈائن اور بے وفا چالباز ویمپ، بعد کی فلموں میں عورت کی بغاوت بھی

نظر آتی ہے لیکن یہ بغاوت عورت کے اپنے مسائل سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ ایسے مسائل سے متعلق ہوتی ہے جو مردوں کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پاکستان میں شمیم آرا اور سنگیتا وغیرہ نے فلمیں بنائی ہیں لیکن ان کا موضوع کسی طرح بھی مردوں کی فلموں کے موضوع سے مختلف نہیں رہا۔ فلم سازی کے شعبے سے جو لوگ وابستہ ہیں وہ مرد ہوں یا عورتیں ہمارے ہاں وہ شعور کی اس سطح کو پہنچے ہی نہیں ہیں کہ عورت کو بحیثیت عورت اپنا موضوع بنا سکیں۔ پاکستان میں فلم کے متوازی ٹی وی ڈرامہ ہے اور ڈرامہ لکھنے والی کئی خواتین بہت مقبول ہیں۔ ان کے ڈرامے بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن ایک آدھ ڈرامہ کے سوا عورت کے اپنے مسائل پر بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ حسینہ معین نے عورت کو کھلونا بنا دیا ہے اور فاطمہ ثریا بجیا نے ستی ساوتری' نورا لھدیٰ شاہ نے کہیں کہیں عورت کے مسئلے کو چھونے کی کوشش کی ہے لیکن وہ بھی جاگیردارانہ ماحول کی عکاسی سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔

عورت اور ڈرامہ

شعیب ہاشمی

اگر کوئی ہونہار اور باصلاحیت ایکٹریس کسی ڈرامہ میں اپنے لئے عظیم کردار تلاش کرنا چاہے تو اسے گنتی کے ہی ایسے ڈرامے ملیں گے۔ اچھی ایکٹریس ایسے رول کرنے کو ترستی ہی رہتی ہیں۔ البتہ مرد ایکٹر کے لئے ایسے رول اتنے ہیں کہ وہ نوجوانی سے بڑھاپے تک جتنے چاہے کرسکتا ہے۔ وہ نوجوانی میں رومیو' مرکیوشس اور سر جیس سے شروع کر کے اگلے تیس سال تک ہیملٹ اور سٹینلے کووالسکی کا رول کرسکتا ہے۔ پھر بڑھاپے میں میک اپ کئے بغیر وہ پروسپیرلوس اور کنگ لیئر کا رول کرسکتا ہے۔ اب رہی ایکٹریس کی بات تو ابھی وہ نصف درجن رول ہی کرپاتی ہے کہ گنتی ختم ہوجاتی ہے اور اسے خدا سے دعا مانگنا پڑتی ہے کہ کوئی اس کے لئے Prime of Miss Jean Brodie لکھ دے۔

اس کی وجہ یہ بتائی جاسکتی ہے کہ خاتون ڈرامہ نگاروں کی تعداد ہی کتنی ہے۔ لے دے کہ ایک نام لیلین ہیلمن کا ہی ذہن میں آتا ہے۔ ڈرامہ تو مرد کی جاگیر ہے اور وہ مرد کے لئے ہی لکھتا ہے۔ اگر ایکٹریس کو اس میں کوئی اچھا رول مل جاتا ہے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اسے اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ مگر یہ کوئی جواز نہیں۔

اوپیر اور بیلے کو ہی لیجئے۔ انہیں تخلیق کرنے والی خواتین نہیں ہیں پھر بھی ڈرامہ کی ان جڑواں بہنوں میں خاتون کردار ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ مرد ان کے پیچھے پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔ اگر نورے -ییف اور برشنیکوف سوویت یونین سے فرار ہوکر مغرب میں نہ پہنچتے تو ان کی شہرت بھی اتنی ہی ہوتی جتنی بالشوئی اور کیروف بیلے کے دوسرے مرد فنکاروں کو حاصل ہوئی ہے۔ وہ پریما بیلے رینا کے ساتھ ناچنے والے ہی کہے جاتے۔ نئے ناموں میں ڈومنگو اور پاوا روتی نے شہرت حاصل کی ہے لیکن وہ جن بیلیز میں کام کرتے

ہیں ان کے نام عورتوں کے نام پر ہیں۔ یعنی کارمن، آئیدا اور لیڈی کیمیلاس ـــــ اوپیرا میں عظمت کا نشان "دیوا" ہے "ٹینر" نہیں ہے۔

ہم اس وقت ایسے دور سے گزر رہے ہیں جو خالص عقل و خرد کے دور کو پار کر چکا ہے اور ویمن لب کی تحریک سے گزر رہا ہے۔ اس نے صورتحال میں ایک نیا بعد پیدا کیا ہے۔ اب ہمیں صرف یہ نہیں دیکھنا ہے کہ عورت کے رول کا "سائز" کتنا ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ "کیریکٹر" کیا ہے۔ اب عظیم رول کو سمجھنے کے لئے ہمیں نئی زبان اختراع کرنا پڑے گی۔

اس کسوٹی پر اگر پرکھا جائے تو ڈرامہ کی دنیا کی صورت حال کچھ زیادہ خوش کن نظر نہیں آتی۔ آج تک عورت کے کردار میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ "ہیروئن" کا لفظ غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیرو تو اپنی انتہائی بری شکل میں بھی "درد و کرب میں ڈوبا" ہیرو ہوتا ہے۔ وہ کتنی ہی مشکل میں ہو ہمیشہ کامیاب و کامران ہی ٹھہرتا ہے۔ مگر عورت کے جو رول لکھے گئے ہیں وہ اپنی عظمت میں بھی "ٹریجک ہیروئن" سے زیادہ بلند نہیں ہوسکے جو دوسرے لفظوں میں مصیبت زدہ عورت ہوتی ہے اور آج کل ایسی مصیبت زدہ عورت اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔

دوسری بہت سی اچھی چیزوں کی طرح یہ سلسلہ بھی یونان سے ہی شروع ہوا ہے۔ کم سے کم عظیم کرداروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو یونانی دوسرے لوگوں سے بہت آگے ہیں۔ یونانی ڈرامے نے عورت کو بلند کردار دیئے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اوپر جس ٹریجک ہیروئن کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یونان سے ہی آئی ہے۔ ہاں، ایک ڈرامہ ایسا ہے جس میں عورت کا مثبت کردار نظر آتا ہے اور وہ ہے کامیڈی، ارستو فیس کے ڈرامہ کی "لوستراتا" ایک شاندار اور زندہ رہنے والا کردار ہے۔ یہ ڈرامہ ان بہادر عورتوں کی کہانی ہے جو اپنے مردوں کی جنگوں سے تنگ آچکی ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف اپنا آخری اور موثر حربہ استعمال کرتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ اس وقت تک بستر پر جانے سے انکار کردیتی ہیں جب تک وہ لڑائی بند نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑا ڈرامہ اور بڑا کرداز ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں عورتوں کی کوئی بھی انجمن اسے اپنا نصب العین نہیں بنائے گی۔ اب جہاں تک باقی ڈراموں کا تعلق ہے۔ وہ عظیم ڈرامے ضرور

ہیں مگر المیہ ہیں۔

عظیم المیہ ڈراموں میں عورت نصیبوں کی ماری ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی قسمت پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان یہی بڑا فرق ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کے کرداروں میں جس عورت کا کردار سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے وہ ایڈ یپس کی ماں' بیوی یوکاستا کا کردار ہے۔ یہ کردار خالص ہیروئنک یا مردانہ کردار ہے۔ ڈرامہ کا نام ایڈ یپس ریکس ہے لیکن یوکاستا ایڈ یپس کو ایک ویمپ بنا دیتی ہے۔ اگر آپ یہ ڈرامہ دیکھ کر یوکاستا کے کردار کی تعریف کرتے باہر نکلیں تو اس کی وجہ اپنی نفسیات میں ہرگز تلاش نہیں کرنا بلکہ اسے کردار کی اپنی خوبی جاننا۔

یونانی ڈرامہ کو جو چیز عظیم بناتی ہے وہ یونانیوں کی انسان دوستی ہے۔ بدقسمتی یقیناً خداؤں کی طرف سے ہی نازل ہوتی ہے لیکن اس کا وسیلہ انسان بنتا ہے۔ انسان کا یہ عمل اسے دیوتا کے درجہ تک بھی پہنچاتا ہے۔ وہاں انسان بھی دیوتا ہیں۔ یونان کے زوال کے بعد جب یہ شمع دوسرے لوگوں کے سامنے آئی تو یہ دیوتا اپنے الوہی درجہ سے گر گیا اور انسان بن گیا۔ جب رومن بھی بساط عالم سے باہر ہوئے تو وہ اور بھی نچلے درجہ تک جا پہنچا۔ جو عمل اور جو چیزیں آسمانی اور الوہی تھیں وہ توہم بن گئیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی یہی عمل جاری تھا۔ اگرچہ اس کی سطح مختلف تھی عورتوں کے لئے ڈرامہ "شکنتلا" کی سب سے بڑی دین ہو سکتی ہے کہ اس کا نام عورت کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس ڈرامہ میں مرد دیوتاؤں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں۔ مہابھارت اور رامائن انسانی تہذیب کے آبدار موتی ہیں۔ ان میں موجود عورتیں پاکیزگی' شرافت اور حسن کا نمونہ ہیں۔ لیکن یہ شرافت اور یہ پاکیزگی اس کے لئے ہے کہ وہ مردوں کی بدنصیبی میں اس کا ساتھ دے رہی ہیں۔

مسلم تہذیب کو تو ڈرامہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ ان کے ہاں ڈرامہ کے بجائے ڈرامائی کیفیت شاعری میں پیدا کرلی جاتی تھی۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ مجنوں کی لیلیٰ' فرہاد کی شیریں' وامق کی عذرا' پنوں کی سسی اور رانجھے کی ہیر ہی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے۔ ادھر مغرب میں بھی ایک ہزار سال تک حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا ڈرامہ ہی کھیلا جاتا رہا۔ جسے "پیشن پلے" کہا جاتا ہے۔

پیشن پلے بنیادی طور پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی سوانح اور کارناموں کو بیان کرتا ہے۔ پیشن پلے اسکینڈے نیویا اور جرمنی کے بعض حصوں میں آج بھی لوک تماشہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس میں پورا پورا گاؤں حصہ لیتا ہے۔ یہ ڈرامہ چوبیس گھنٹے سے دس دس دن تک جاری رہتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں پادریوں نے اس سے بہت کام لئے اور بہت سی ادبی اور فنی تخلیقات بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ اس کی کہانی خالصتاً مردانہ کہانی ہے۔ جدید نقادوں کا خیال ہے کہ اس میں کنواری مریم اور مغالینا کے کردار اس لئے شامل کر لئے گئے تھے کہ بت پرستوں کو ان میں زمین کی دیوی گائیا، گھر کی دیوی ولیستا، اشتر اور سیلینا کی کمی محسوس نہ ہو۔ ان میں بھی عورتیں کوئی ڈرامائی کردار ادا نہیں کرتیں بلکہ وہ کہانی کی روحانی ضروریات پوری کرنے کے لئے مرد کا سایہ ہی دکھائی دیتی ہیں۔

ہندوستان میں رامائن کو رام لیلا اور دسہرہ بنا کر ایک قسم کا "پیشن پلے" بنا لیا گیا۔ ہندوستان کی تہذیب چونکہ خالص ارضی تہذیب ہے اس لئے اس میں ناچ گانے اور کھیل تماشے بھی شامل ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی عورتیں محض کٹھ پتلی ہیں۔ سیتا ایک سچی اور وفاشعار عورت اور بیوی ہے۔ یشودھرا اپنے بیٹے کے لئے ہر وقت آنسو بہانے والی ماں ہے۔ کیکئی نہایت چالاک اور مکار سوتیلی ماں ہے۔ اس کہانی میں اصل عورت ایک ہی ہے اور وہ ہے سروپ ناکھا جو رام کو پھسلانے کی کوشش کرتی ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اسے اس کا صلہ یہ ملتا ہے کہ اس کی ناک کاٹ لی جاتی ہے۔

جو لوگ تقسیم کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے پڑوسی کی ماں کی گود میں بیٹھ کر رامائن نہیں سنی ان کے لئے کہانی کا خلاصہ پیش کرنا ضروری ہے۔ پھر یہ کہانی اس ایدھیا کی ہے جہاں حال ہی میں بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے۔ اور ہزاروں آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ہاں، تو رام ایودھیا کے راجہ سرتھ کا بڑا بیٹا ہے جو پہلی بیوی یشودھرا سے ہے اس لئے وہ ولی عہد بھی ہے۔ دشرتھ کی دوسری بیوی کیکئی ہے جو نوجوان اور زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں لچھمن اور شترگھن۔

رام سیتا سے شادی کرتا ہے جو عصمت و عفت کا نمونہ ہے۔ سوتیلی ماں اپنی مکاری سے راجہ کو قابو کرتی ہے اور رام کو چودہ برس کا بن باس دلا دیتی ہے۔ رام ایک

سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کا کہا مانتا ہے اور جنگل کی راہ لیتا ہے۔ سیتا بھی پتی ورتا بیوی کی طرح اس کے ساتھ جاتی ہے۔ لچھمن بھائی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ بھی ساتھ ہو لیتا ہے۔ میں نے اپنے پڑوسی کی ماں کی گود میں بیٹھ کر یہی کہانی سنی تھی۔ اگر اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو آپ اسے ٹھیک کر لیجئے۔

دوسرے عظیم المیہ ڈرامہ "مہابھارت" میں عورتوں کا حشر اس سے بھی برا ہوتا ہے۔ پانچ پانڈو بھائیوں سے سب سے بہادر بھائی نے درو پدی کو جوئے یا مقابلے میں جیتا ہے۔ وہ اسے تحفہ بنا کر اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ماں حکم دیتی ہے کہ اس میں پانچوں بھائیوں کا حصہ ہونا چاہئے۔ پانچوں بھائی ماں کا کہا مان لیتے ہیں۔ درو پدی بھی نہایت فرمانبرداری بلکہ خوشی کے ساتھ یہ بندوبست قبول کر لیتی ہے۔ لیکن پانڈو اسے پھر جوئے میں ہار جاتے ہیں۔ معلوم نہیں آج کی ہندوستانی عورت درو پدی کے کردار کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ اسی کے لئے اس ڈرامہ کو مذہبی کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

خیر یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔ ہم ڈرامہ میں عورت کے کردار کی پیش کش کی بات کر رہے تھے۔ ڈرامہ پر کتنی ہی سرسری بات کی جائے بیچ میں شیکسپیئر ضرور آجائے گا۔ کیونکہ آدھے سے زیادہ ڈرامہ تو شیکسپیئر ہی ہے۔ شیکسپیئر کی عورتوں سے مراد' این ہیتھوے یا مشہور ڈارک لیڈی ہرگز نہیں ہے۔ این اس کی بیوی تھی اور ڈارک لیڈی کون تھی؟ اس پر ابھی تک بحث چل رہی ہے۔ شیکسپیئر کے سانیٹ انگریزی کی بہترین عشقیہ شاعری مانے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اس کا ذرا سا بھی ثبوت نہیں ہے کہ شیکسپیئر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا تھا۔ ہم نے خود ہی یہ کمی اس طرح پوری کی ہے کہ ایک "ڈارک لیڈی" دریافت کر لی ہے۔ اور اسے سانیٹ کا مخاطب قرار دیدیا ہے ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض افواہوں کے مطابق بعض سانیٹ شیکسپیئر نے اپنے مربی ارل آف ساؤ تھمٹن کے لئے لکھے تھے۔ کہتے ہیں کہ موصوف خاصے بدشکل تھے۔ بہرحال شیکسپیئر کے سامنے کوئی کالی یا گوری عورت نہیں تھی۔

شیکسپیئر کے زمانے میں تھیٹر میں عورت کا کردار مرد ہی کرتے تھے۔ کئی ایسی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ مرد عورت کا لباس پہن رہے ہیں اور مرد عورت کا۔ اس

سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے ڈراموں میں لڑکا، لڑکی، بھائی بہن اور نوجوان مردوں کے اتنے جوڑے کیوں ہیں۔ خیال یہی ہے کہ ان دنوں وہاں دو نوجوان مرد اچھے ایکٹر ہوں گے جن کے لئے کردار تخلیق کئے جاتے ہوں گے۔ پھر وہاں زنخے بھی ضرور ہوں گے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ وہاں ایسی عورتیں نہیں تھیں۔ جو بڑی سٹار بھی ہوں اس لئے ڈرامہ نگار ان کے لئے کردار تخلیق کرنے پر مجبور نہیں تھا۔

شیکسپئر بلا کا ذہین تھا۔ وہ جس چیز پر ہاتھ ڈالتا اسے سونا بنا دیتا۔ اس نے ڈراموں میں عورتوں کے جو کردار پیش کئے ہیں وہ اپنی جگہ عظیم کردار ہیں۔ آج بھی ڈرامہ میں عورت کا کردار پیش کیا جاتا ہے تو شیکسپئر کے کردار ہی سامنے رکھے جاتے ہیں۔ ہم یہاں عورت کے کردار کے "سائز" کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ عورت کے رول کی بات کر رہے ہیں اور اس معاملے میں وہ عظیم ڈرامہ نگار بھی ہمیں مطمئن نہیں کرتا ہر چند وہ دوسروں سے بہت بہتر ہے۔ شیکسپئر کے ڈراموں کی کرداری عورتیں بہت عظیم ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ عظیم عورتیں بھی ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے لیڈی میک بیتھ ذہن میں آتی ہے۔ وہ ایک طاقتور اور خونخوار عورت ہے جو سارے ڈرامے پر چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی طاقت اپنے لئے نہیں ہے، شوہر کے لئے ہے۔ کیونکہ اگر وہ کامیاب بھی ہو جاتی تو ظاہر ہے خود تو بادشاہ نہ بنتی، پھر بھی وہ بادشاہ کا دست و بازو ہی بنی رہتی۔ چنانچہ یہ عورت جو ہمارے دل و دماغ پر ورا گو کا پیکر تراشتی ہے عورت کی عورت ہی رہتی ہے۔

ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے۔ شیکسپئر کے چالیس ڈراموں میں سے ایک بھی ڈرامہ ایسا نہیں ہے جس کا نام کسی عورت کے نام پر رکھا گیا ہو۔ ڈراموں کے ناموں میں صرف تین عورتوں کے نام آتے ہیں۔ جولیٹ، کلوپیٹرا اور کریسڈا (آپ اس ڈرامہ کو نہیں جانتے ہوں گے۔ سمبالین بھی عورت کا نام ہی محسوس ہوتا ہے لیکن وہ دراصل ایک انگریز بادشاہ کے نام کے غلط ہجے ہیں۔) پہلے دونوں رول یقیناً عظیم رول ہیں۔ جیولیٹ کا رول تو اتنا شاندار اور ایسا انوکھا رول ہے جس کی کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔ اس رول نے بے شمار نسلوں سے نئی ایکٹریسوں کو صرف "رونمائی" کا موقع ہی فراہم نہیں کیا ہے بلکہ پورے اوپیرا کو بھی متاثر کیا ہے اور پیٹریوٹینوف کو "رومانوف اینڈ جیولیٹ"

جیسی فلم بنانے پر اکسایا ہے۔ لیکن —— جیولیٹ کی جو خوبصورتی اور کشش ہے اور جس پر رومیو مرمٹا ہے وہ معصومیت اور عنوان شباب کی کشش ہے اس سے اس کردار کی ذہنی بلندی یا کردار کی عظمت کا تاثر نہیں ملتا۔ اور ہم اس کی توقع بھی نہیں کرتے۔ اور آخر جیولیٹ کی یہ خوبصورتی اور کشش تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

کلوپیٹرا میں چالاکی اور کردار کی مضبوطی کا تاثر موجود ہے وہ دو پٹولیموں اور ایک سیزر کو بھگتاتی ہے پھر بھی عمر اس کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ رسم و رواج اور اس کی تلون مزاجی بھی اسے کچھ نہیں کہتے، حتیٰ کہ وہ مارک انٹنی کو بھی بیوقوف بناتی ہے۔ یہ نسوانی طاقت جیولیٹ کے معصوم چونچلوں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ شیکسپئر اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے اسے عظیم کردار تو بناتا ہے لیکن اسے ایسی عورت نہیں بناتا کہ آپ اسے اپنی بہو بنانا پسند کریں۔

ہاں ایسی عورتیں بھی ہیں جن میں سے آپ اپنی بہو بنا سکتے ہیں۔ مثلاً اوفیلیا ہے جو باپ بھائی اور ملکہ بادشاہ سب کی منظور نظر ہے بلکہ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہیملٹ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرامہ نگار کا کمال ہے کہ اسے سب کی توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ڈرامہ میں وہ خود کوئی ایسا کام نہیں کرتی کہ اسے یہ درجہ دیا جائے۔ ڈیسڈیمونا کے بارے میں تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہم اوتھیلو کے المیئے کے سارے اسباب دل سے قبول کرتے ہیں لیکن یہ شک بہرحال رہتا ہے کہ آخر ڈیسڈیمونا میں کونسی ایسی خوبی ہے کہ وہ اس سارے المیہ کا سبب بنی؟

The Taming of the shrew میں کیٹ ایسی حاضر دماغ، لڑاکا اور بدمزاج عورت ہے جسے ہر مرد زبردستی قابو میں لانا ضروری جانے گا۔ کورڈیلیا بھی اپنی بہنوں ریگن اور گونیرل کے مقابلے میں عام سی ویمپ ہی نہیں ہے۔ اس کی دونوں بہنیں زیادہ طاقتور اور زیادہ مضبوط ہیں۔ سب سے ظالم ویمپ ہونے کا سہرا رچرڈ 111 میں لیڈی این کے سر جاتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے منہ پر تھوکتی ہے، اسے خوب برا بھلا سناتی ہے مگر پھر نہایت چالاکی کے ساتھ اس کے بستر میں گھس جاتی ہے حتیٰ کہ وہ جانی دشمن بھی حیرت زدہ ہو کر سوچتا ہے۔

Was ever a woman in such humor wooed? was ever a

woman in such humor won?

اور پھر پورشیا بھی ہے بروٹس کی پورشیا نہیں جو جولیس سیزر میں ہے اور جو عصمت و عفت اور وفاداری کا اعلیٰ نمونہ ہے کیونکہ شیکسپئر ہمارے سامنے اسے ایسے ہی پیش کرتا ہے اور اس کا یقین بھی دلا دیتا ہے۔ ہم دوسری پورشیا کا ذکر کر رہے ہیں۔ جو مرچنٹ آف وینس میں ہے۔ کچھ کرنے سے پہلے وہ شیکسپئر کے مردانہ کرداروں میں سے نہایت معمولی اور جذباتی کردار بسانیو کے لئے آہیں بھرتی نظر آتی ہے حالانکہ اس سے اس کی ایک ہی ملاقات ہوتی ہے۔ ڈرامہ میں شادی کے امیدواروں کو تین صندوقچوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ ایک میں سونا دوسرے میں چاندی اور تیسرے میں سیسہ ہے۔ صحیح انتخاب کرنے والے کو پورشیا مل جائے گی۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ مقابلہ صرف جعلی ہی نہیں لگتا احمقانہ بھی لگتا ہے۔ اگر کوئی چھوٹا موٹا ڈرامہ نگار ایسا منظر لکھتا تو وہ نہایت ہی گھٹیا واقعہ بن جاتا۔ پورشیا عدالت کے اس منظر میں نہایت ہی نازک کردار ادا کرتی ہے جو آج تک پیش کئے جانے والے عدالت کے منظروں کا باوا آدم ہے۔ عورت کی چالاکی اور ذہانت کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے اور شیکسپئر کی مشہور تقریروں میں سے ایک تقریر وہی کرتی ہے۔ —— "THe Quality of Mercy" لیکن اس تقریر سے پورشیا کے کردار کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ اس سے اس کا مخالف کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ پورشیا تو ایک آلہ ہے جسے کسی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس ڈرامہ میں تو شیکسپئر کی عظیم ترین تخلیق شائلاک ہے جو مرد ہے۔ اس کا کردار ہی سب پر چھایا ہوا ہے۔

اب دیکھئے فطرت نے بھی تو اپنی بخششوں اور نوازشوں میں کسی قسم کی مساوات کا خیال نہیں رکھا میرا مطلب ہے ذہنی اور جسمانی دونوں سطحوں سے ہے۔ اپنے نظام شمسی پر ہی غور فرمائیے۔ اس نظام میں ہمارا سورج اور اس کے نو سیارے شامل ہیں۔ ننانوے فیصد سے زیادہ مادہ تو سورج میں ہی مرتکز ہے باقی معمولی سا حصہ باقی سیاروں کو ملا ہے ان میں ہماری زمین بھی شامل ہے۔ اس حصے میں بھی توازن کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ نو میں سے بھی پانچ سیارے (ہماری زمین سمیت) بالکل ننھے منے سے ہیں ان کے مقابلے میں دوسرے سیارے بڑے ہیں اور "جوپیٹر" تو زمین سے ہزار گنا سے بھی

زیادہ بڑا ہے۔

اسی لئے کسی نے بڑے مزے کی بات کی تھی کہ اگر کائنات میں کسی اور جگہ کوئی مخلوق رہتی ہے اور اس کے ترقی یافتہ سائنس دانوں نے ساری کائنات اور اس کی موجودات کا نقشہ بنا لیا ہے تو انہوں نے ہمارے نظام شمسی کو ایک معمولی سی چیز قرار دیا ہوگا اور لکھا ہوگا کہ اس کا ایک ذرا سا بڑا سیارہ سورج ہے اور اس کے بعد اگر کوئی قابل ذکر سیارہ ہے تو وہ "جوپیٹر" ہے۔

اگر اس سے آپ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں تو چلیئے میں اپنے نشتر کا رخ موڑے لیتا ہوں۔ ڈرامہ کی کل کائنات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ سب سے بڑا سیارہ تو شیکسپئر ہی ہے باقی چھوٹے موٹے سیارے ہیں یا پھر ستاروں کی ٹوٹی پھوٹی کرچیاں ہیں۔ اس سے مولیئر، بریشت، یوری پائیڈز، سوفوکلیس یا پھر اونیل اور ٹینسی ولیمز کی تحقیر ہرگز متصور نہیں ہے۔ یہ تو محض روشنی کے عظیم مینار کو ہم فانی انسانوں کی طرف سے خراج تحسین پیش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ وہ شخص عظیم ڈرامہ نگار تھا، عظیم شاعر تھا اور عظیم زبان دان تھا۔

شیکسپئر کے ہاں زبان کا جو شکوہ نظر آتا ہے وہ بائبل کے سوا اور کسی تحریر کو نصیب نہیں ہوا۔ اور بائبل کا بھی وہ ترجمہ جو کنگ جیمز کا مصدقہ ترجمہ ہے۔ ویسے میرے نزدیک یہ موازنہ اس لئے منصفانہ نہیں ہے کہ بائبل کے ساتھ مذہبی تقدس بھی وابستہ ہوگیا ہے۔ اس کے الفاظ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر الوہی آیات بن کر نازل ہوتے ہیں۔ صدیوں سے ہم اسے پڑھ رہے ہیں، سن رہے ہیں کچھ نہیں تو اس کے اقتباسات تو ضروری ہی پڑھتے رہتے ہیں اس لئے وہ ایسی شاعری بن گئی ہے جس میں قدیم زمانے کی چاشنی موجود ہے۔ توفیق رفعت نے لفظ کے سلسلے میں بڑی خوبصورت بات کی ہے۔

"Words worn smooth with centuries of usage."

جو لوگ مذہب سے واسطہ نہیں رکھتے ان کے لئے بائبل کے ترجمے کی کہانی بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ جیمز نے بائبل کے ترجمہ کا سوچا تو ستر علماء اور فضلا کو بلایا اور انہیں کاغذ اور قلم دوات دے کر الگ الگ کمروں میں بند کردیا کہ لو اب یہ کام پورا کرو۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے بھی نہیں مل سکتے تھے۔ دس سال یہ

لوگ ترجمہ کرتے رہے۔ آخر وہ اپنے اپنے کمرے سے باہر نکلے تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان سب کا ترجمہ لفظ بہ لفظ ایک ہی تھا۔ ایک نقطہ کا فرق بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر مصدقہ کہانی ترجمے کی تعریف و توصیف کے لئے گھڑی گئی ہوگی لیکن اس سے اس ترجمے کی خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔

خیر یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے۔ ہم ڈرامہ نگاروں کی کاوشوں میں عورت کے کردار کی پیشکش پر غور کر رہے ہیں۔ یہ ڈرامہ نگار خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے اس سلسلے میں ہماری توجہ سب سے پہلے برناڈ شا پر جاتی ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس نے عورت کے چند کردار ایسے پیش کئے ہیں جو واقعی سرخاب کے پر نظر آتے ہیں۔ ایک سرخاب کا پر " پگمیلین" کی الائزا ڈو لٹل ہے۔ اگر آپ کو وہ یاد نہ ہو تو فلم " مائی فیئر لیڈی" یاد کر لیجئے۔ اسٹیج پر جولی اینڈرو اور فلم میں آڈری ہیپ برن نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ کردار واقعی سر کا تاج ہے۔ شا نے ایسے ہی سرخاب کے پر ڈرامہ Arms and the man میں رائنا کے ذریعہ اور Saint Joan میں جون کی ذریعہ اور پھر کلوپیٹرا کے ذریعہ Caeser & Cleopetra ڈرامے میں لگائے ہیں۔

برناڈ شا کے سلسلے میں دوسری وجہ پہلی وجہ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ذرا یاد کیجئے ہم نے شیکسپئر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ زیادہ ہمدردی کے ساتھ عورت کے کردار اس لئے پیش نہیں کر سکا کہ اس کے زمانے میں ڈرامے میں مرد' عورت کا رول ادا کرتے تھے' اور پھر اس کا ذوق بھی شاید دوسرا تھا۔ مگر جہاں تک شا کا تعلق ہے اس کا جنسی ذوق بھی خاصہ ڈھل مل ہی تھا۔ اس کی تحریر غور سے پڑھئے آپ کو اس کے شواہد مل جائیں گے۔

رائنا کی محبت کا قصہ خاصا جذبات میں ڈوبا ہوا ہے یعنی میں اس میں "مل اینڈ بون" کی جذباتیت ہے۔ ہیتھ کلف اور کیتھی جیسی جذبات کی شدت نہیں ہے۔ اس ڈرامہ کا ضمنی عنوان ہے The chocolate cream soldier - جون کے لئے ڈرامہ میں یقیناً شدت جذبات کا اظہار ملتا ہے لیکن یہ جذبات رومانی ہرگز نہیں ہیں۔ اب رہا "سیزر اینڈ کلوپیٹرا" تو اس میں کلوپیٹرا سیزر کے لئے ایک کھلونا ہے جبکہ "انتھنی اینڈ کلوپیٹرا میں انتھنی کلوپیٹرا کا دم چھلا نظر آتا ہے۔

پگمیلیل میں یہ بات زیادہ صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہاں تو رومانی دلچسپی جیسے

سرے سے ہے ہی نہیں۔ ڈرامہ کے آخر میں الائزا اور ھگنز دوستوں کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں لیکن ذرا گہرائی میں جاکر دیکھئے یہ سب مشتبہ سا محسوس ہوتا ہے۔ فرض کیجئے اگر الائزا کی جگہ کوئی لڑکا ہوتا تو کیا ڈرامہ کی ڈرامائیت یا اس کردار اور ھگنز کے کردار میں کوئی فرق پڑتا؟ گویا یہ رول کسی ایکٹریس کے لئے سرخاب کا پر بن جاتا ہے وہ محض اتفاق سے عورت کا کروار بن گیا ہے اس کے لئے عورت ہونا ڈرامہ کی ضرورت نہیں تھی۔

انگلستان میں کراموبل کی پیورٹن ڈکٹیٹر شپ کے بعد تخت شاہی بحال ہوا تو اس دور کو بحالی یا Restoration کا دور کہا جاتا ہے۔ تاریخ میں کراموبل کا اہم کردار ہے۔ وہ ان لوگوں میں بھی شامل ہے جس نے چارلس اول کی موت کے پروانہ پر دستخط کئے تھے۔ وہ پارلیمنٹ میں کہتا ہے۔

Come, come, gentlemen, i,ll put an end to your prating".

اس طرح وہ بادشاہت اور پارلیمنٹ دونوں کی پائیداری کا سبب بنتا ہے۔ وہ بادشاہت کو اقتدار اعلیٰ کے تابع کرتا ہے اور پارلیمنٹ اور بادشاہ دونوں کو اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے روکتا ہے۔

کراموبل کی حکومت پرہیزگار قسم کی حکومت تھی اور جیسا کہ ایسی حکومتوں میں ہوتا ہے خاصی بے رنگ و رونق اور یبوست زدہ حکومت تھی۔ بادشاہت کی بحالی کے ساتھ ہی اس یبوست کو دور کرنے میں اتنی تیزی دکھائی کہ رنگ و رونق کا طوفان امڈ آیا۔ اس دور میں ڈرامہ کی ایک صنف سامنے آگئی جسے Restoration Comedy کہا جاتا ہے۔ ڈرامہ School for scandal کی میلاپراپ کے ساتھ میلا پراپزم ایک اصطلاح بھی بن گئی اور اس کے ساتھ نئے فقرے بھی سامنے آئے۔ تاہم اس میں ہنسی مذاق تو ہوتا تھا کوئی فلسفہ یا سنجیدہ فکر نہیں ہوتی تھی۔ فرانس میں مولیئر اور انگلستان میں گولڈ سمتھ اور گولڈونی نے خاصے مزاحیہ کردار پیدا کئے مگر وہ سارے کے سارے مرد ہیں۔ ڈرامہ Misers اور Bourgoise Gentlemen اس کی بہترین مثال ہیں۔ آخر کار چیخوف میں یہ تمام عناصر اکٹھے ہوگئے۔

ڈرامہ "سی گل - چیری آرچرڈ - تھری سسٹرز اور انکل وانیا" میں جو کردار

سامنے آتے ہیں وہ سچ مچ عورت کی اصل روح ہیں۔ اس عورت کی جو تحریک آزادی نسواں کی بنیاد بنتی ہے۔ اس عورت کو ایک حقیقت پسند اور معقول دماغ نے سوچا ہی نہیں، دیکھا بھی ہے اور حقیقی دنیا کے تناظر میں رکھ کر اسے پیش کیا ہے۔ یہ عورتیں "سی گل" ہیں اور "وائلڈ ڈک" ہیں جن کے اندر لامتناہی خلاؤں میں پرواز کرنے کا جوش و جذبہ ہے لیکن وہ پنجرے میں بند ہیں اور ان کے پر کٹے ہوئے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ عورت کے اس تصور نے امریکہ میں زیادہ عمر پائی۔ اونیل کے ڈرامہ Hairy Ape کی لڑکی سوسائٹی کی شہزادی ہے جو ایک بحری جہاز کے انجن روم میں ایک مرد کے ننگے بازو زندگی میں پہلی دفعہ دیکھتی ہے اور یہی واقعہ ڈرامہ کی معراج ثابت ہوتا ہے۔ ٹینیسی ولیمز کے Glass Menagerie کی لڑکی ساری عمر شیشے کے کھلونے اکٹھے کرنے میں گزارتی ہے اور اس کی ماں اس بات سے پریشان ہے کہ وہ کسی نوجوان کو اپنی طرف راغب کیوں نہیں کرتی۔ ڈرامہ Gentlemen Callers میں اسٹیلا اپنی خواہشات کی اسیر ہے اور آرتھر ملر کے ڈرامہ Death of a Salesman کی عورت اپنے شوہر کی الجھن کا شکار ہے پھر The Crucible میں عورتیں چڑیل بنی دکھائی دیتی ہیں۔

ایمان کی بات یہ ہے کہ اگر The Match Maker میں ڈولی لیوی نہ ہوتی تو ڈرامہ کی دنیا کا سارا منظر ہی خاصا تاریک ہوتا۔ اس عورت کا کردار واقعی عظیم کردار ہے۔ اسے سرخاب کا پر بلاشبہ کہا جاسکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ابسن اور برنیشت کے باوجود ایسا کردار ایک ہی نظر آتا ہے۔ اس کردار میں نہایت فطری انداز میں بڑی نزاکت کے ساتھ عورت کے اصل مسئلہ پر توجہ دی گئی ہے۔ ایک لحاظ سے ابسن عورتوں کی آزادی کی تحریک کا بانی محسوس ہوتا ہے اس کے ڈرامہ The Wild Duck سے Hedda Gabler تک اس موضوع پر سوال اٹھاتے ہیں اور اس کا جواب دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ابسن کے اپنے انداز میں۔ اپنا انداز میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی فکر اور اپنے رویئے میں خالص اسکینڈے نیوین ہے۔ مجھے تو اس کے ڈرامے پڑھتے ہوئے ٹھنڈ لگنے لگتی ہے اور گرم پانی کی بوتل پہلو میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ استاد ہے۔

کہتے ہیں اس کے ڈرامہ Adoll's House میں نورا نے جب شوہر کے گھر میں اپنی زندگی کا دروازہ پہلی بار دھڑاک سے بند کیا تھا تو اس کی دھمک سارے یورپ میں سنی گئی تھی۔ مگر بریشت نے اپنی عورتوں کے ساتھ البسن سے زیادہ ہمدردانہ سلوک کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال ڈرامہ The Goodperson of Schezuan ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بریشت پکا انقلابی تھا اور بڑا ڈرامہ نگار بھی تھا۔

دونوں ڈرامہ نگاروں نے اس موضوع پر قدم اٹھایا ہے اور اپنے اپنے انداز میں اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ گویا انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ ایک مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کا کوئی وجود ہے۔ اس کے بعد تو پھر دھند ہی دھند ہے۔

برصغیر میں ڈرامہ کی روایت کوئی بہت مستحکم نہیں رہی ہے۔ **شکنتلا** اور کالی داس کا روایت کو ہی تمام زمانوں پر محیط کر کے، تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے **شکنتلا** اور کالی داس ——— ڈرامے اور تھیٹر کی روایت کے کلاسیکی اور عظیم نام ہیں مگر عورت کو پیش کرنے کے حوالے سے **شکنتلا** کو انفرادیت حاصل ہے۔ اس ڈرامے میں عورت کمزور اور مجہول نہیں ہے۔ **شکنتلا** میں عورت مرکز اور محور ہے۔

امانت کی اندر سبھا میں نیلی، پیلی، گلابی اور سرخ پریاں نیلے اور کالے جنوں کے ساتھ موجود ہیں۔ سارے ماحول میں سراسیمگی یہ ہے کہ کیا کوئی پری سوئے ہوئے شہزادے کو لے اڑے گی یا پھر یہ ساری پریاں جنوں کے ہاتھوں مغلوب ہو جائیں گی۔

اودھ میں تھیٹر اور ڈرامے کی روایت، برطانوی استعمار پسندوں کے ہاتھوں دم توڑ گئی تھی۔ مگر اس نے دوسرا جنم کلکتہ، بمبئی اور لاہور میں لیا۔ یہ الگ بات کہ اس روپ کو بھی فلموں کی وبا کھا گئی۔ یہ انداز، مغربی روایت سے نہیں بلکہ برطانوی تھیٹر سے مستعار تھا۔ ہندوستانی ڈرامے کے جمودی ماحول میں اضطراب آیا اور اب آغا حشر جیسا نابغہ پیدا ہوا۔ تھیٹر کی روایت کا اکیلا فرد۔

آغا حشر کے زیادہ ڈرامے جنگ و جدل کی آویزش کے آئینہ دار ہیں۔ ان ڈراموں کے نسوانی کردار، خوبصورت، ماہر رقاص اور ڈیرے دار عورتیں نظر آتی ہیں۔ شاید اسی باعث ان کو ہیروئن کا رول عطا کیا گیا ہے۔

دولت اور شہرت کے آمیزے کی روایت، فلموں کو منتقل ہو گئی۔ آرٹ اور ادب کی روایت ریڈیو کے حصے میں آئی۔ گزشتہ 80 سال سے یہ روایت آپ کو آج بھی برصغیر میں سٹیج اور ٹی وی کے ڈراموں میں برقرار نظر آتی ہے کہ لکھنے والے نظر نہ آنے والے ڈرامے کی روایت کے حصار کو آج تک توڑ نہیں سکے ہیں۔

ریڈیو ڈرامے کے دو بڑے استاد ــــــ رفیع پیر اور امتیاز علی تاج جو آج کی ہماری نسل کے استاد مکرم ہیں۔ ان دونوں کے ڈرامے، "اکھیاں" اور "انار کلی"، عورتوں کے کردار کو بہت مستحکم طریقے پر پیش نہیں کرتے ہیں۔

ہمارے ڈراموں میں کالج کی لڑکی کا کردار کرتے کرتے، ایک 20 سالہ ایکٹرس 40 سال کی عمر کو پہنچ جاتی ہے۔ نہ ہی مصنف اس کے کردار میں کوئی تبدیلی کرتا ہے اور نہ ڈائریکٹر۔

خواجہ معین الدین اور سرمد صہبائی نے البتہ ان روایتی کرداروں سے مختلف ڈرامے لکھے۔ مگر ان کے ڈراموں میں مرد کو مرکزیت حاصل ہے۔ انتظار حسین اور بانو قدسیہ کے ڈرامے بھی روایتی اردو تھیٹر کا تسلسل ہیں۔ صفدر میر کا ڈرامہ جنگل پڑھنے کے لئے ایک نایاب چیز ہے۔

مارشل لاء کے موت آور زمانے میں اجوکا لوک رہس اور دستک جیسے نوجوانوں کے گروہوں نے نئے ڈرامے کی روایت ڈالی۔ یہ بند کوئیں کی چیخ تھی ان قوانین کے خلاف جو عورت کے نام پر اسلامی قوانین کی شکل میں ہم پر لاگو کئے جا رہے تھے۔ ان ڈراموں میں نوجوان گروہی طور پر بہت سے ڈرامے خود سوچتے، لکھتے اور بولتے رہے ہیں۔ البتہ شاہد محمود ندیم نے اس روایت کو تحریری بقا دی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مرد اور عورت مختلف ہیں اور ان میں فرق ہے؟ فرق کا لفظ ایک غیرجانبدار اور بے جنس لفظ ہے اس سے کسی کی برتری اور کسی کی کمتری ظاہر نہیں ہوتی۔ امریکہ میں کالوں کو مساوی حقوق دینے کی بات کی گئی تو اس میں کالوں کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی گئی۔ اس پر سپریم کورٹ نے اس رائے کا اظہار کیا۔ "مساوی مگر

جداگانہ" کہنے سے مساوات نہیں ہوتی۔ "ایک جیسے مگر مختلف" کہنا بھی کچھ ایسی ہی بات ہے لیکن فرق تو بہرحال ہے——

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس فرق میں وہ اصل نسوانیت (Femininity) شامل ہے جسے ڈرامے میں دیانت داری کے ساتھ فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے یا نسوانیت کی پیش کش نے ایسا پیکر تراشا ہے جو "نسوانی" بن گیا ہے؟ ابھی تو ہمارے لئے اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے لیکن شاید کبھی کوئی زمانہ ایسا آجائے جب ہمیں ہر چیز کا علم حاصل ہو تو ہم اس سوال کا جواب دے سکیں گے۔ اب تو ہم اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ فرانسیسیوں کی زبان میں یہ نعرہ لگائیں۔

VIVE LA DIFFERENCE (فرق زندہ باد)

کوئی خاتون عظیم مصور کیوں نہیں بنی؟

سلیمہ ہاشمی

تاریخ میں کوئی خاتون عظیم مصور کیوں نہیں ملتی؟ یہ سوال سب سے پہلے لنڈا نوشلین نے 1970ء میں اٹھایا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ جنگ چھڑ گئی تھی جو مصوری کی تاریخ کے بارے میں نیا روّیہ اپنانے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ دراصل یہ سوال ہی غلط ہے اور سوال دوسرے انداز سے کیا جانا چاہئے اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس طرح مصوری کی اس تاریخ کا تانا بانا ہی بکھر جاتا ہے جو ہم تک پہنچی ہے اور جسے سب نے مستند اور معیاری تسلیم کیا ہے۔ ایک صدی قبل جان اسٹیورٹ مل نے کہا تھا کہ "جس چیز کو قبول عام حاصل ہے وہی قدرتی بھی لکھی گئی ہے۔ عورتوں پر مردوں کا غلبہ دنیا بھر کا مسلمہ طور طریقہ ہے۔ اس طور طریقہ سے قدرتی طور پر گریز بھی "غیرقدرتی" مانا جاتا ہے۔ مصوری کی تاریخ میں سفید فام' مغربی مرد کا نقطہ نظر ہی غیر شعوری طور پر قبول کیا جاتا ہے اور اسے نارمل اور قدرتی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مصوری کی تاریخ پر یورپ کے سفید فام مرد مورخوں کی ہی اجارہ داری رہی ہے۔ یہ تاریخ عظیم' جینیئس اور سرشار مصوروں کی خط مستقیم میں تاریخ وار چلنے والی روایت پر مبنی ہے۔ گہری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ' مخصوص طبقے کے غلبے اور افراد کی مدح و ستائش پر مبنی ایک رومانی سا ڈھانچہ کھڑا کرکے اس پر مصوری کی تاریخ کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ انمیں جیوتو سے گویا تک ایک درجن کے قریب مصور ہی ایسے ملتے ہیں جن کے نابغہ روزگار ہونے کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے بچپن سے ہی اپنی کاپیوں پر ڈرائنگ کیا کرتے تھے۔ ایسی کہانیاں جیوتو یا گویا کی ہوں یا فلپولپی' کوربے اور مانے کی' وہ سب ایک ہی قسم کی ہیں۔ یا پھر مائیکل انجلو یا

پکاسو کا قصہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں ہی اپنے استادوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یہ کہانیاں سن کر سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر وہ لڑکی ہوتے تو کیا ہوتا؟" اگر ننھا پابلو ننھی منی پابلیتا ہوتی تو کیا سینور روئیز اس پر بھی اتنی ہی توجہ صرف کرتے؟ واں گو' لاریز اور گوگاں جیسے مصور شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر دنیا بھر میں گھومتے پھرے۔ ان کا شوق انہیں جہاں بھی لے گیا وہ گئے۔ کیا کسی دور کے معاشرہ نے بھی کسی جینیس عورت کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ بھی اسی طرح اپنے آپ کو تلاش کرے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ہر فن کارانہ تخلیق کسی حوالے سے ہی اپنا وجود پاتی ہے تو پھر مصوری کی تاریخ میں تنگ نظری کے ساتھ جو محدود نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے اسے آپ خوش دلی کے ساتھ ہضم نہیں کر سکتے۔

مصوری میں عورت کی بھی اپنی تاریخ ہے لیکن اسے ابھی تک دریافت نہیں کیا گیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اس پر سے پردہ اٹھ رہا ہے اور اس کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس موضوع کے متعلق پایا جانے والا انداز نظر اور ڈسپلن کا بھی بغور جائزہ لیا گیا ہے چنانچہ بہت سے طریقہ ہائے کار اور مفروضات ناکافی' محدود اور لاعلمی پر مبنی ثابت ہو چکے ہیں۔ اس معمولی سے سوال نے کہ "عورت عظیم مصور کیوں نہیں رہی؟ ردِّ عمل کے دریا کا بندھ توڑ دیا ہے۔ اس سے دماغ میں بے شمار اور بھی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کہ "کیا عورت عظمت حاصل کرنے کی اہل ہی نہیں ہے؟ "کیا عورت کا تخلیقی عمل قدرتی طور سے یہی ہے کہ وہ بچے پیدا کرے؟" "کیا عورت کا دماغ اور جسم اس بات کے اہل نہیں کہ وہ کسی ایک عمل پر توجہ مرکوز کر سکے؟" "کیا عورت اس قابل نہیں ہے کہ وہ سماجی' ذاتی اور جسمانی دباؤ اور کرب برداشت کر سکے جو عظیم بننے کے لئے ضروری ہے؟" کیا قدرت نے جینیس بنانے میں انصاف سے کام نہیں لیا؟

ایسے سوال اور بھی سوالوں کو جنم دیتے ہیں جو مصور خواتین کے مسئلے" پر غور کرتے ہوئے مختلف اور متضاد رویوں کے راستے پر لے جاتے ہیں۔

ایک روّیہ تو یہ ہوگا کہ اگر عورتیں ثقافتی تاریخ میں کھلے عام فنکارانہ تخلیق کرتی نظر نہیں آتیں اور پوشیدہ رہ کر "معاون فنکار" کا کردار ادا کرتی رہی

ہیں تو ہمیں ان کا مطالعہ کرنا چاہئے اور انہیں دریافت کرنا چاہئے؟ چودھویں صدی کے اطالوی شاعر بوکا چیو نے "زمانہ قدیم کی مشہور خواتین" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ اس کے لئے اس نے رومن مورخ پلینی کو اپنا حوالہ بنایا تھا۔ اس نے کتاب میں تین مصور خواتین کا ذکر کیا ہے جو یونانی تھیں۔ ان کے نام تھے آئرین مارسیا اور تھا موریس۔ بوکا چیو نے اپنے زمانے میں ان خاتون مصوروں کا ذکر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی تھی لیکن اس کی ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ یونان کی یہ اساطیری عورتیں غیر معمولی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ عورتوں میں صلاحیت اور طبّاعی شاذونادر ہی پائی جاتی ہے۔" یورپ کے اندر قرون وسطیٰ میں عورتوں نے جو فنکارانہ چیزیں بنائی تھیں۔ انہیں ان کے گھریلو استعمال کے لئے ضروری چیزیں بنانے یا مذہبی رسوم کے لئے ایسی چیزیں تیار کرنے پر محمول کیا جاتا ہے۔ ہر ملک میں صورت حال مختلف ہے لیکن گلڈ اور کلیسا (پیرش) کے ریکارڈ میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں مذہبی کتابوں میں تصویری خاکے بنانے اور سنگ تراشی کرنے کا کام کرتی تھیں۔ مذہبی رسوم کے لئے عورتیں دھاگے اور کپڑے سے جو خوبصورت چیزیں کاڑھتی تھیں یا کھڑکیوں کے رنگین شیشوں پر جو تصویریں بناتی تھیں یا کتابوں کے منور مسودے تیار کرتی تھیں ان کی بہت تعریف کی جاتی تھی۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں فنکارانہ تخلیقات کی صورت حال تبدیل ہو گئی اور نئے عوامل نے مصوری اور سنگ تراشی کرنے والی عورتوں کو متاثر کیا۔ فنکاروں نے جو نئے ورکشاپ بنائے، عورتوں کو ان مین داخلے کی اجازت نہیں تھی اور وہ آرٹسٹ گلڈ کی رکن بھی نہیں بن سکتی تھیں۔ اس دور میں جو مصور خواتین نظر آتی ہیں وہ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں جبکہ مرد فنکار زیادہ تر دستکار تھے یا چھوٹے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اعلیٰ طبقے میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا اپنے ماحول کی بنا پر خاتون مصور آرٹیمیزیا جنتل لیشی، فیدے گالیزیا، لیوینا، فونٹانا، کلارا پیٹرز مصوری کرتی تھیں۔ یہ سب فنکاروں کے سرپرستوں کی لڑکیاں تھیں یا ان کی

بیویاں تھیں۔

جنٹل لیثی (1652--1564) کے خطوط محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے سرپرستوں کو مسلسل یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ عورت میں بھی ذہانت و فطانت ہوتی ہے اور وہ بھی بڑی فنکار بن سکتی ہے کہ آرٹمیزیا فنکارانہ صلاحیتوں کی مالک زبردست خوددار عورت تھی۔ اس نے اس وقت ایک ہیجان اور سنسنی پیدا کر دی تھی جب اپنے استاد اگسٹینو تاس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے اس کی عزت لوٹی ہے اور اسے عدالت میں لے جاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے اپنا جو سیلف پورٹریٹ بنایا تھا وہ صدیوں ایک گودام میں گمنامی کی حالت میں پڑا رہا کیونکہ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی عورت نے بنایا ہے۔

بولون کے پینٹر گیدو رینی کی بیٹی الیزبتھ سرانی (1665--1638) نے ایسی مصوری کی کہ وہ اپنے باپ سے بڑی فنکار مانی گئی حالانکہ اس کا باپ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مصوری کرے۔ وہ اس کی حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ وہ صرف 26 سال کی عمر میں مر گئی مگر اس نے اس عرصے میں 170 پینٹنگ بنائیں۔ اس کی تدفین سرکاری سطح پر کی گئی اور اسے "مرحوم پینٹ برش" کا خطاب دیا گیا۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی تک فنی تخلیقات کا مرکز دستکاروں کے اڈے نہیں رہے تھے بلکہ آرٹ اکیڈمیوں میں مصوری اور سنگ تراشی وغیرہ کی تربیت و تعلیم دی جانے لگی۔ ان اکیڈمیوں میں عورتوں کے داخلے کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ البتہ روزالبا کیریرا ایک غیر معمولی خاتون تھی جسے استثنائی حیثیت حاصل ہے۔ اسے تمام اہم اکیڈمیوں کا رکن بنایا گیا اور جس کے نام سے مصوری کا "پیسٹل" طریقہ منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس نے ہی ایجاد کیا تھا۔ اسے اس کے خاندانی نام کے بجائے "روزالبا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا مقصد عورت ہونے کی وجہ سے کمتر درجہ دینا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے معیار سے وہ انتہائی غیر معمولی شخصیت مانی جاتی تھی۔ اس کی غیر معمولی شخصیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں تھی اور اس زمانے میں خاتون

مصور کی کامیابی کا ایک راز اس کا خوبصورت ہونا بھی ہوتا تھا۔ خاتون فنکار کی کامیابی کا دوسرا زینہ اس کی سماجی حیثیت بھی ہوتا تھا۔ فرانس کی مشہور مصور خواتین لابئل گویار اور الیزبتھ وگے لیبرون نے فرنچ اکیڈمی کی رکنیت کے لئے درخواست دی تھی تو انہیں بادل ناخواستہ اس لئے رکن بنا لیا گیا تھا کہ ان کا تعلق شاہی دربار سے تھا۔ اکیڈمی کا قاعدہ تھا کہ ایک وقت میں صرف چار خاتون آرٹسٹ ہی ممبر بن سکتی تھیں۔ لیکن یہ قاعدہ صرف انقلاب سے پہلے ہی کار آمد تھا انقلاب کے بعد خواتین کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا۔

انیسویں صدی کے بیشتر حصے میں عورتوں کو یورپ کے تمام ممتاز فنی اداروں سے باہر رکھا گیا۔ انہیں اجازت نہیں تھی کہ وہ نیوڈ ماڈل سے انسانی اعضاء کا مطالعہ کر سکیں۔ اس لئے پورٹریٹ اور اسٹل لائف پینٹنگ کو عورتوں کے لئے مخصوص رکھا گیا یہ دونوں اصناف مصوری میں کمتر حیثیت رکھتی تھیں۔

روزا بونہائر (1822--99) کو محض اس وجہ سے زبردست شہرت ملی کہ وہ خاص طور سے لینڈ اسکیپ اور جانوروں کی پینٹنگ کرتی تھی۔ اس نے اس میں مہارت حاصل کی تھی اور انیسویں صدی میں یہ موضوع بہت مقبول ہوا تھا۔ وہ مصوروں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد مصور تھے اور انہوں نے اس کی والدہ' اس کے بھائیوں اور بہنوں کو بھی یہ فن سکھایا تھا۔ ابتداء میں اسے لباس ڈیزائن کرنے کی تربیت دی گئی تھی لیکن بعد میں اسے مصوری کو پیشہ بنانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے والد سوشلسٹ تھے اس لئے وہ عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کے علم بردار تھے۔ چنانچہ ان کے بعد ڈرائنگ سکول کی پرنسپل بھی روزا ہی بنی۔ روزا کو انسانی جسم اور انسانی اعضا پینٹ کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے اس نے جانوروں کی تصویریں بنانے اور ان کے مجسمے تیار کرنے میں شہرت حاصل کی۔ یہاں بھی اس کا عورت ہونا اس کے راستے کی رکاوٹ بنا۔ اسے جانوروں کا مطالعہ کرنے کے لئے پیرس کے مذبح اور گھوڑوں کی منڈی میں مردوں کا لباس پہن کر جانے کے لئے خاص طور پر قانونی اجازت حاصل

کرنی پڑی۔ 1853ء میں اس کی پینٹنگ The Horse Fair نے پیرس کے فنکار حلقوں میں زبردست سنسنی پیدا کی۔ جانوروں کی یہ سب سے بڑی پینٹنگ تھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں پیرس میں جو معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں انہوں نے عورتوں کو مصوری کرنے کے لئے زیادہ مواقع فراہم کئے لیکن ان کے لئے میدان اب بھی محدود تھا۔ اس زمانے کی دو مشہور بہنوں ایدما اور برتھا کا ذکر سننے میں آتا ہے وہ دونوں بہت ہی باصلاحیت فنکار تھیں لیکن ایدما نے شادی کرلی اور مصوری کو خیرباد کہہ دیا البتہ برتھا نے امپریشنسٹ مصور کی حیثیت سے شہرت پائی۔

ایدما نے 1869ء میں برتھا کو لکھا۔ "تم اکثر میرے خیالوں میں رہتی ہو۔ میں تمہارے اسٹوڈیو میں تمہارے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہوں۔ کاش مجھے ایک گھنٹے کا چوتھائی حصہ ایسا مل جائے کہ میں یہاں سے بھاگ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں اور اس جگہ سانس لے سکوں جہاں ہم دونوں رہتے تھے۔"

پاکستان میں لوگوں کو بہت کم علم ہے کہ جبرو استبداد کے جس طویل دور سے ہم گزرے ہیں اس کے خلاف روشن خیالی کو فضا پیدا کرنے میں مصوری کے شعبے میں کام کرنے والی خواتین نے کتنا اہم رول ادا کیا ہے۔

مصور خواتین نے یہ فضا پیدا کرنے میں خود بھی نمایاں کام کیا ہے اور جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ تاریخ میں ان خواتین کو نظرانداز کیا گیا ہے اور اکثر اوقات انہیں اپنا تخلیقی اظہار کرنے سے محروم بھی رکھا گیا ہے اس کے علاوہ انہیں دوسرے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے بھی باز رکھا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے ساتھ جب آرٹ کے بہت سے استاد ملک چھوڑ کر چلے گئے تو آرٹ اسکول ہی بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی کیا جانے لگا تھا کہ ایک اسلامی ملک میں مصوری کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ان حالات میں خواتین ہی تھیں جنہوں نے مصوری کے ادارے قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا یہ کام سست رو ضرور تھا لیکن اس کے نتائج بہت ہی کار آمد نکلے۔ اس کی ابتدا لاہور سے ہوئی پھر کراچی میں ایسے ادارے قائم ہوئے اس کے بعد راولپنڈی اور پشاور نے اس کی تقلید کی۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مصوری کی تعلیم میں ہی نہیں مصوری کے عمل میں بھی یہ خواتین ہی تھیں جو اس دشوار گزار اور ناہموار راستے پر سب سے آگے آگے چلیں اور جنہوں نے سب کی رہنمائی کی۔ اس سلسلے میں جن خاتون مصوروں کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ ہیں زبیدہ آغا اور اینا مولکا احمد۔ زبیدہ آغا نے اپنی مصوری کا آغاز 1940ء کی دہائی میں کیا۔ پاکستان میں مصوری کے جدید رجحانات روشناس کرانے میں زبیدہ آغا نے ہی پیش رفت کی۔ ان کی تجریدی رنگوں کے امتزاج سے بنائی جانے والی پینٹنگز پر کسی دوسرے مصور کا اثر نظر نہیں آتا۔ وہ پہلی مصور تھیں جنہوں نے پاکستان میں پہلی پرائیویٹ آرٹ گیلری قائم کی۔ انہوں نے 1960ء کی دہائی میں راولپنڈی میں غیر مشہور نوجوان مصوروں کی پینٹنگز کی نمائشیں کیں۔

اینا مولکا احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کے تمام کالجوں میں آرٹ کا شعبہ قائم کرایا۔ 1950ء کی دہائی میں ہی پاکستان میں مصوری کے اکثر ادارے قائم ہوئے اور یہ ادارے قائم کرنے میں خاتون مصوروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ کراچی میں ہاجرہ اور رابعہ زبیری' پشاور میں جمیلہ زیدی' لاہور میں نسیم قاضی اور حیدر آباد میں مسرت مرزا کا نام اس سلسلے میں سرفہرست ہے لیکن یہ فہرست خاصی طویل ہے۔ یہاں ختم نہیں ہوجاتی۔

سیاسی جبر و تشدد کے زمانے میں خاتون مصوروں نے آرٹ کو جس موثر پیمانہ پر اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا' وہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں ان خاتون مصوروں نے ایک قسم کی "مزاحمتی مصوری" کو فروغ دیا اور اپنی پینٹنگز کے ذریعے عوامی جذبات کی ترجمانی کی اور ریاستی جبر کو ننگا کیا۔

1970ء کی دہائی کے آخر اور 1980ء کی دہائی میں سرکاری مصوری کو

زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ سرکاری مصوری تصویری اشکال سے عاری مصوری تھی۔ اسے مصوری کا اسلامی اظہار قرار دیا گیا۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی ہدایت تو جاری نہیں کی گئی تھی لیکن اس کی سرپرستی اتنی زیادہ کی گئی کہ مصوری کا یہی طرز سرکاری مصوری کی علامت بن گیا۔ سرکاری عمارتوں کے لئے خاص طور سے جو پینٹنگز بنوائی گئیں ان میں خطاطی اور لینڈ اسکیپ ہی ہوتی تھیں۔ اس سرکاری سرپرستی سے بہت سے جعل سازوں نے خوب فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ انہوں نے "جعلی پورٹریٹ" بھی بنائے۔ لیکن یہ سرکاری آرٹ، خاتون مصوروں کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنا۔ اب یہ غلطی سے ہوگیا یا دانستہ طور پر ایسا ہوا لیکن حقیقت یہی ہے۔ پاکستانی مصوروں میں سے کئی بڑے نام ایسے تھے جو پہلے اپنی تصویری اشکال کی پینٹنگز کے لئے ہی مشہور تھے لیکن اب وہ سب کے سب خطاطی کرنے لگے تھے۔ اتفاق سے یہ سب کے سب مرد مصور ہی تھے۔ کسی خاتون مصور نے سرکاری لائن پر چلنے کے لئے اپنی اصل صنف کو نہیں چھوڑا۔ بلکہ الٹا یہ ہوا کہ ستر کی دہائی اور اسی کی دہائی میں خواتین مصوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور انہوں نے اپنے فن میں زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔ ان کے ہاں زیادہ پختگی آئی۔ ان میں مسرت مرزا، صادقہ بلگرامی، رابعہ زبیری، مہرافروز، ناہید رضا، نجمی، قدسیہ نثار اور سلیمہ ہاشمی، شامل ہیں۔ اس زمانے کی قابل ذکر چیز ان خاتون مصوروں کا موضوع اور اسلوب ہے۔ ان خواتین کی پینٹنگز میں رویہ اور اپروچ کا تنوع اور انفرادیت نظر آتی ہے۔ مسرت مرزا سندھ کی شکارگاہوں کی پینٹنگز بناتے ہوئے کینوس پر آئل کا نغماتی اور اسلوبیاتی استعمال کرتی ہیں جبکہ قدسیہ نثار واٹر کلر میں تاثراتی اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ یہ خواتین سب سے الگ تھلگ اپنے انفرادی راستوں پر چل رہی ہیں۔

سیاسی منظر پر جبر و تشدد کی جو کالی گھٹائیں امنڈ رہی تھیں ان میں ان خواتین کی اپنی حیثیت اور اپنی شخصی آزادی خطرے میں نظر آتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس صورت حال کو اپنے ذاتی تجربہ کا حصہ بنایا اور پھر اسے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ 1983ء کی دہائی میں ہی لاہور کی مصور خواتین اکٹھی ہوئیں اور انہوں نے اپنے

لئے ایک منشور تیار کیا۔ یہ منشور شائع تو نہیں ہوسکا لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خواتین ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کر رہی تھیں اور اپنے فن کو وہ سرکاری پالیسی کے تابع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس طرح اس حقیقت کی عکاسی بھی ہوتی ہے کہ اگرچہ ان کے فن کے قدردانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن انہیں خطرہ تھا کہ ان کے اس ذاتی اظہار پر بھی قدغن لگ سکتی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ عدم رواداری کی فضا کے ساتھ کسی طرح بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

1980ء کی دہائی کے آخر اور 1990ء کی دہائی کے اوائل میں ایسی مصور خواتین کی بڑی تعداد سامنے آئی جن کی زیادہ دلچسپی پینٹنگز کے موضوع اور مواد میں تھی۔ ان کی تخلیقات سے ان کے اس نظریہ اور اس عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے جو زندگی گزاری جارہی ہے اسے پیش کرنے کے لئے اپنے فن کو ایک متبادل ہتھیار یا آلہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مغربی طرز فکر کے مطابق مبصر کی حیثیت سے چیزوں کو دیکھنا اور ظواہرات سے باہر نہ لے جانا' ایسے رجحانات تھے جنہیں ان مصوروں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ ان کے یہاں روشن خیالی کی "عقلیت" کی جگہ متنوع تجربات کی ننگھی نے لینا شروع کردی تھی۔ ناہید رضا نے عورتوں کی جو اشکال بنائی ہیں ان کے ٹیکسچر اور علامتی اسلوب کے مقابل سمعیہ درانی کی طاقتور امیجری ایک قدم اور آگے لے جاتی ہے۔ سینا گیلانی کی لباس کے بغیر اپینٹنگز موجود ماحول کے خلاف مزاحمت کی ہی ایک شکل ہے' جبکہ نازش عطاء اللہ کی پینٹنگز میں عورت کے لئے چادر کے خبط کا دانشورانہ اظہار اس حسیّت کی ترجمانی کرتا ہے جو اس دہائی میں فن کاروں کے اندر پیدا ہوئی تھی۔ یہ حسیّات مواد اور اسلوب دونوں میں نظر آتی ہیں۔ ان پینٹنگز میں عورت کے مقابلے میں مرد کی نظریں آوارگی اور ٹکٹکی لگانے کا تصور پیش کرتی ہیں۔ مرد مصوروں کی پینٹنگز میں عورت کا جو پیکر پیش کیا جاتا ہے ان میں معاشرہ کی "دائمی" صورت حال پر حرف زنی کی جاتی' اسے چیلنج نہیں کیا جاتا۔ ان میں عورتیں آرائش کے کام آتی ہیں اور اپنی تشکیل میں غیر محفوظ سی دکھائی دیتی ہیں۔

یہ سلسلہ گزشتہ پانچ دہائیوں سے اسی طرح جاری ہے۔ آج تک مرد مصوروں کے ہاں عورتوں کے پیکر نرم و نازک اور موم کے پتلے ہی نظر آتے ہیں، جنہیں رومانس اور متھ کی علامت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ چغتائی کی زیورات سے آراستہ غزالی آنکھوں والی عورتیں ہوں یا اللہ بخش کی ہٹی کٹی جٹیاں' یا جمیل نقش کی کبوتروں سے پیار کرنے والی مجہول عورتیں' سب کے پیکر نزاکت اور کمزوری کا تاثر ہی دیتے ہیں۔ ناگوری اور ظہور الاخلاق دو ایسے مصور ہیں جنہوں نے عورت کا پیکر مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ناگوری کا رجحان سیاسی صورت حال کی جانب زیادہ ہے۔ وہ عورت کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ یہی ایسی مخلوق ہے جو سیاسی یا جسمانی تشدد کا نشانہ آسانی سے بنا لی جاتی ہے۔ ان کی پینٹنگز میں اسلوب تو اتنا واضح نہیں ہوتا البتہ ان کا پیغام واضح طور پر دیکھنے والے تک پہنچ جاتا ہے۔ ظہور الاخلاق زیادہ دانشورانہ اور فلسفیانہ رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت روایتی "دیوی" یا تمثال بھی ہے جو درباری منی ایچر پیکر میں جلوہ گر ہے اور تخلیق کا وسیلہ اور منبع بھی۔ ظہور الاخلاق کی پینٹنگز اپنے اندر سیاسی معانی اور مفاہیم بھی رکھتی ہیں۔ ان کی عورت ایک طرف مادری نظام کی سردار ہونے کا تاثر دیتی ہے تو دوسری طرف مرد کی محبوب بھی ہے۔ ایٹمی دور میں انسانی بقا کے لئے ظہور الاخلاق نے عورت کو قوت و توانائی کی علامت بنایا ہے اور بقائے انسانی کی جدوجہد میں عورت کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ پاکستان کی مصوری میں یہ بالکل نئی اور غیر معمولی بات ہے۔ باقی جہاں تک دوسرے مصوروں کا تعلق ہے وہ منڈی میں فروخت ہونے والی تصویریں برابر بنائے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں وہی بنے بنائے انداز اور سانچے مسلسل چلے جا رہے ہیں۔ وہی عورت کا مجہول اور مغلوب ہونا اور وہی عورت کو آرائش و زیبائش کے لئے استعمال کرنا۔

موسیقی میں عورت

ثروت علی

موسیقی میں عورت جس طرح پیش کی جاتی ہے اسے معاشرہ کے مجموعی مزاج سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا موسیقی میں نظر آنے والی عورت شاعری اور مصوری کی عورت سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ اختلاف یا فرق اگر کہیں ہے تو وہ وسیلے میں ہے' وسیلے کے اعتبار سے موسیقی یقیناً شاعری اور مصوری سے مختلف ہے۔ شاعری میں آپ مطالب و معانی کا براہ راست ابلاغ کرتے ہیں لیکن موسیقی میں ایسا نہیں ہوتا۔ قدیم زمانے سے موسیقی کی یہی روایت چلی آرہی ہے اور فنون لطیفہ کی دوسری اصناف کے مقابلے میں اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس میں اتنی لچک موجود ہے کہ اندرونی تغیر اور بیرونی دباؤ کے باوجود وہ ہر آنے والی چیز کو اپنے اندر جذب کرتی رہی ہے۔ سنگیت یا موسیقی سے کوئی مخصوص مفہوم حاصل نہیں کیا جاسکتا' اس مشکل کو شاعری یا بندشوں کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہماری موسیقی کے چار بنیادی عناصر میں ایک "کویتا" بھی ہے۔ سر' لے' تال اور بول مل کر موسیقی کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔ اس کے بول واضح ہونا چاہئیں اور ایسے ہونا چاہئیں کہ انہیں راگ راگنی میں ڈھالا جاسکے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ متعلقہ راگ میں سما سکیں۔ موسیقی کے لئے بول' بندش یا گیت لکھنے والے عام شاعروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں عام طور پر یہی ہوتا تھا کہ گانے والے یہ بول یا بندشیں خود ہی لکھتے تھے۔

شدھ یا خالص موسیقی صرف ترانہ یا الاپ ہے جو سنگیت کے لئے کافی نہیں سمجھا جاتا۔ خالص موسیقی کا تصور ہمارے ہاں اس طرح رائج نہیں ہوا جیسے مغرب میں رہا ہے۔ خالص موسیقی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے ہاں کبھی موجود نہیں رہیں۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب خالص موسیقی یا شدھ راگ تخلیق کرنے کی آرزو اور خواہش پائی جاتی تھی۔

موسیقی کے بولوں کا مرکز عورت ہی ہوتی ہے۔ اس کا موضوع عورت کا اپنے پریتم کے ساتھ وصال یا اس کا ہجرو فراق ہوتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں اس کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا کہ گانے والا مرد ہے یا عورت۔ گانے والے وہی بول گاتے ہیں جو انہیں سکھائے گئے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ گانے والا یا گانے والی جو بندش گاتی ہے وہ خود اس کی لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ گائیک وہی گاتا ہے جو اسے سکھایا گیا ہے۔ اور صحیح ریاض بھی یہی ہے کہ "مستند بندشیں" گائی جائیں۔ کسی گانے والے یا گانے والی کی مہارت یا کمال فن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ وہ مستند بندشیں کیسے گاتی ہے۔ یہ بندشیں سینکڑوں سال سے ایسی ہی چلی آ رہی ہیں۔ چند بندشیں تو ہم تک امیر خسرو سے پہنچی ہیں۔ ان بندشوں کا دھرپہ اور مزاج برج بھاشا کا یہ مزاج اس زمانے کی شعری حسیات کی عکاسی کرتا ہے۔ راگ بسنت میں امیر خسرو کی مشہور بندشیں یہ ہیں۔

(استھائی)	(انترا)
نظام الدین اولیا کو کوئی سمجھاوے	مورا جو بنا سونلڑا بھیوری گلال
جوں جوں سمجھاوے وہ تو روٹھو ہی جاوے	کیسے کروں دینی بخشش موری مال

ان بندشوں میں گانے والا یا گانے والی اپنے مرشد نظام الدین اولیا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے وہ انہیں رجھا رہی ہے۔ روٹھے کو منا رہی ہے۔ یہ خالص برج بھاشا کی شاعری ہے جو اس علاقے میں رائج تھی۔ بعد میں فارسی شاعری سے متاثر ہو کر جس شاعری نے رواج پایا یہ اس سے قطعاً" مختلف ہے۔ غزل میں عاشق اور معشوق دونوں گویا مرد ہوتے ہیں۔ لیکن گیت اور لوک شاعری میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد اس کا محبوب۔ ویسے یہ کہنا صحیح نہیں کہ گیتوں میں عورت ہی مرد کو مخاطب کرتی ہے کیونکہ وہاں عورت اور مرد کی تخصیص ختم ہو جاتی ہے اور دونوں ایک ہی بن جاتے ہیں۔ گانے والا یا گانے والی اس فرق اور اس امتیاز سے بالا ہو کر گاتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر راگ راگنیوں کی بندشوں کو دیکھا جائے تو ان میں عورت ہی فعال دکھائی دیتی ہے۔ مرد مرشد یا پیر ہوتا ہے یا پھر ایسا دیوتا جس کی ساری صفات انسانی ہوتی ہیں یعنی خالص ارضی دیوتا۔ یہ مرد جذبات کی شدت اور درد و کرب

سے بے نیاز ہوتا ہے۔ کٹھور ہوتا ہے' سنگدل ہوتا ہے' عورت اسے طرح طرح سے رجھانے اور منانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے پاؤں پڑتی ہے۔ اس کی بنتی کرتی ہے۔ وہ آوارہ مزاج ہوتا ہے۔ کسی ایک کے ساتھ وہ عشق نہیں کرتا۔ دراصل یہ گیت اور بندشیں رادھا کرشن کے پیار و محبت اور اس سے منسوب کہانیوں سے ہی وجدان حاصل کرتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اکثر گیت رادھا کرشن کے اس عشق کے گرد گھومتے ہیں۔ کرشن ایک کھلنڈرا نوجوان ہے جو گوپیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ ان کے ساتھ راس رچاتا ہے۔ رادھا اس کے عشق میں پاگل ہوئی پھرتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے بناؤ سنگھار کرتی ہے' ناچتی ہے' گاتی ہے۔ اسے خوب رجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر کرشن سب کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ وہ سب کا پیارا ہے۔ وہ کسی ایک کا ہو کر رہنا نہیں چاہتا۔ ان گیتوں کی فضا بھی عجیب پراسرار اور دھندلی سی ہوتی ہے۔ کبھی تاروں بھری رات ہوتی ہے تو کبھی چاندنی رات' جنگل ہوتا ہے یا پھر دریا کا کنارہ۔ سب چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سننے والے کو حقیقی دنیا سے کہیں دور لے جاتی ہیں۔ اس خیالی دنیا میں ساری مصیبتوں کو بھلا کر سچے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کے منہ سے یہ ساری باتیں اس لئے کہلوائی جاتی ہیں کہ عورت میں جذبات کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے پیار محبت اور قربانی اور تیاگ کی باتیں زیادہ اثر کرتی ہیں۔ عورت کی زبان میں زیادہ سچائی نظر آتی ہے۔

رادھا کے ساتھ کرشن کی چھیڑ چھاڑ اور پیار کی چہلیں بہت سے راگوں کے استھائی انترے میں بیان کی جاتی ہیں۔ جیسے۔

(استھائی)	(انترا)
لنگر ڈھیٹ میرو لگ روکت جو ناہی سجن	نند چھیلا مجھ سے ہنسی کرت ہے
ہوں تو چلت پنیاں بھرن کو	پکڑ دھکڑ مورا مکھ میٹت ہے
	پھوری گگریا بیاں مروری

یہ بندش راگ سہاگ کی ہے۔ اسی طرح اس سے قریبی راگ پٹ دیپ کی بندش یہ ہے

(استھائی)

(انترا)

الیی چترنہ موری آلی رے ہوں تو منوہر گوکل کنجن

سکھین کے سنگ رم جھم ناچ کرے بن ٹھن آئے آج ری۔
نند محل کے پھاگ بھیم پلاسی کو بندش یہ ہے۔
(استھائی)
اتی سندر رادھا ور ——— بنسی دھرنٹ ناگر
بیت جن شام ملن۔ بادل میں دامن

خیال اور ٹھمری کی جو بندشیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کا موضوع یہی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ قدیم روایت کے تسلسل اور اس کی قطعیت پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سینہ بسینہ چلی آنے والی روایت میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص زمانے کی شاعرانہ اور جمالیاتی ضرورتوں کے مطابق اس میں کچھ ردوبدل ضرور کرلیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بول اور موضوع بھی بدل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایت جامد ہوجائے تو وہ وقت کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور قدیم تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ہم تک جو بندشیں پہنچی ہیں وہ گزشتہ دو سو سال سے تو ضرور گائی جا رہی ہیں۔ خیال کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ وہ سات سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ البتہ سلطنت دہلی کے زوال تک اسے ایک ادنیٰ راگ مانا جاتا تھا۔" اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں نوابان اودھ کے زمانے میں ٹھمری کو فروغ حاصل ہوا۔ ٹھمری انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں اپنے معراج کو پہنچی۔ ممکن ہے اس نئی صنف کے لئے دوسرے راگوں کی استھائی اور انترے کی بندشوں میں تبدیلیاں کی گئی ہوں۔ ٹھمری کی صنف ان دنوں کافی مقبول ہو رہی تھی۔ ان میں راگوں اور بندشوں کی تبدیلیاں تو کی گئی ہوں گی لیکن انہیں مستند اور مصدق ثابت کرنے کے لئے انہیں پرانے استادوں سے ہی منسوب کر دیا گیا ہوگا۔ بہرحال اگر ایسا ہے تو ہم تک جو موسیقی پہنچی ہے تو وہ ہماری تاریخ کے ایک خاص دور سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

وہ دور جو انتشار اور زوال و انحطاط کا دور تھا۔

تحریری دستاویزوں کی عدم موجودگی میں ہم قطعیت کے ساتھ کوئی بات

نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایت کو اس کے زمانے کی عام زندگی کے دھارے سے الگ نہیں کیا جاسکتا ان بندشوں میں جس کرب اور جس رنج والم کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی کوئی بنیاد ضرور ہے۔

قوالی میں بھی امیر خسرو، بلھے شاہ یا خواجہ فرید کا جو کلام گایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اسی قسم جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ لیکن جس شخص نے اس زبان کا شعری انداز تبدیل کیا وہ شاہ حسین ہیں۔ بعد میں قوالی میں جو شعری پیکر استعمال کئے گئے وہ بھی شاہ حسین کے تخلیق کردہ ہی ہیں ان میں عورت کا کردار ہی غالب ہوتا ہے۔ مرد کی حیثیت ایک ایسی ہستی کی ہوتی ہے جو سب کی توجہ اور سب کی محبت کا مرکز ہے۔

شاہ حسین کی کافیاں شاعری کی ایک صنف ہی نہیں بنیں۔ بلکہ وہ موسیقی کی ایک صنف بھی بن گئیں اور انہیں گایا جایانے لگا۔ دوسرے شعرا نے بھی اس صنف کو استعمال کیا اور یہی علامتیں اپنی شاعری میں بھی برتیں۔ استھائی اور انترے کہنے والے شاعر بھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ پنجابی میں جو بندشیں تیار کی گئیں ان میں بھی وہی انداز نظر آتا ہے یہاں بھی ہیر ایک فعال اور غالب کردار ہے جبکہ رانجھا محبوب کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

دوسرا اہم پہلو فنکار کی حیثیت سے فنون لطیفہ میں عورت کا مقام ہے۔ سوال یہ ہے کہ گائیکہ یا موسیقار کی حیثیت سے عورت کا واقعی مقام کیا ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ پیشہ ور موسیقاروں کی عورتوں کو عام مقامات پر گانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان انتہائی باصلاحیت عورتوں کا کام بس اتنا ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کو موسیقی کی ابتدائی تعلیم دے دیں۔ ویسے تو ان کے ساتھ یہ بھی امتیازی سلوک ہوسکتا تھا کہ موسیقی کے قریب بھی انہیں نہ جانے دیا جاتا لیکن چونکہ وہ استادوں کی اولاد ہوتی تھیں اس لئے موسیقی ان کی گھٹی میں پڑی ہوتی تھی اور پھر ان کے چاروں طرف موسیقی ہی موسیقی ہوتی تھی اس لئے وہ خود بھی سیکھ لیتی تھی۔

ان گھرانوں میں عورت کو عزت کی نشانی سمجھا جاتا تھا اس لئے انہیں گھر سے باہر گانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ گانے والی عورتیں کنجری یا

طوائفوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ عورتیں اپنے جسم کے ساتھ اپنا فن بھی بیچتی تھیں۔ اکثر مشہور گانے والی عورتیں اسی برادری سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا تعلق میراثی خاندان سے نہیں ہوتا تھا۔

ایک اور نہایت اہم نکتہ یہ ہے کہ عورت خواہ کتنی ہی بڑی گانے والی کیوں نہ رہی ہو آج تک کوئی مسلمہ استاد نہیں بن سکی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ عورت کے استاد ہونے کے لئے ہماری زبان میں کوئی لفظ ہی نہیں ہے کیونکہ یہ درجہ اور یہ مرتبہ مردوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ موسیقی کے استادوں کو چار خطاب دیئے جاتے تھے۔ نائیک، گندھرو، گنی اور پنڈت۔ یہ خطاب ان کی مہارت اور ان کے کمال کے اعتبار سے دیئے جاتے تھے۔ کنجری برادری کی عورتیں ان استادوں کی شاگرد بنتی تھیں اور اگر ان میں صلاحیت ہوتی تھی تو مشہور بھی ہوجاتی تھیں۔ فن میں نام بھی پیدا کرتی تھیں۔ ان کی بیٹیاں بھی یہی راستہ اختیار کرتی تھیں وہ بھی اور کسی استاد کی شاگرد بنتی تھیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں سنا گیا کہ کسی باصلاحیت لڑکی کو کسی عورت موسیقار کے پاس شاگردی کے لئے بھیجا گیا ہو۔ یا کسی عورت موسیقار نے کسی شاگرد کو موسیقی کی باریکیاں سکھائی ہوں۔

اسی طرح موسیقاروں کے نظام مراتب میں بھی عورت کے لئے کوئی اعلیٰ مرتبہ نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ استاد علاؤ الدین خاں کے بچوں میں سب سے زیادہ باصلاحیت اور ہنرمند ان کی لڑکی اناپورنا تھی۔ وہ اپنے بھائی علی اکبر خاں اور اپنے شوہر روی شنکر سے بھی زیادہ قابل تھی لیکن وہ عام مقامات پر نہیں گاسکتی تھی۔ اس کے چند شاگرد بھی تھے لیکن سب کے سامنے اس کا اعلان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا خدا کرکے اب روایتی بندھن ٹوٹے ہیں تو اس کا نام سامنے آنے لگا ہے اور اس کی مہارت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ اسی طرح راگ راگنیاں تخلیق کرنے والی بھی عورتیں نظر نہیں آتیں یا اگر تھیں تو ان کا نام نہیں لیا جاتا۔ کیونکہ وہ میدان بھی مردوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ آج تک کسی راگ راگنی کی خالق عورت کا نام سننے میں نہیں آیا بلکہ یہ بھی کبھی نہیں سنا کہ فلاں بول یا بندش عورت نے بنائی ہے۔ عورتیں صرف گاتی تھیں۔ گویا انہیں جو کچھ تیار

کر کے دیا جاتا تھا۔ ان کا کام انہیں پیش کرنا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ کسی فن میں بھی ایسی قید برقرار نہیں رہ سکتی۔ خاص طور سے موسیقی میں تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ گانے والا یا گانے والی جب بھی گاتی ہے تو ہر بار ایک نئے تخلیقی تجربہ سے دوچار ہوتی ہے۔ گانے کے عمل کو تخلیقی عمل سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اس میں استثنیات بھی ہیں میرا بائی اس میں سب سے بڑا اور سب سے عظیم استثنا ہے۔ میرا بائی شہزادی تھی اور ایک راجہ کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن کرشن کے عشق نے اسے ایسا دیوانہ بنا دیا تھا کہ وہ سب کچھ تیاگ کر راجہ راجہ کہہ کے محل سے نکل بھاگی۔ وہ جنگل جنگل اور بن بن میں گھومتی اور کرشن مراری کے بھجن گاتی۔ یہ بھجن میرا کے بھجن ہی کہلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ گانے والی یا شاعرہ سے بھی زیادہ گنی مانی جاتی ہے کیونکہ ایک راگ ' میرا بائی کی ملہار '' اسی کے نام سے منسوب ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی استاد یا کسی سرپرست کا نام کسی بندش ' کسی گیت یا کسی راگ میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے جیسے وہ راگ اس نے تخلیق کیا ' ہو حالانکہ وہ کسی اور کی تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن میرا بائی کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ وہ کسی کی سرپرست نہیں تھی اور نہ وہ کسی موسیقی کے رسیا کی محبوبہ تھی کہ پورا راگ اس کے نام سے منسوب کر دیا جاتا۔

اس لئے خیال یہی ہے کہ یہ راگ اس کی اپنی تخلیق ہے۔ اسے آج تک اسی طرح گایا جاتا ہے۔ میرا بائی کو محض گانے والی ہی نہیں مانا جاتا۔ موسیقی اس کی جان تھی ' اس کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کنہیا کی دیوانی تھی۔ اس کے متعلق بہت سی توجیہات کی گئی ہیں کہ وہ ایسی کیوں ہوگئی تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس نے اپنے کرشن کے لئے سارا سنسار تیاگ دیا تھا۔ وہ ساری عمر جوگن بنی کرشن کے بھجن گاتی پھری۔

جدید دور میں اگر دیکھا جائے تو فلمی دنیا میں چند خواتین موسیقاروں نے اپنا نام پیدا کیا ہے۔ لیکن مرد موسیقاروں کے مقابلے میں وہ اس میدان میں کوئی بڑا نام پیدا نہیں کرسکیں اور ان کی شہرت زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ وہ منظر پر وارد ہوئیں اور کوئی پائیدار تاثر قائم کئے بغیر رخصت ہوگئیں۔

لوریاں، لوک رسوم اور سماجی تفریق

ڈاکٹر صبیحہ حفیظ

لڑکیوں کی پرورش ایسے ماحول میں ہوتی ہے جہاں وہ مستقل سماجی تفریق کا شکار رہتی ہیں اور ان کے ساتھ مسلسل امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

پیدائش سے بالغ ہونے تک لڑکیوں کو ایسی سماجی سرگرمیوں اور رسوم و رواج کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے جو اس تفریق اور امتیاز کو جنم دیتے ہیں، انھیں پروان چڑھاتے ہیں اور انھیں مضبوط کرتے ہیں۔ ایسے رسوم و رواج کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ہم یہاں دو خاص رسموں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک رسم بچوں کو لوری سنانے کی ہے اور دوسری شادی بیاہ کے موقع پر پوری کی جانے والی رسمیں ہیں۔ یہ دونوں رسمیں فرد کو سماج کا حصہ بنانے کی محرک بھی ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ یہی وہ رسمیں بھی ہیں جو اپنے اندر سماجی تبدیلی کے بے شمار امکانات بھی رکھتی تھیں۔

آج کے زمانے میں لوریاں سنانے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے لیکن تین وجوہ ایسی ہیں جن کی بنا پر اس رسم کا تجزیہ ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ خواہ آج کل لوریاں سنائی جاتی ہوں یا نہ سنائی جاتی ہوں لیکن ان لوریوں سے اس معاشرہ کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار اور رسم و رواج کی عکاسی بہر حال ہوتی ہے۔ ان لوریوں سے لڑکے اور لڑکی کی جنس کا تعین کیا جاتا ہے اور سماج میں لڑکے اور لڑکی کے الگ الگ رول مقرر کیے جاتے ہیں۔ مختلف علاقوں کی لوریوں میں جو تھوڑے بہت اختلافات نظر آتے ہیں وہ ان علاقوں کی اپنی مقامی ثقافت، اعتقادات، توہم اور رسم و رواج کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوریوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی جنس کا جو الگ الگ تصور پیش کیا جاتا ہے وہ والدین کے رویوں اور ان کے سلوک میں اپنا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ہم ان لوریوں کو نہایت موثر طور پر مثبت مقاصد کے لئے بھی استعمال

کر سکتے ہیں۔ یعنی ہم ایسی لوریاں لکھ سکتے ہیں جن میں اس سماجی تفریق کو مضبوط نہ کیا جائے بلکہ ان سے نہ صرف بچیوں کی نشوونما میں مثبت پیش قدمی ہو سکے بلکہ یہ لوریاں جنس کی تفریق کے بغیر تمام بچوں کی مثبت نشوونما کا ذریعہ بھی بن سکیں۔

ابھی اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے کہ پاکستان کے معاشرہ میں لوریاں سنانے کا رواج کس حد تک کم ہوا ہے۔ اس لئے اس سماجی رسم کے خاتمہ کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ والدین کے ذہنوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی جنس کا الگ الگ تصور اور ان کے ساتھ مختلف سلوک کو روا رکھنے کی عادت اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہے۔ خود لڑکی کے اپنے ذہن میں بھی اس کی اپنی ذات کا تصور ایسا ہی ہے اور اس حساب سے وہ اپنے ساتھ خود بھی سلوک کرتی ہے اور دوسروں سے بھی ایسے ہی سلوک کی توقع رکھتی ہے۔

مختلف علاقوں کی لوریوں میں سے 86 لوریوں کے الفاظ اور موضوع کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ (الف) لوریوں میں لڑکیوں کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ 86 میں سے 65 میں صرف لڑکوں کا حوالہ ہے' 17- ایسی ہیں جن میں کسی جنس کا بھی ذکر نہیں ہے' مشکل سے چند لوریاں ہی ایسی ہوں گی جن میں لڑکی کا ذکر نظر آ جائے گا۔ ان لوریوں میں لڑکے کو ایک آدرش روپ میں پیش کیا گیا ہے اور لڑکی کو حقیر اور کم تر درجہ دیا گیا ہے۔ ان لوریوں میں لڑکے کی جن امنگوں اور آرزوؤں کا ذکر کیا گیا جاتا ہے وہ اختیارات اور اقتدار کے حصول کے لئے ہیں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کی ان کی کوئی خواہش نظر نہیں آتی۔ ان لڑکوں کے خواب خالص جاگیردارانہ معاشرہ کے خواب ہیں۔ غریب طبقے کے بچوں کی امنگوں اور خوابوں کا وہاں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

جن لوریوں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے ان میں لڑکے اور لڑکی کی جنس کا تصور اس طرح پیش کیا گیا ہے 1-----

لڑکا

☆ فخر خاندان
نہایت قیمتی شے

چاند جیسا

ساری توجہ کا مرکز

خاص سلوک اور ہر قسم کے آرام و آسائش کا مستحق

عظیم الشان مخلوق

وہ شہزادہ جسے گلیوں میں گھومنے پھرنے اور زندگی کا پورا مزہ لوٹنے کا حق حاصل ہے۔

اس کے لئے ماں اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کر کے خوشی محسوس کرتی ہے۔

وہ بلند و بالا خواہشات رکھنے اور بڑے بڑے خواب دیکھنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔

وہ لیڈر ہے۔

قائد اور رہنما ہے۔

قبیلے کا سردار ہے۔

ہزاروں گھوڑوں کا مالک ہے۔

اسے نظر بد سے بچانا ضروری ہے۔

مہمان نواز

سخی

راست باز

بہترین خوراک کا حق دار

گھوڑے کی طرح مضبوط اور طاقتور

بہادر اور نڈر

وطن کا محافظ

ماں کی جان کا ٹکڑا

ابو کا پیارا

شاہی خاندان کا وارث
بوبو خاں کا پوتا
شیر شاہ سوری کا بیٹا' اس کے بزرگوں میں احمد شاہ ابدالی اور محمود غزنوی شامل ہیں۔

لڑکی

☆ بھائی کے کھانے پینے سے جلنے والی
رعایتی سلوک کی حق دار
نیک شگون کے لئے بھائی کے ماتھے کا کالا ٹیکا
کھلونوں میں گھری ہوئی
خاندانی عزت ناموس کی امین
جو بھائی اور رشتے دار جنگ پر گئے ہیں انہیں پیار دینے والی۔

ہماری مجبوری ہے کہ ہمیں جو لوریاں مل سکی ہیں وہ لوک ورثہ کی کتاب (1980ء) سے ملی ہیں۔ مصنف نے لڑکوں اور لڑکیوں سے متعلق الگ الگ لوریاں تلاش نہیں کی ہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ مصنف کی دسترس تمام لوریوں تک تھی یا نہیں لیکن ایسی لوریاں بھی موجود ہیں جو صرف لڑکیوں سے متعلق ہیں۔ کتاب میں لڑکوں سے متعلق لوریوں کی کثرت دیکھ کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا متن کس حد تک درست اور مستند ہے اور جس طرح ان کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ کتنا صحیح ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تجزیہ کے لئے جو تیکنیک استعمال کی گئی ہے اس کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ ضرورت ہے کہ مزید اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور تجزیہ کے لئے نئی تیکنیک استعمال کی جائے۔

اسی طرح ہندکو لوریوں میں لڑکوں سے تو یہ امید لگائی گئی ہے کہ وہ ذاتی عظمت' گھوڑیوں کی ملکیت اور خصوصی سلوک کے مزے لوٹیں لیکن لڑکیوں کو کمزور' محرومی کا شکار اور تمام سہولتوں کے لئے کمتر درجہ دیا گیا ہے۔

پشتو' بلوچی اور براہوی لوریوں میں جنس کا تصور قبائلی نظام کے حوالے سے

پیش کیا جاتا ہے۔ ان لوریوں میں لڑکوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بہادر ہوں' اپنے شاہی خاندان کا فخر ہوں' جنگجو اور فاتح ہوں' اور اپنے وطن اور علاقے کے محافظ ہوں۔ اس کے بر عکس لڑکیوں کو صرف خاندانی عزت و ناموس کی حفاظت کرنے والی ہی بیان کیا جاتا ہے۔

ان لوریوں میں بہادری اور عزت و ناموس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جبکہ ہندکو لوریوں میں لڑکے کی خصوصی حیثیت پر زیادہ زور ملتا ہے جس میں علاقائی اقدار کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہندکو لوریوں میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ماں جن توقعات کا اظہار کرتی ہے وہ ایک قسم کی علامتی توقعات ہیں اوران کا مرکز دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ جبکہ پشتو بلوچی اور براہوی لوریوں میں توقعات کا مرکز اپنی ذات اور مادی فوائد ہوتے ہیں۔

اس بات کی ریسرچ کی ضرورت ہے کہ مختلف چھوٹے علاقائی اور قبائلی گروہوں میں لڑکوں اور لڑکیوں سے کی جانے والی توقعات نے کہاں تک مقامی رنگ اختیار کیا ہے اور یہ مقامی رنگ لڑکے اور لڑکی کی شخصیت سازی میں کس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ ابھی یہ ریسرچ ہونا تو باقی ہے لیکن اب تک کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ ماں اپنے بچے کو جو لوریاں سناتی ہے وہ اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دیتی ہے۔ مثلاً ایک لوری میں لڑکی اپنے بھائی کے کھانے پینے سے جلتی ہے اس کے بھائی پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

"آ بیٹے پی لے دودھ
کٹورہ بھر کے
پتہ نہ چلے تیری بہن کو اس کا"
(ہندکو لوری)

ایک اوسط دیہاتی لڑکی اسی معاشرتی معیار کو اپنا لیتی ہے اور اسے کھانے کو جو بھی روکھی سوکھی دی جاتی ہے وہ خاموشی سے کھا لیتی ہے۔ اس کے بر عکس اس کے بھائی کو گوشت کی بوٹیاں چن چن کر دی جاتی ہیں۔ لڑکی کو سب سے آخر میں کھانے کو ملتا ہے۔ وہ کھانا پکاتی ہے' کھلاتی ہے اور کبھی کبھی تو وہ بچا کھچا کھا کر ہی گزارہ کرتی ہے۔

اسے گھر سے باہر کھیلنے سے منع کیا جاتا ہے۔ اسے گھر کے کام کاج میں ہی مصروف رکھا جاتا ہے۔ اسے زیادہ بات کرنے اور زور زور سے ہنسنے پر بھی ڈانٹا جاتا ہے۔

البتہ جب وہ اسکول جاتی ہے تو اسے بھائی کی طرح گھی میں چپڑی روٹی اور دودھ دیا جاتا ہے۔ سکول جانے سے اس کے کھانے پینے کا معیار بھائی کے برابر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف سندھ میں کی جانے والی ایک کیس سٹڈی کا نمونہ ہی ہے' ابھی قومی سطح پر اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ضروریات اس بات کی ہے کہ اس بارے میں ریسرچ کی جائے کہ سکول جانے کی وجہ سے لڑکیوں کی خوراک جو بہتر ہوتی ہے اس کا اثر لڑکیوں کی شرح اموات میں کمی اور ان کی ذہنی و دماغی نشوونما پر بھی پڑتا ہے یا نہیں۔

متذکرہ لوریوں میں لڑکیوں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ مختلف سماجی حلقوں میں برسہابرس سے والدین کی اکثریت کے دل و دماغ میں گھر کرتے کرتے اب ایک سماجی رسم اور مستقل سماجی سانچہ بن گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ لوریوں میں پیش کی جانے والی یہ تصویریں والدین کے مزاج کا حصہ بن چکی ہیں۔

پانچ سال کی عمر کے بعد لڑکی سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی عادات اور اطوار میں اور اپنی ذات کے نظم و ضبط میں لڑکوں سے مختلف رویہ اختیار کرے۔ زور سے بولنے' شور مچانے یا لڑکوں کی طرح اچھل کود پر اسے ڈانٹا جاتا ہے اور اس کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ گھر کے مردوں کی عزت کرے۔ یہ نتیجہ اس تحقیق سے اخذ کیا گیا ہے جو پاکستان کے تمام صوبوں کے سولہ دیہات میں 449 عورتوں سے بات چیت کے ذریعہ کی گئی ہے (حسن 1982) اس تحقیق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دس سال کی عمر سے لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ لڑکی کو بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی تصویر بنے' گھر کے کام کاج میں حصہ لے اور لڑکوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کرے۔ پندرہ سال کی عمر میں لڑکی پر کڑی نظر رکھی جانے لگتی ہے۔ گھر سے باہر جانے' سکول کے لئے کتابیں وغیرہ خریدنے یا کپڑوں کی خریداری کے وقت اس پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اس گھر میں کمتر درجہ ملتا ہے۔ اس کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں اس عورت کی جو تصویر بنتی ہے وہ ایک ایسی عورت کی ہوتی ہے جو

دوسروں کے لئے قربانی دیتی ہے' فرماں بردار ہوتی ہے اور محنتی ہوتی ہے۔ اس سماجی سانچہ میں تبدیلی ناممکن نہیں ہے البتہ مشکل ضرور ہے۔

کئی وجوہ ایسی ہیں جن کو بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ لڑکیوں کی تصویر کو مثبت شکل دینے میں یہ لوریاں ایک موثر اور فعال محرک ثابت ہو سکتی ہیں۔ اول تو لڑکیوں کے تصور کے سلسلے میں نئی لوریاں لکھی جانا ضروری ہیں کیونکہ لوریوں میں ثقافتی اقدار اور مروج سماجی سانچوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ دوسرے لوریاں گانا ماں اور بچے کے انتہائی قریبی اور بے تکلف رشتے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ماں لوری گاتے ہوئے اپنی امنگوں اپنے خوابوں اور اپنی توقعات کو بچے تک پہنچاتی ہے اور اس طرح بچے کی جنس کے متعلق اپنی اقدار کو مضبوط کرتی ہے۔

اس طرح لوریاں ایک عام اور لوک ذریعہ ابلاغ کا روپ دھار سکتی ہیں ان کے الفاظ اور موضوعات میں تبدیلی کر کے سوال کرنے والے دماغ پروان چڑھائے جا سکتے ہیں اور ان سے لڑکیوں اور غریب بچوں کی مثبت تصویر والدین کے دماغ میں پیدا کی جا سکتی ہے۔یہ لوریاں ٹیلی وژن کے ڈراموں' فلموں یا خاص ویڈیو پروگراموں میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

لوریاں گانے کا رواج پیدائش سے دو سال کی عمر تک لڑکی پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے اور بالواسطہ طور پر ہر عمر کی لڑکی کو متاثر کرتا ہے۔ اس سے سماج میں ان کے اپنے رول اور اپنی ذات کے تصور کے بارے میں بعض خاص اقدار ان کے دماغ پر مرتسم ہوتی ہیں اور لڑکی سے متعلق معاشرہ کا رویہ اور اس کا سلوک مزید تقویت حاصل کرتا ہے۔

شادی سے متعلق رسوم و رواج

شادی بیاہ سے متعلق بہت سے سماجی رسم و رواج ہیں۔ جیسے جہیز' ولور' وٹہ سٹہ' بچپن کی شادی اور پرانے خاندانی جھگڑے نمٹانے اور قتل کا خوں بہا دینے کے لئے لڑکی کا ہاتھ دوسرے قبیلے کے مرد کے ہاتھ میں دینا۔ یہ رسوم و رواج کسی نہ کسی طرح عورت کی ذاتی شناخت اور اس کی حیثیت کا تعین کرتی ہیں۔

جہیز

جہیز کی رسم 18 سے 20 سال کی عمر کی لڑکیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سے یہ تصور بنتا ہے کہ وہ مالی اور اخلاقی اعتبار سے اپنے خاندان پر بوجھ ہے' اسے وراثت کے حق سے محروم کیا جاتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ لڑکی کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے اس کا انحصار جہیز کے بارے میں اس کے والدین کے رویہ پر ہوتا ہے۔ جہیز سے والدین کی سماجی حیثیت کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مالی طور پر اس قابل ہیں کہ لڑکی کے لئے اچھا شوہر حاصل کر سکیں۔

"ولور"

ولور کی رسم پاکستان کے بعض دیہات میں پائی جاتی ہے لیکن اس کا رواج عام نہیں ہے۔ اس کے مطابق شادی کے نام پر لڑکیاں فروخت کی جاتی ہیں۔ پختون معاشرہ میں لڑکی کو قیمتی شے مانا جاتا ہے اور اس کی قیمت اس کی شکل و صورت' قد کاٹھ او رخاندانی عزت و حیثیت کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ ایک لڑکی کی اوسط قیمت ایک لاکھ روپیہ ہے جو دولہا کا خاندان لڑکی کے والدین کو نقد ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ بکریاں وغیرہ بھی دی جاتی ہیں۔ اس میں کسی اور چیز کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ نوجوان لڑکی کسی بوڑھے' اندھے بہرے' دماغی یا جسمانی طور پر معذور یا چور' ڈاکو یا نشئی کے حوالے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس میں توجہ کے لائق بات یہ ہے کہ اس رسم میں ماں باپ کا پیار بھی کام نہیں آتا۔ اس رسم کو لڑکی کس طرح دیکھتی ہے اس کا اظہار درج ذیل "ٹنگی" میں ہوتا ہے۔

☆ ماں پیار سے مجھے پروان چڑھا رہی ہیں۔
باپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔
بھائی میرا زمین پر بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔
مگر جب نیلے نوٹ لینے کا زمانہ آتا ہے تو مجھے ان نوٹوں کے بدلے ہندوستان

کے دوسرے کونے پر بھیج دیا جاتا ہے۔

انگئی پشتو شاعری کی وہ قسم ہے جو بارات کی آمد پر دولہن کی گھر والیاں برجستہ گاتی ہیں۔ ابھی اس شاعری پر ریسرچ کی ضرورت ہے لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دولہن بننے والی لڑکی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے اور وہ اس پر احتجاج بھی کرتی ہے۔

ولور کی رسم لڑکی کو اپنے جسم' اپنے دماغ اور اپنی روح پر اعتبار سے محروم کرتی ہے اور انسانی عظمت کو بھی پامال کرتی ہے۔ یہ ماں باپ کے پیار کی بھی قربانی دیتی ہے۔

وٹہ سٹہ

وٹہ سٹہ میں لڑکیوں کا اس طرح تبادلہ کیا جاتا ہے کہ لڑکا جس لڑکی سے شادی کرتا ہے اس کے خاندان کے کسی فرد کے بیاہ میں اپنی بہن دیتا ہے۔ اس رسم سے لڑکا اور لڑکی دونوں اپنی مرضی اور عمل و اظہار کی آزادی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے اندر غم و غصہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بھی لڑکی کو ہی زیادہ مصیبت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ایک انگئی میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

سفیدی کئے دروازے پر ایک چڑیا بیٹی ہے
اے چاچی' میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے
جب سے میں پیدا ہوئی ہوں' میں نے کوئی خوشی نہیں دیکھی
بچی تھی تو ماں مر گئی
اس کے بعد سے میرا چھوٹا بھائی میرے اوپر ظلم ڈھا رہا ہے
کاش وہ مجھے وٹہ سٹہ کی شادی سے بچا لیتا۔

خاندانی دشمنی ختم کرانے کیلئے شادی

پرانی دشمنی ختم کرانے یا قتل کا خون بہا دینے کے لئے ایک قبیلے کی لڑکی دوسرے قبیلے کے کسی مرد کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ لڑکی چونکہ اپنی جنس کے اعتبار

سے کمزور ہوتی ہے اس لئے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس سے بذات خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ درج ذیل انگئی میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے۔

☆ سفیدی کئے ہوئے کمرے سے میں باہر نکلتی ہوں
خدا کی مرضی ہے کہ تیرا نام اس دنیا سے مٹ جائے
چاچا نے قتل کیا مگر سزا مجھے ملے گی
آہ ڈھول تاشے والے آئیں گے اور ناچیں گے گائیں گے
میں اپنی قسمت کو کوستی ہوں جس نے مجھے گائے کے برابر بنا دیا ہے
مجھے ذبح کیا جا رہا ہے۔

بچپن کی شادی

پاکستان میں بچوں کی شادی قانونی طور پر ممنوع ہے لیکن بعض علاقوں میں ایسی شادیاں ہوتی ہیں۔ بچپن کی شادی اور ولور کی رسم میں گہرا تعلق ہے۔ بچپن میں اس لئے شادی کر دی جاتی ہے کہ عمر کے ساتھ لڑکی کی قیمت بڑھتی جائے گی۔ اس رسم کی وجہ سے لڑکی اپنی مرضی ااور اپنے اختیار سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کے لئے بچپن کی آزادی اور کھیل کود بھی حرام ہو جاتا ہے۔ وہ سیکھنے کے تجربات سے بھی محروم رہتی ہے۔ درج ذیل انگئی میں لڑکی احتجاج کر رہی ہے۔

☆ روپیہ سفیدی کئے ہوئے کمرے سے باہر پڑا ہے
اس روپے کے بدلے میں بھائی نے بچپن میں میری منگنی کرا دی
اے بہن' میرا رونا پیٹنا صحیح ہے' کیونکہ میرا منہ ابھی تک ماں کے دودھ سے بھرا ہوا ہے
اور میرا اپنا گھر یہاں سے قریب ہے' اگر میں بھولپن میں بلا ارادہ کوئی غلطی کر بیٹھوں' تو میرے سسرال والے سمجھیں گے کہ میں انہیں تنگ کر رہی ہوں۔

تعلیمی اور قانونی نظام میں تبدیلی

تعلیمی اور قانونی نظام تبدیلی اور کنٹرول دونوں کے کام آتے ہیں۔ مختلف

درجوں کی نصابی اور عام پسند کی کتابوں میں جو متن پیش کیے جاتے ہیں وہ اس اعتبار سے اہم ہیں کہ وہ اس زندگی کا نقشہ سامنے لاتے ہیں جس سے لڑکے لڑکیوں کو ترجیحی بنیاد پر واسطہ پڑتا ہے۔ اور جس زندگی کو وہ اپناتے ہیں۔ بعض تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ نصابی کتابیں لڑکی کے خلاف امتیازی سلوک کو تقویت پہنچاتی ہیں ایک مطالعہ (انور- 1982) کی بنیاد مختلف درجوں کو 105 کتابوں پر رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں میں 3819 انسانی کرداروں کا مطالعہ کیا گیا۔ ان میں 81 فیصد لڑکیوں کو کھانا پکاتے' گھریلو کام کاج کرتے' صفائی کرتے اور کپاس چنتے دکھایا گیا ہے۔

اس مطالعہ کا موازنہ متذکرہ لوریوں سے کیا گیا تو پتہ چلا کیا دونوں میں لڑکیوں کا بالکل ذکر نہیں ملتا۔ لڑکیوں کی پرورش میں پردہ اور لڑکوں سے انہیں الگ تھلگ رکھنے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ گویا یہی عام رواج ہے۔ اس تاثر کو نصابی کتابوں کے مطالعہ سے بھی تقویت ملتی ہے' ان میں بالغ عورتوں کو بالکل ہی نکال دیا گیا ہے۔ ان نصابی کتابوں سے' جو 15 سے سولہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں پڑھتی ہیں بالغ عورتوں کے رول ماڈل کو بالکل ہی خارج کر دیا گیا ہے۔

اس پر خواندہ بالغوں کے لئے لکھی جانے والی 79 کتابوں کا جو مطالعہ (حفیظ- 1984) کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے متن میں لڑکیوں کے ساتھ برے سلوک کا اظہار ہی ہوتا ہے۔ یہ کتابیں ان بالغوں کو پڑھائی جاتی ہیں جو والدین کی حیثیت سے ان کتابوں میں دیئے جانے والے پیغام سے براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ اس مطالعہ سے پتہ چلا کہ :-

1۔ اگرچہ ماں کی ذمہ داریوں میں بچوں کی پرورش کو بہت اہم قرار دیا گیا ہے لیکن صرف چھ مقامات پر سماجی عمل میں چھوٹی بچی کے کردار کا حوالہ آتا ہے۔ ان میں سے تین میں لڑکیوں کا مجہول یا انفعالی کردار ہے (لڑکے کے مجہول کردار کا کوئی ذکر نہیں ہے) دو جگہ لڑکوں کے فعال کردار کا اور صرف ایک جگہ لڑکی کے فعال کردار کا ذکر ہے۔

2۔۔ لڑکوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پڑھائی میں ہر لحاظ سے آئیڈیل ثابت ہوں۔ لڑکی سے کسی ایسی توقع کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

3۔۔ والدین کی بہت ہی مختصر تعداد ایسی دکھائی جاتی ہے جو اپنی لڑکیوں کو استاد یا ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔

4۔۔ لڑکے کو خصوصی توجہ اور خاص سلوک کا مستحق مانا جاتا ہے۔

5۔۔ لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت اس غلط تصور کی وجہ سے کی جاتی ہے کہ پڑھ لکھ کر وہ "آزاد" ہو جائیں گی اور فیشن کرنا شروع کر دیں گی جس سے خاندان کی بے عزتی ہو گی۔

6۔۔ لڑکے کی پیدائش سے پہلے ہی والدین اس کی اچھی تعلیم کے آرزومند ہوتے ہیں۔

7۔۔ ظاہری طور پر بالغ عورت کو فعال کردار سونپا جاتا ہے اور چھوٹی لڑکی کو مجہول کردار مگر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر یا اتفاقیہ طور پر ہی عورت کو یہ فعال کردار دیا جاتا ہے اس کے لئے بچپن سے اسکے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

8۔۔ ان کتابوں سے عورت اپنے حقوق کے بارے میں کچھ بھی نہیں سیکھتی جبکہ وہ گھروں میں لڑکیوں کے ساتھ کئے جانے والے برے سلوک کے بارے میں بہت کچھ پڑھتی ہے۔ لڑکے کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رکھتا ہے جبکہ لڑکی کو اس سلسلے میں مسلسل ڈانٹ پڑتی دکھائی جاتی ہے۔ لڑکے کو دکھایا جاتا ہے کہ وہ راست بازی اور استقامت کا نمونہ ہے جبکہ لڑکی کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ صحیح معیار قائم رکھنے کا اسے سبق سکھانا ضروری ہے۔

نصابی اور عام پسند کتابوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے اس پر ابھی مزید ریسرچ کی ضرورت ہے لیکن متذکرہ مطالعہ اور تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں اساتذہ اور ماہرین تعلیم کو ان پر غور و خوض اور بات چیت کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لئے صرف زیادہ تعداد میں بہتر کتابیں لکھنے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ کتابوں میں لڑکیوں کی بہتر تصویر بھی پیش کرنا چاہیئے۔ ایسی تصویر جس میں لڑکی کی عظمت' اس کے مثبت شخصی پیکر اور مساوی سلوک پر زور دیا جائے۔

قانونی نظام بھی سماج کا حصہ بنانے اور کنٹرول کرنے کا بہت ہی طاقت ور اور موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ نظام بنیادی طور پر یہ طے کرتے ہیں کہ لڑکی کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں کر سکتی۔ قوانین کے ایک سرسری جائزے سے ایسے تضادات کا بھی پتہ چلتا ہے جن سے لڑکی کی حیثیت کے بارے میں سخت کنفیوژن اور الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جب تک لڑکی کی قانونی حیثیت واضح نہیں ہو گی اس وقت تک معاشرتی تفریق برقرار رہے گی۔ مثال کے طور پر مختلف قوانین میں لڑکی کی عمر کے بارے میں مختلف باتیں کی گئی ہیں۔

پاکستان کے آئین کی رو سے اٹھارہ سال سے کم عمر کا انسان "بچہ یا مائنر" مانا جاتا ہے لیکن قانون کے مطابق کوئی بھی لڑکی والدین کی مرضی سے سولہ سال کی عمر میں اور ان کی مرضی کے بغیر اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کر سکتی ہے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر جو بچوں کے جو پروگرام پیش کئے جاتے ہیں وہ بارہ سال سے کم عمر کے لڑکوں لڑکیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ ریل اور بسوں میں بارہ سال سے اوپر کے لڑکے لڑکی کے لئے پورا ٹکٹ خریدنا لازمی ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے بچے کے نوکری یا مزدوری کرنے پر پابندی ہے چودہ سے سترہ سال تک کے لڑکے لڑکیاں قانونی تحفظ میں کام کر سکتی ہیں۔ ہائی سکول کا امتحان دینے کی کم سے کم عمر 15 سال مقرر ہے۔ رمضان کے مہینے میں بارہ سال سے زیادہ عمر کے بچے کو روزہ خوری پر سزا دی جا سکتی ہے۔ حدود آرڈی ننس کے تحت بارہ سال یا اس سے کم عمر لڑکی اس سزا کی مستوجب ہے جو بالغ عورت کو ملتی ہے۔

چنانچہ جب تک قوانین میں لڑکی کی واضح تعریف نہیں کی جائے گی اس وقت تک اس کے حقوق بھی پوری طرح واضح نہیں کئے جا سکتے اور مختلف سماجی سرگرمیوں میں اس کے کاندھوں پر جن ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے ان پر بھی کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی صورت حال میں اس کے خلاف امتیازی سلوک یقیناً برقرار رہے گا اور اس کے قانونی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کے بغیر اس کے کاندھوں پر بے شمار سماجی ذمہ داریاں ڈالی جاتی رہیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لڑکی سے متعلق تمام قوانین کا بغور جائزہ لیا جائے اور ان میں مناسب ترامیم کی جائیں۔

مختلف سطحوں پر لڑکی کے ساتھ جو امتیازی سلوک اور اس کے ساتھ جو تفریق کی جاتی ہے وہ معاشرتی یا انسانی رویے کا مسئلہ ہے۔یہ ایسی نامناسب صورت حال ہے جو بچیوں کی وسیع تعداد پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ٹیلی وژن اور عورت

شیریں پاشا

گزشتہ 28 سال میں پاکستانی ٹیلی وژن پر عورت کا جو روپ پیش کیا گیا ہے اس پر ناظرین کی طرف سے بے نیازی اور بے اعتنائی کے سوا کبھی کسی اور قسم کے شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مردوں کے اس متعصب معاشروں میں عورت اسی طرح جبر کی چکی میں پس رہی ہے۔

یہ بے نیازی اور بے اعتنائی اس لئے اور بھی افسوسناک اور تشویش انگیز ہے کہ چند عشرے پہلے جن گھروں میں باہر کا کوئی آدمی جھانک بھی نہیں سکتا تھا وہاں ایسی ٹیکنالوجی پہنچ گئی ہے جو انسانی زندگی میں انقلاب لاسکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان گھروں میں اب بھی ان فرسودہ اقدار کو ہی زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے جو معاشرہ کے لئے افیون کا درجہ رکھتی ہیں۔ حالانکہ اس معاشرہ کو جگانے اور جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے بارے میں سوچ سکے اور اپنا تجزیہ کر سکے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے دوسرے تحفوں کی طرح ٹیلی ویژن بھی ایسا تحفہ ہے جو اپنے کنٹرول کرنے والوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ہی کام آرہا ہے۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا آلہ ہے جو معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ اپنے ناظرین کو دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔ انہیں گمراہ بھی کر سکتا ہے۔

پاکستان میں 1964 میں جب ٹیلی وژن قائم کیا گیا تو اعلان یہ کیا گیا تھا کہ اسے تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ لیکن جلد ہی حکمرانوں کو یہ احساس ہوگیا کہ اسے رائے عامہ ہموار کرنے کے کام بھی لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ 1967ء - 1968ء میں ہی حکومت نے اس کے حصص خرید لئے تھے۔ اس کے بعد سے ٹیلی وژن' پوری پابندی اور نہایت فرماں برداری سے ہر حکومت کی خدمت کر رہا

ہے۔ اس حقیقت کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے کہ ابلاغ عامہ کا یہ وہ ذریعہ ہے جو ایک پابند معاشرہ کو آزادی اور روشن خیالی کے راستے پر گامزن کر سکتا ہے۔

ٹیلی وژن کو ایک خودمختار ادارہ کیوں نہیں بنایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کبھی صحیح معنی میں جمہوری روایات پنپ ہی نہیں سکیں۔ کسی حکومت نے بھی اتنے طاقت ور میڈیا کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ کسی حکومت نے ایسا چینل نہیں بنایا جو ٹیلی وژن کی آزادانہ پالیسی کا تحفظ کر سکے۔ پاکستان ٹیلی وژن کی مختصر سی تاریخ میں ایسے کئی موقع آئے ہیں جب حکومت نے عوامی حمایت نہ ہونے کے باوجود ٹیلی وژن کے ذریعہ اپنا سیاسی مقصد حاصل کرلیا۔ اس وقت اگر ٹیلی وژن نہ ہوتا تو حکومت وہ سیاسی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ پاکستان میں ہر حکومت اسے سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتی رہی ہے۔

ٹیلی وژن کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی انتہا اس وقت ہوگئی جب 1980ء کی دہائی میں اس کے پروگراموں کا ڈھانچہ بھی بدل دیا گیا۔ اس دور میں جس انداز سے ٹیلی وژن کو استعمال کیا گیا اس کا مقابلہ فسطائی حکومتوں کی پالیسی سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کے لئے اس طرح ایڈٹنگ کی گئی کہ جس چیز کا کوئی وجود نہیں تھا وہ جیتی جاگتی حقیقت بن گئی۔ خبروں میں جن واقعات یا جن جلسوں جلوسوں کی اہمیت ختم کرنا چاہا ان کا ساؤنڈ ٹریک بھی بند کردیا گیا۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔

ٹیلی وژن پر اس جعل سازی اور ان چالاکیوں نے 26 سال کے اندر عام ناظرین کی ایسی برین واشنگ کی ہے کہ اب ان کے اندر کسی بات پر بھی کوئی ردعمل پیدا نہیں ہوتا۔ ناظرین بے حس اور بے عمل جاندار کی طرح ٹیلی وژن دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ ان کی برین واشنگ کی جارہی ہے۔ عام ناظرین کسی بھی مثبت یا منفی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو عورت کے کردار کو ٹیلی وژن پر جس بے دردی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اسے بھی سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ ٹیلی وژن کے

پروگراموں میں عورت کا کردار صحیح یا غلط طور پر جس طرح بھی پیش کیا گیا اسے ہمیشہ حکمرانوں نے اپنے مقاصد کے لئے ہی استعمال کیا۔ بعض اوقات متوسط طبقے کے اس جابرانہ کلچر کو بھی پیش کیا گیا جس میں عورت بری طرح کچلی جا رہی ہے لیکن وہاں بھی ان مسائل اور ان اقدار کو بالکل نہیں چھیڑا گیا جن پر حملہ کرنے اور جنہیں تہس نہس کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

ٹیلی وژن کے پردہ پر جو عورت پیش کی جاتی ہے وہ ہمارے معاشرہ کی نمائندگی نہیں کرتی۔ عورتوں کی اکثریت جو محنت مشقت کرتی ہے اسے کبھی ٹیلی وژن پر پیش نہیں کیا جاتا۔ اس کی محنت کو کبھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ نہایت خطرناک رجحان ہے کیونکہ کام کا 60 فیصد بوجھ عورت ہی برداشت کرتی ہے۔ لیکن ٹیلی وژن پر محنت مشقت کرنے والا مرد ہی دکھایا جاتا ہے جو عورت کے لئے روزی روٹی کماتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مرد اور عورت الگ الگ مخلوق ہیں۔

ٹیلی وژن کے پروگراموں میں (جن میں خبریں' کمپیئرنگ' موسیقی' ڈرامہ اور اشتہار سبھی شامل ہیں) عورت کا ایک بندھا ٹکا روپ پیش کیا جاتا ہے۔ عورت جو اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہے' بے سہارا ہے' فرماں بردار ہے اور کسی بھی ظلم پر آواز اٹھائے بغیر اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ اگر وہ کسی مسئلے پر کوئی مثبت یا ترقی پسندانہ رویہ اختیار کرتی ہے تو اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔ اسے ایسا سبق سکھایا جاتا ہے کہ اس جیسی ساری عورتیں ہمیشہ یاد رکھیں۔ اگر وہ کام کرتی ہے یعنی کہیں ملازمت وغیرہ کرتی ہے تو دکھایا جاتا ہے کہ وہ اچھی ماں اور اچھی بیوی نہیں ہے۔ عورت کو جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے "وہ خالصتاً" رجعت پسندانہ انداز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ معاشرہ میں ایسے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جو کسی بھی ترقی پذیر قوم کے لئے فائدہ مند نہیں ہیں۔

توقع تو یہ کی جاتی ہے کہ ہمارے جیسے پابند معاشرہ میں ٹیلی وژن کے ذریعہ روشن خیالی اور ترقی کے دروازے کھل جائیں گے اور لوگ سماجی تبدیلی اور انقلاب کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن ہمارے ٹیلی وژن نے فرسودہ اقدار کو نہ صرف برقرار رکھنے میں مدد کی ہے بلکہ اپنے ناظرین میں دقیانوسی خیالات و افکار کو مزید پروان چڑھایا ہے۔ خوبصورت خوبصورت چہرے' جدید ترین فیشن' بڑے بڑے

آراستہ و پیراستہ گھر تو پیش کئے جاتے ہیں لیکن ان میں رہنے والے سوچ بچار سے عاری ہوتے ہیں۔ ان کے پاس غور و فکر کرنے والا دماغ ہی نہیں ہوتا ــــــ

خواتین ڈرامہ نگاروں پر بھی یہ پابندی ہوتی ہے کہ وہ روشن خیالی اور بغاوت پیدا کرنے والے خیالات کے بجائے ایسے خیالات پیش کریں جن سے مشرقی معاشرتی روایات کی پاسداری کا رجحان پیدا ہو۔ ایسے معاشرہ کو متوازن معاشرہ کہا جاتا ہے۔

ان پابندیوں اور اس قسم کے سنسر کے بعد ٹیلی وژن پر جو کردار نظر آتے ہیں وہ کاغذی کردار ہی ہوتے ہیں۔ گلی کوچوں کی اصل زندگی، ننگی حقیقت اور اصلی آوازیں پیش کرنے پر پابندی ہے۔ انہیں جمالیاتی اقدار کے خلاف قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان سے کراہت آتی ہے۔

حقیقت کا اصل روپ پیش کرنے والی دستاویزی فلمیں ٹیلی وژن کے لئے شجر ممنوعہ ہیں۔ اس کے بجائے جو دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان میں صرف اور صرف سیاسی پروپیگنڈہ ہی ہوتا ہے۔

پاکستان کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہاں صرف ایک ہی کلچر اور ایک ہی ثقافت ہے۔ اس قسم کی یک جہتی پر اتنا زور دیا جاتا رہا ہے کہ اب کھوکھلے نعروں کے سوا اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہی ہے۔ رنگا رنگ ثقافتوں اور مختلف علاقائی زبانوں اور رسوم و رواج کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پورا معاشرہ شکوک و شبہات کا شکار ہوگیا ہے۔

ٹیلی وژن پر عورت ایک آرائشی چیز کے پر پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک محنت کش، ایک ماں اور مرد کی رفیق کار کے طور پر، معاشرے کے لئے جو کام کر رہی ہے اس کی نفی کردی جائے۔ عورت کا ایسا کردار پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو ناظرین پہلے ہی نیند میں ہیں انہیں اور افیون دیدی جائے۔

اس رویئے نے ہماری قومی ترجیحات کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی اور خواندگی کی شرح بڑھانے کے عمل پر اس کے برے اثرات مرتب ہوئے ہیں حالانکہ پاکستان کی ترقی اور خوش حالی کا انحصار انہیں ترجیحات پر ہے۔

ٹیلی وژن پر ایسے پروگرام پیش ہی نہیں کئے جاسکتے۔ ان پر پابندی ہے حتیٰ کہ "حمل ٹھہرنے" کا لفظ بھی ٹیلی وژن پر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں میں ٹیلی وژن سے قومی بیداری اور تعلیمی فروغ کے لئے کام لیا جارہا ہے۔ وہاں بھی تجارتی مجبوریاں ہیں۔ انہیں بھی اشتہاروں کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس آمدنی کے لئے، انہیں اشتہار دینے والی کمپنیوں کے مفادات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے عوام کی تربیت کا راستہ نکال لیا ہے۔ وہاں پروگراموں میں عورت کے اس کردار کو نشانہ بنایا جاتا ہے جو صدیوں سے اس پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قومی بیداری اور ترقی کے لئے ایسا کرنا نہایت ضروری ہے لیکن پاکستان میں گزشتہ 28 سال سے حکومت کی نگرانی میں جو پروگرام پیش کئے جارہے ہیں وہ فرسودہ اور دقیانوسی طاقتوں کو ہی تحفظ دے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پاکستان میں روشن خیالی اور خود افروزی کا ماحول پیدا ہونے کے بجائے حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دقیانوسیت اور رجعت پسندی کے گڑھے میں گرتے جارہے ہیں۔

عورت بطور ہیرو

سکریتا پال کمار

حقوق نسواں کی روشن خیال تحریک اور "جدیدیدیت" کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ دونوں عالمی جنگوں کے بعد جب سیموں دی بوار نے اس بارے میں لکھا تھا کہ اس کے نزدیک حقیقت میں عورت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تو دراصل اس نے سارتر کی وجودیت کے تناظر میں ہی ایک نہایت سنجیدہ کام کا آغاز کیا تھا۔ سیموں نے جب دعویٰ کیا کہ اس کی جنس اس کی عملی زندگی میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی تو سارتر نے کہا تھا "کہ پھر بھی تمہاری پرورش لڑکے کی طرح نہیں ہوئی ہے۔ تمہیں اس مسئلے کا بھی بغور جائزہ لینا چاہئے۔" سیمون کی کتاب Second Sex اصل میں عورت کے موضوع پر سارتر کے فلسفہ وجودیت کے اطلاق کا ہی نتیجہ ہے۔ یعنی کسی کتاب میں پہلی بار عورت کو "نسبتاً" واضح طور پر سامنے رکھا گیا تھا۔ کم سے کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ پہلی بار یہ تصور پیش کیا گیا کہ ہر فرد ایک مکمل خود مختار انسان کی حیثیت سے اپنی تکمیل کا آرزو مند ہوتا ہے اور وہ فکر و عمل کی پوری آزادی چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کبھی یا کہیں کوئی کوتاہی ہو جائے تو فرد اس کا اخلاقی طور پر ذمہ دار ہوتا ہے اور بے عملی یا کسی غلط کام پر اس کا مجبور ہو جانا غلط اور بری بات ہے۔ سیمون دی بوار کا خیال ہے کہ عورت' مرد کے جبرو استبداد کا شکار ہے اور مرد نے عورت کا جو تصور قائم کر رکھا ہے' عورت خود اس تصور کو قبول کر کے سنگین غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔ صنف نازک کا پورا تصور وہی ہے جو صدیوں سے جاری ہماری تعلیم اور ہماری تہذیب نے ہمارے اوپر مسلط کیا ہے۔ عورت کے صنف نازک ہونے اور اس کی نسائیت کی جو متھ صدیوں سے چلی آرہی ہے' اس نے عورت کو پوری طرح آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کی اس کمتر حیثیت کو

ہمارے روایتی اور مسلمہ تنقیدی تناظر نے دوام بخشا ہے۔ البتہ گزشتہ چند عشروں میں حقوق نسواں کے قائل دانشوروں نے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ ادب میں عورتوں کے نہایت اہم کام اور تجربے کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ چند خواتین مصنفوں کو غلط انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ادب میں عورت کو ماں' پرورش کرنے والی' تخلیقی عمل پر اکسانے والی اور پیار کرنے ولی کے روپ میں ہی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اسے "شکتی" مانا گیا جو ازلی قوت ہے۔ وہ پاکباز اور مرد کے لئے تکلیفیں برداشت کرنے والی بیوی ہے یا پھر وہ جادوگرنی ہے۔ عام زندگی کی طرح ادب میں بھی اسے مرد کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ہی دی جاتی رہی ہے حتیٰ کہ مرد کی زندگی میں اس کا رول ثانوی ہی ہوتا ہے۔ سیتا یا گرا۔لہٰذا شکتی یا یا اشتار اور موہنی یا "سرسی" کی متھ میں بھی عورت کو ایک مکمل لیکن جامد عورت کے طور پر ہی پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنے اس "آدرشی قید خانے" میں بند ہے۔ یہاں عورت کے بلئے اپنی شخصیت کی نشوونما اور اپنی ذات کا شعور حاصل کرنے کی گنجائش ہی نہیں رکھی جاتی۔ عورت کا یہ مسلّمہ روپ صرف اسی صورت میں نابود ہو سکتا ہے کہ مردوں کے قائم کئے ہوئے اس تصور کو ہی پارا پارا کردیا جائے۔

آزادی کے بعد تعلیم کے فروغ' معاشی میدان میں توسیع' روایتی طرز فکر اور پرانے رسوم و رواج میں تبدیلی نیز مغربی تہذیب کے اثرات نے شہری عورتوں میں ایسا شعور ابھارا کہ ان کے اندر بیداری کا ایک سیلاب آگیا۔ اس کے ساتھ ہی مردوں کی بالا دستی اور قدیم روایات میں جکڑے معاشرہ کے ساتھ ان کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ اب عورت کو ایک رومانی شخصیت کی بجائے اس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ پہلے اسے ایک مثالی کردار دیا جاتا تھا لیکن اب وہ جیتی جاگتی ہنستی بولتی اور دکھ سہتی شخصیت بن گئی۔ یوں تو عورت ثقافتی زندگی کی مرکز و محور مانی جاتی تھی لیکن دراصل وہ گھر کی چار دیواری میں بند اور رسوم و رواج میں جکڑی ہوئی ایک ایسی ہستی تھی جس کا وجود مرد کے سایے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ چونکہ عورت بچے پیدا کرتی ہے اور اس کی جسمانی ساخت ایک خاص قسم کی ہے۔ اس لئے یہ طے کرلیا گیا تھا کہ وہ عام زندگی کے

معاملات میں پوری طرح حصہ نہیں لے سکتی۔ لیکن آزادیٔ نسواں کی تحریک کے بعد اس کی جسمانی ساخت اور طبیعاتی عمل کے باوجود اسے مکمل انسان کے طور پر توجہ کا مرکز بنا لیا گیا ہے۔ تاہم مردوں کے اس معاشرہ میں چونکہ ماں بننے کا تجربہ مردوں کے دائرہ سے باہر ہے' اس لئے عورت کو اصل حقیقت سے دور کر کے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کبھی تو اسے ماں کے روپ میں ایسا اعلیٰ اور ارفع مقام عطا کیا گیا کہ وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نظر نہیں آتی اور کبھی ماں بننے کے عمل کو ایک ایسی خامی قرار دیا گیا کہ فرد کی حیثیت سے اس کی نشوونما کے راستے کی رکاوٹ بن گیا۔ مردانہ معاشرے میں خود عورت کا اپنا لاشعور بھی ایسی ہیئت اختیار کر گیا کہ عورت کی حیثیت سے اپنے تجربات کا سچا اظہار کرنے میں اسے جھجھک محسوس ہوتی تھی۔ اس طرح انسانی تجربہ کا بڑا حصہ تخلیقی فن کار کی دسترس سے باہر ہی رہا۔ اسے دریافت ہی نہیں کیا جا سکا۔ ثقافتی جبر کی وجہ سے اتنا اہم انسانی تجربہ اظہار و ابلاغ کی ہیئت اختیار ہی نہیں کر سکا۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ حقوق نسواں کی تحریک اور نفسیاتی تحلیل نے ان تحریمات اور ان پابندیوں کو توڑا جو عورت کی کائنات دریافت کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ عورت کے گرد صدیوں سے اسرار کا جو پردہ کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس نے اسے ایک چھوٹی سی اور محدود دنیا کی چار دیواری میں بند کر دیا تھا' پھر اردو میں رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی تخلیقات اور انگریزی میں سلویا پلاتھ اور این سیکسٹن کی شاعری نے عورت کے اصل اور سچے تجربے کو تخلیقی ادب کا حصہ بنایا۔ اس طرح عورت کی ماہواری' بچے پیدا کرنا اور مرد کے ساتھ آزادانہ تعلق ایسے موضوع بن گئے جن کے بیان پر اب کوئی پابندی نہیں رہی۔ لکھنے والوں میں عورت اور مرد کے تجربات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کے تجربات کی دنیا مرد کی دنیا سے کتنی مختلف ہے۔ حتیٰ کہ اس کے موضوعات بھی مختلف اور اس کا اسلوب بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ جدید "نو نسوانی نظریات" کے حامی نقادوں نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ لکھنے والے کی جنس جملوں کی ساخت اور کبھی کبھی زبان کے استعمال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندی کے افسانہ نگار راجی سیٹھ تو یہ بھی کہتے

ہیں کہ لکھنے والوں میں عورت کو الگ خانہ میں رکھ کر دیکھنا چاہیے کیونکہ عورت ایک خاص حوالے اور اپنے خصوصی تجربات کی روشنی میں لکھتی ہے۔ اسی طرح جس طرح مرد اپنے خاص تجربات کے حوالے سے لکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ـــــ

"دونوں (مرد اور عورت) اپنے الگ الگ ثقافتی اور معاشرتی حوالوں کے اندر رہتے ہوئے لکھتے ہیں' ان کے ذہنی و جسمانی دباؤ اور کھنچاؤ مختلف ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت میں معاشرتی قبولیت کی سطح بھی مختلف ہوتی ہے۔ وہ اخلاق کے واضح دوہرے معیاروں میں زندہ ہوتے ہیں اور ان کے حقوق و فرائض کا دائرہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ ان دونوں کی شخصیت کی تشکیل مختلف انداز میں کرتا ہے۔ ان دونوں کی آویزش اور جدوجہد کے میدان بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔"

مغربی دنیا ہو یا ہماری اپنی دنیا' ہر جگہ عورت کی تخلیقات کو اتنی کم اہمیت دی جاتی ہے کہ اس پر خواتین مصنفوں کی طرف سے بار بار احتجاج کیا گیا ہے۔ اردو کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو نے میرے ساتھ ایک مکالمے میں اس پر سخت افسوس کا اظہار کیا اور زبردست احتجاج بھی کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مرد نقاد خواتین لکھنے والیوں کے ساتھ سرپرستانہ رویہ اختیار کرتے ہیں یا پھر انہیں بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خواتین لکھنے والیاں ان کے نظر کرم کی محتاج ہوتی ہیں کیونکہ ادب کی دنیا پر بھی مردوں کا ہی قبضہ ہے۔ اسی وجہ سے مغرب میں "حقوق نسواں کی تنقید" نے جنم لیا ہے جسے ٹوریل موائی ایک خاص انداز کا مکالمہ کہتی ہے' یعنی ایک ایسا تنقیدی اور نظریاتی عمل جو مردانہ پدری نظام اور جنسی امتیاز کے خلاف ہے اور جو ادب میں محض عورت یا مرد کی جنس کے حوالے کو ہی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان کے مخصوص جذبات اور تجربات سے بھی بحث کرتا ہے۔ کیٹ میلٹ نے اپنی کتاب SEXUAL POLITICS میں لکھا ہے کہ حقوق نسواں سے متعلق نقادوں اور نظریہ سازوں کا کام یہ ہے کہ ادبی اور ثقافتی میدان میں عورتوں پر مردوں کی بالادستی کا پردہ چاک کریں اور وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ ہمارے کلچر کا جو سب سے نمایاں پہلو ہے اس کا تعلق بنیادی طور پر مردوں کی بالادستی سے ہے۔ تاہم یہ

ضروری ہے کہ نسائی تجربہ اور حقوق نسواں کی سیاست کے تعلق کو واضح طور پر سامنے رکھا جائے تاکہ نسائی تجربہ مجموعی انسانی تجربہ کے اظہار میں اپنے جائز حق پر تو اصرار کرے۔ لیکن حقوق نسواں کی سیاست کے چکر میں ایسا نہ ہو جائے کہ کہیں معاشرہ کے مقرر کردہ اصول کے مطابق عورت پھر "ستی ساوتری" والے گڑھے میں گر جائے۔ مردوں کے جابرانہ نظام نے فطرت کا ایک خاص اصول وضع کیا ہے، جس کا تعلق اصل انسانی فطرت سے بالکل نہیں ہے۔ مردوں کے اس طے شدہ اصول پر جو عورت پوری نہیں اترتی اسے نسوانیت سے خارج کر کے غیر فطری قرار دیدیا جاتا ہے۔ یہاں عورت کی فطرت یا اس کی جو خصوصیات بیان کی جاتی ہیں ان میں فرماں برداری اور شرم و حیا بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ عورت کے لئے جو حدیں مقرر کردی جاتی ہیں وہ ان سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اسے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا خود کوئی اختیار نہیں ہوتا حالانکہ عورت کی جسمانی اور طبعی شخصیت اسے خالص نسائی تجربات سے دوچار کرتی ہے۔ عورت ان تجربات کی روشنی میں ہی اپنی ذات کا شعور حاصل کرسکتی ہے۔ مرد بھی اگر اسے سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے عورت کی حیثیت سے، اس کے نسائی تجربات کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد اسے بحیثیت انسان سمجھیں۔ اسی طرح خواتین کی تخلیقات کو بھی بندھے ٹکے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ ایلین شووالٹر کا خیال ہے کہ خواتین کے ادب کو ان کے مخصوص تجربات اور خاص جذباتی حوالوں سے سمجھنا چاہئے۔ وہ کہتی ہیں کہ اسی طرح خواتین کی تخلیقات کی اپنی روایت تشکیل پائے گی۔ یہ کام کی خواتین نقادوں کا ہے کہ وہ اس روایت کو آگے بڑھائیں۔

انگریزی کی طرح ہماری زبانوں میں بھی جو ادب تخلیق کیا جارہا ہے اس میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کا حصہ بہت کم ہے۔ خواتین لکھنے والوں کی تعداد نہایت کم ہے۔ ایلین شووالٹر کہتی ہیں کہ ادب میں عورتوں کا الگ ایک سب کلچر یا "ذیلی ثقافت" پیدا ہوگئی ہے اور ادب کی ایسی کوئی روایت واضح طور پر نظر نہیں آتی جسے "نسائی سب کلچر" کہا جاسکے۔ خواتین کی ایسی تخلیقات جو موجود

ہیں انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اب حقوق نسواں سے متعلق نقاد اس ادب کو نمایاں کرنے اور اسے ادبی اور ثقافتی میدان میں ممتاز مقام دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

جدیدیت خواہ وجودی فلسفے کے حوالے سے ہو یا سوشلسٹ فلسفے کے تناظر میں' فرد پر ہونے والے جبر کے خلاف احتجاج کی ایک شکل ہے (یہ جبر مرد پر ہو یا عورت پر)۔ نئی عورت اس صورت حال کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے جس میں عورت کو ایک مخصوص حیثیت دیدی گئی ہے اور جہاں عورت کو سمجھنے کے لئے ایک خاص مزاج بنا دیا گیا ہے۔ جنوبی ایشیا کی عورت بھی روایت اور جدت کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ وہ اپنے کاندھوں پر ماضی کا بوجھ لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں جو عورت بسی ہوئی ہے وہ سیتا' دروپدی اور دوسری فرماں بردار قسم کی عورتیں ہیں۔ وہ عجیب سی کشمکش کا شکار ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لئے اسے ان بندھنوں کو کیسے توڑنا چاہئے۔

آزادی کے بعد اردو اور ہندی میں جو ادب تخلیق کیا گیا ہے ہمیں دیکھنا ہے کہ اس میں عورت کو ایک منفرد شخصیت کے روپ میں' ایک ایسے روپ میں جس میں وہ اپنی ذات اور اپنی قسمت کی خود مالک ہے' پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری توجہ راجندر سنگھ بیدی کے ناول "ایک چادر میلی سی" پر جاتی ہے۔ اس ناول میں بیدی نے عورت کی نفسیات اور جذباتی تجربات کو ایک مرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ عورت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مردانہ جذبات کی سطح سے بلند ہو کر عورت کو ایک الگ فرد کا درجہ دے کر اسے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد جب "اس کی حفاظت" کے لئے شوہر کے بھائی کے ساتھ اس کا پلو باندھا جاتا ہے تو عورت جن جذباتی الجھنوں کا شکار ہوتی ہے اور اسے جس طرح اپنے ساتھ لڑنا پڑتا ہے' اسے بیدی نے نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ناول میں عورت ایک فعال اور باعمل کردار کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

"ایک لمبی لڑکی" میں بیدی ایک سوال کھڑا کرتے ہیں۔ "اتنی تیزی کے

ساتھ لمبی ہوتی لڑکی کو پتی کہاں سے ملے گا؟ اس افسانے میں بیدی یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ قصور بھی عورت کا ہی ہے کہ وہ کیسی نظر آتی ہے۔ یعنی اس کی اپنی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہے۔ وقعت اور اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ مرد کو کیسی لگتی ہے۔ بیدی اس کے خلاف احتجاج کا یہ طریقہ نکالتے ہیں کہ ایک چھوٹے قد کا مرد اس لمبی لڑکی سے بیاہ کرلیتا ہے' نہ صرف بیاہ کرتا ہے بلکہ دل و جان سے اس پر فریفتہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیدی نے اپنے افسانے "کلیانی" میں عورت اور مرد کے رشتے کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس میں کلیانی جو مکمل عورت کا ایک روپ ہے' مہی پت کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ افسانے کے آخر میں مہی پت عورت کی اس طاقت سے خوف زدہ اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہی عورت کی کامیابی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر اور اس کا خاندان ہے اور شوہر کا گھر ہی اس کا اصلی گھر ہوتا ہے۔ جوگندر پال نے اپنے افسانے' "پرائی" میں اس متھ کو توڑا ہے۔ اس افسانے کی عورت جسے ہمیشہ یہ بتایا گیا ہے کہ شادی کے بعد وہ اپنے گھر جائے گی کیونکہ ماں باپ کے گھر تو وہ مہمان ہے' جب شوہر کے گھر جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی اس کا گھر نہیں ہے۔ وہ تو سسرال والوں کا گھر ہے۔ اس کے شوہر کا گھر ہے' وہ ماں باپ کے گھر بھی پرائی تھی یہاں بھی پرائی ہے۔ یہ انکشاف اس کے لئے آزادی کا راستہ کھولتا ہے۔ وہ اپنے آپ کہ ایک فرد کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔ سیموں دی بوار نے وضاحت کی ہے کہ کس طرح عورت کی ذات "بے جان شے" بن جاتی ہے۔ بد نصیبی یہ ہے کہ عورت خود بھی اپنا یہی تصور رکھتی ہے۔ مرد کے کہنے پر وہ بھی اپنے آپ کو "آرٹ کا نمونہ" سمجھتی ہے جو ظاہر ہے بے جان شے ہے۔ ادب میں عورت کی زندگی پیش کرتے ہوئے اسے گڑیا سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ میگی ٹلیور میں اپنی گڑیا کو مارتی ہے۔ ٹونی موریسن کے THE MILL ON THE FLOSS THE BLUEST EYES میں بکولا اپنے آپ کو اس لئے سزا دیتی ہے کہ وہ گڑیا کی طرح نہیں ہے۔ این سیکسٹن اپنے آپ کو مردہ گڑیا کہتی ہے۔ ہندوستانی ناول نگار شوری ڈینیئل کے مختصر ناول

THE SALT DOLL کی ہیروئن میرا، نمک کی بنی ہوئی ہے۔ ایسا نمک سمندر میں جا کر سمندر ہو جاتا ہے اور جب اسے کسی برتن میں ڈالا جاتا ہے تو وہ برتن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن اس گڑیا کو اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ اسے نمک کی گڑیا کیوں بنایا گیا ہے اور کس نے بنایا ہے۔ پھر وہ اپنی انفرادیت کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ تن جندن اسے کھا جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کی ہر چیز پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔ "میں اس کے ہاتھوں میں جاتی ہوں تو میں نہیں رہتی۔ میں عورت نہیں رہتی مرد کا ایک حصہ بن جاتی ہوں۔"

ہندی کے افسانہ نگار نرمل ورما کا افسانہ "پرندے" اور موہن راکیش کا "مس پال" بھی ایسے افسانے ہیں جن میں عورت ہی ہیرو ہے۔ ان میں عورت کے نسوانی شعور کو ایک آزاد اور خود مختار وحدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں نے ثابت کیا ہے کہ عورت کے اصل جذبات اور اس کی حقیقی شخصیت کے اظہار کے لئے لکھنے والے کا عورت ہونا ضروری نہیں ہے۔ مرد لکھنے والے بھی عورت کے جذباتی تجربات و احساسات نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی سوگندھی اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ کردار اس معاشرہ کی پیداوار ہیں جو عورت کو ایک بنے بنائے ڈھانچے میں فٹ کرنے پر اصرار کرتا ہے اور اگر کسی عورت کی طرف سے ذرا سا بھی انحراف کیا جاتا ہے، تو اس کے عورت ہونے پر ہی شبہ کا اظہار کیا جانے لگتا ہے حتیٰ کہ عورت خود بھی اپنے آپ کو مردوں کے خانے میں شامل کرنے لگتی ہے۔ معاشرہ ایسی عورت پر اور کوئی الزام نہیں لگا سکتا تو اسے ذہنی طور پر بیمار قرار دے دیتا ہے۔

لیکن یہی معاشرہ قرۃ العین حیدر کے افسانے "پت جھڑ کی آواز" کی تنویر فاطمہ کو بھی پیدا کرتا ہے۔ قرۃ العین نے نہایت فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ یہ کردار تخلیق کیا ہے جو خود اپنی شکست کی آواز ہے۔ لیکن تنویر فاطمہ اس شکست کو خالص حقیقت پسندانہ انداز میں قبول کرتی ہے۔ وہ گمنام ہے اس لئے وہ آزاد ہے اپنے عمل میں۔ اس کی کوئی پروا نہیں کرتا حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنی پروا نہیں کرتی۔ اس کے بارے میں جو اسکینڈل بنائے جاتے ہیں وہ ان کی پروا بھی نہیں کرتی۔ وہ فاروق کے ساتھ جس طرح کا رشتہ قائم کرتی ہے اسی طرح کا رشتہ وہ خوشونت سے

بھی رکھتی ہے لیکن وہ ہندو مسلمان کی شادی سے پیدا ہونے والے مسائل سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس لئے وہ جو بھی فیصلہ کرتی ہے پوری آزادی اور خودمختاری کے ساتھ کرتی ہے۔ وہ حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرتی ہے لیکن اپنی آزادی اور انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے۔ اور یہی چیز اسے ہیرو بناتی ہے۔

اردو میں عصمت چغتائی اور ہندی میں کرشنا سوبتی نے ادب میں عورت کو ایک خودمختار انسان کے طور پر پیش کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ عورت جو مردانہ معاشرہ کا شکار ہے اور وہ عورت جو اس جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت رکھتی ہے۔ ان کے بعد آنے والوں نے عورت کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اس کے اصل روپ میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اردو اور ہندی کے اکثر افسانہ نگار یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ معاشرہ کا فرسودہ ڈھانچہ بکھر رہا ہے اور عورت کا جو ماڈل بنا دیا گیا تھا وہ ٹوٹ رہا ہے اور عورت جدید زندگی کے مسائل اور اس کی پیچیدگیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو پہچان رہی ہے اور پدری نظام کے جبر سے چھٹکارا حاصل کر رہی ہے۔ ان افسانوں نے معاشرہ کو بھی متاثر کیا ہے اور مردوں کی ذہنیت بھی بڑی حد تک تبدیل ہوئی ہے۔

تاہم ابھی عورت کے راستے میں کافی رکاوٹیں موجود ہیں۔ شانتا کرشنا سوامی نے "ہندوستان کے انگریزی فکشن میں عورت" کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ناقابل عبور رکاوٹیں ہمارے سامنے اب بھی موجود ہیں۔ بچوں کی پرورش کے ساتھ عورت اپنی خودمختاری کیسے برقرار رکھ سکتی ہے؟ گھریلو زندگی' ماں بننے کے عمل' روزگار اور اپنی روحانی تکمیل کی کشمکش میں توازن کیسے برقرار رکھا جائے گا؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب تلاش کرنا ضروری ہیں۔"

اس کا حل شاید یہی ہے کہ "ذو جنسی اقدار" پیدا کی جائیں۔ یعنی مرد اور عورت کو الگ الگ متقابل خانوں میں بانٹنے کے بجائے ان میں اتصال اور امتزاج پیدا کیا جائے۔ ایسا اتصال جس میں دونوں کی آزادی اور خود مختاری برقرار ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو عورتوں میں ایک اور قسم کی رجعت پسندانہ سیاست ابھر کر سامنے آجائے گی۔

بیماریوں کے محل میں ہراساں عورت

ڈاکٹر آصف فرخی

پہلا جھوٹ تقدیر کے نام پر بولا گیا' ہم کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں' ہمارا انجام کیا ہے' ہم کیا بن جاتے ہیں' کیا وجود کے ان مسائل کا سبب محض ایک اندھا اتفاق ہے یا اس کے پیچھے کوئی منظم' منصوبہ ہے؟ لاطینی امریکی کے بے حد خلاق شاعر و افسانہ طراز حورخے لوئس بورخیس نے اپنے ایک افسانے "شہر بابل کا قرعہ" (Lottery in Babylon) میں ایسے ہی ایک منصوبے کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایسے معاشرے کا تصور کیجئے جس میں تمام تر سماجی فوائد' بلکہ معاشرے میں فرد کی حیثیت تک ایک قرعہ اندازی سے طے ہوتے ہیں۔ کون کیا بنے گا' اور کسے کیا مقام ملے گا' اس کا فیصلہ قرعہ اندازی سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کی قرعہ اندازی کے بعد کوئی بھی شخص غلام ہو سکتا ہے یا صنعتوں کا دولت مند مالک' زاہب یا عالم یہ بھی ممکن ہے کہ قرعے کے ذریعے وہ جلاد بن جائے یا وہ قیدی جسے اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پھانسی پر لٹکنا ہے۔ تیغ بدست جلاد سے پھانسی کے پھندے تک' تقدیر کا ایک پھیرا شہر بابل میں قرعہ اندازی صریحاً" اتفاق پر مبنی ہے' اور اس بات کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں کرتی کہ کسی شخص نے ماضی میں کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں' مستقبل میں کیا امکانات رکھتا ہے' کیا تعلیم حاصل کی ہے اور وہ معاشرے کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ ایسے منصوبے میں فرد کی صلاحیت' تجربہ' افادیت' محنت' ذہانت اور دلچسپی' غرضیکہ کسی چیز کی گنجائش نہیں رہتی۔ بورخیس کا یہ افسانہ پڑھنے والوں پر گہرا تاثر مرتب کرتا ہے اس لئے کہ ہم سب اسے تخیلاتی کارنامہ سمجھ کر اس کی داد دیتے ہیں' اس تحفظ بخش احساس کے ساتھ کہ یہ افسانہ جس نظام کی بات کر رہا ہے وہ سیاسی ہی نہیں اخلاقی و انسانی نقطہ ہائے نظر سے بھی ناروا ہے۔ ہم اسے ناروا اس لئے سمجھتے ہیں کہ ہمارے سامنے سماجی انصاف کے کچھ

اصول ہیں جن کے مطابق معاشرے میں ذمہ داریاں، حیثیت، فرائض، حقوق اور فوائد کی تقسیم ہونا چاہیے۔ معاشرہ اپنے افراد کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے اور حقوق و فرائض کی تقسیم کیسے ہوتی ہے، ان باتوں کا دارومدار معاشرے کی اقدار پر ہے۔ شہربابال کی ناانصافی نظر آتی ہے کہ اندھا اتفاق یہ طے کر رہا ہے کہ کون ملک کا وزیر بنے گا اور کون وہ بچہ، حمل کے دوران ہی جس کی ماں کو اس کی ضرورت نہیں ہے، کون اعلیٰ پروہت ہے، اور کون دیہات کی وہ عورت جسے کھیت پر کام بھی کرنا ہے اور آٹھ نو بچوں کو سنبھالنا بھی ہے۔ کیا یہ سارے کردار پہلے سے متعین ہو چکے ہیں؟ کیا ان کی جسمانی ساخت ہی ان کا تمام تر انسانی وجود، ان کی تقدیر ہے؟ کیا بورخیس نے محض افسانہ گھڑا تھا؟

کہا جاتا ہے کہ انسان جو کچھ بنتا ہے، اس کی بنیاد اس کی جسمانی ساخت پر ہے۔ حیاتیاتی ساخت بطور تقدیر (Biology as Destiny) پر جو طول طویل بحث ہوتی چلی آئی ہے، اس کے حوالے سے مجھے بورخیس کا یہ افسانہ یاد آتا ہے۔ اس تمام بحث کا اطلاق عورت اور اس کی حیثیت پر کیا جاتا ہے۔ عورت کی جسمانی ساخت کو اس بات کا سبب قرار دیا گیا ہے کہ عورت کا ایک مخصوص روایتی تصور وقوع پذیر ہوا، اور یہ تصور کسی ایک خاص ثقافت کے بجائے بیک وقت کئی معاشروں میں مروج ہوا۔ حیاتیاتی ساخت پر زور دینے والے اس تصور کے مطابق، عورت جسمانی طاقت کے معاملے میں کمزور ہے، اس لئے اس کا کم تر درجہ ایک فطری بات ہے، یا قدرتی امر ہے۔ یہ عام تصور ہے جو عوام الناس ہی میں نہیں، تعلیم یافتہ ماہرین میں بھی نظر آتا ہے۔ عورت کے دماغ کا حجم، مرد کے مقابلے میں کم ہے، تو یہ باور کر لیا گیا کہ اس کی ذہنی صلاحیت بھی کم ہوگی۔ عورت کی جسمانی ساخت اور اس کی جسمانی کارکردگی کی فطری حالتوں، مثلاً ایام ماہواری، زچگی اور دودھ پلانے کی مثال دے کر کہا گیا کہ ان کی وجہ سے عورت Disadvantaged ہے، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ (Disadvantaged کی یہ اصطلاح اب معذور افراد کے لئے اس کثرت سے استعمال ہونے لگی ہے کہ عورت کے لئے اس اصطلاح کا استعمال معنی خیز معلوم ہوتا ہے کیا عورت کی ان فطری حالتوں کی وجہ سے اسے جسمانی طور پر معذور سمجھا جاتا رہا ہے؟) عورت کی جسمانی ساخت اور فعلیاتی عمل کو ایک طرف تو کارکردگی کی راہ میں حائل

رکاوٹ قرار دیا گیا' دوسری طرف ان کے گرد ایک پوری نفسیات کا تانا بانا بن دیا گیا۔ جس کا پورا محور ماں بننے کے عمل کو قرار دیا گیا۔ تصور وہ نفسیات کا ہو یا حیاتیات کا' مرد اور عورت کی تفریق پر اس زاویئے سے بہت زیادہ زور دیا گیا تا کہ ان کے حوالے سے عورت کو کم تر قرار دینے کا جواز فراہم ہوجائے۔ اور پھر اس تصور سے جکڑ بندی کا کام بھی لیا گیا کہ ایک خاص صنفی کردار کو عورتوں کے لئے مناسب و موزوں قرار دے کر اسے ان کی تقدیر بنا دیا گیا۔ گویا یہ تقدیر جسمانی ساخت کا لازمی شاخسانہ ہے۔ اس تقدیر کے لئے نہ تو شہر بابل میں کوئی قرعہ اندازی ہوئی نہ یہ افسانہ بورخیس کے عجوبہ پسند تخیل کی پیداوار ہے۔

اس تفریق اور اس کے نتیجے میں برتی جانے والی عصبیت کی بنیاد جسمانی ساخت سے زیادہ سماجی تاریخ میں پنہاں ہے۔ بعض ماہرین' جسمانی تفریق Biological Defference کے بجائے صنفی تفریق Gender Difference کو استحصال کا مجرم ٹھہراتے ہیں' کہ یہ تفریق سماجی اور ثقافتی رویوں کا نتیجہ ہے' قدرتی امر نہیں۔ آج کے معاشرے میں عورت کی Disadvantaged حیثیت ایک طویل تاریخی جبر کا نتیجہ ہے۔ میری بولٹ' این ولسن اور وینڈی لارسین نے اس تاریخی جبر کا جائزہ اپنے مقالے "عورت کی حیاتیات ـــــ انسانیت کی تقدیر: آبادی میں بے تحاشا اضافہ اور عورت کے بدلتے ہوئے روپ" میں پیش کیا ہے۔ اس مقالے میں عورت کی جسمانی ساخت سے وابستہ دو اہم تر طبعی افعال اور ان سے وابستہ سماجی اداروں' یعنی شادی اور زچگی کو تاریخی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقالے میں جو بحث کی گئی ہے' اس کے تمام تر استدلال کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ عورت کی مخصوص جسمانی ساخت کے حوالے سے یہ طے کر دیا گیا کہ اس کی زندگی کا تمام تر محور بیوی اور ماں بننے پر ہے۔ اس کے باقی تمام جذبے یا احساسات ان دونوں افعال کے تابع ہیں۔ آج بھی ہم اپنے معاشرے میں عورت کے ان دونوں صنفی کرداروں کو Absolute Value سمجھتے ہیں۔ (بیدی کے افسانے "لاجونتی" کے شوہر کی طرح عورت کو دیوی کے سنگھاسن پر تو بٹھا سکتے ہیں' اسے برابر کا انسان نہیں تسلیم کرسکتے۔ کیونکہ اس کو بھی انسان مان لینے سے پھر

تشدد اور غم کے اس سمندر کا اقرار کرنا ہوگا جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھی ہے)
اس مقالے کے مطابق، ان دونوں کے بارے میں مروجہ صنفی تصورات معاشرے کی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ انجیل کے عہد نامہ سے لے کر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں "مرگ سیاہ" کی وبا تک، اور پھر دوسری جنگ عظیم میں بے پناہ جانی نقصان کے بعد پھر موجودہ زمانے میں بچوں کی شرح اموات میں کمی اور آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافے جیسے تاریخی واقعات سے عورت کے صنفی کردار پر براہ راست اثر پڑا ہے۔ بیوی اور ماں بننا، اگر ہر Normal عورت کے لئے ناگزیر تھا تو ساتھ ہی ساتھ یہ انسانی بقاء کے لئے ضروری بھی تھا۔ حیاتیاتی ساخت ہی تقدیر تھی۔ اس تاریخی جائزے سے مقالہ نگاروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس صدی میں آبادی کے بحران کے مکمل حل کا راستہ بھی اسی وقت نکل سکے گا جب عورت کو صرف حیاتیاتی ضروریات کا تابع بن کر بچوں کی خالق بننے کے ساتھ ساتھ ثقافتی طور پر آزاد ہوکر ایجادات، خیالات اور فنون کی خالق ہونے کا بھی موقع مل سکے گا۔ میرے خیال میں یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انصاف و مساوات پر مبنی صنفی کرداروں کا یہ تصور، حیاتیاتی عمل کی نفی کسی طور پر بھی نہیں کر رہا ہے، بلکہ صرف اسی کا پابند ہوکر جسمانی ساخت اور اس کے افعال کی تکمیل تک محدود ہوکر رہ جانے سے اوپر اٹھنے کی بات کر رہا ہے۔

اس وقت انسان کی وجودی صورت حال کو جس چیلنج کا سامنا ہے، اس میں یہ پہلو بھی بے اندازہ اہمیت کا حامل ہے کہ "نسوانیت" کو (جس میں Feminism اور Womanhood دونوں کے مختلف مفاہیم شامل ہیں) "پابند کردینے والے عنصر" یا Limiting Factor کے بجائے "تعریف متعین کرنے والے عنصر" یا Defining Factor کے طور پر سمجھا جائے۔ بدقسمتی سے، طب کے شعبے میں ایسا رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ عورت اور اس کی صحت کے بارے میں جدید طبی علوم میں جو رویئے عام ہیں، ان میں سے کئی رویئے بعض غلط تصورات پر مبنی ہیں۔ اسی لئے طب جدید بعض فکری مغالطوں کے فروغ اور سماجی

جکڑبندی کا ایک وسیلہ بننے کا کردار ادا کر رہا ہے۔

عورت اور اس کے بارے میں جدید طبی رویے جن مغالطوں پر مبنی ہیں' ان کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ طب جدید (Modern Medicine) کا جو مغربی ماڈل ہمارے معاشرے میں بھی حاوی ہوگیا ہی' اس کا اسٹرکچر کس طرح کا ہے اور وہ کس طور پر منظم ہے۔ تھامس زاز (Thomas Szasz) اور بعض دوسرے مفکرین نے اس موضوع پر خاصا کام کیا ہے کہ جدید میڈیسن کی فکری آئیڈیالوجی کیا ہے' اور اس کا اثر میڈیسن کی پریکٹس پر کیا پڑتا ہے۔ خود میڈیسن کے اندر یہ تنقیدی بحث بھی جاری ہے کہ جدید مغربی میڈیسن کا ماڈل شفایابی (Healing) پر توجہ دینے کے بجائے مرض کی تخصیص پر زور دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو آرتھر کلائن مین اور دوسرے مصنفین کی تحریریں) اور مکمل انسان پر Holistic انداز میں توجہ مرکوز کرنے کے بجائے فقط مرض کی علامات سے سروکار رکھتا ہے۔ مغربی میڈیسن کا ماڈل' جسم کے مختلف نظام ہائے افعال کو الگ الگ دیکھنے اور ان میں سے ہر ایک کو ایک الگ شعبہ تخصیص (Speciality) میں تقسیم کر دینے کا عادی ہے۔

(یہاں مراد میڈیکل سسٹم سے ہے اور اس کے لئے انگریزی لفظ Medicine ہی کو استعمال کر لیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم طبی نظام سے ادا ہو سکتا ہے' مگر طب کا لفظ اس لئے نہیں استعمال کیا گیا کہ اس سے ذہن ہمارے ہاں مروج طب یونانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جبکہ یہاں خالصتاً مغربی ماڈل کی بات کی گئی ہے۔)

اس پر یہ اعتراض بھی بارہا کیا گیا ہے کہ ان اختصاصی شعبوں پر اصرار' ضروریات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ میڈیسن کے اقتدار کو استحکام بخشنے اور کنٹرول کو مضبوط کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ تھامس زاز نے اس عمل کی مثال یوں دی ہے کہ عادی جواریوں کی لت' منشیات' خودکشی کی کوشش اور دوسرے نفسیاتی عوارض کو جدید میڈیسن نے اپنا باجگزار بنا کر انہیں اپنے لئے

Appropriate کرلیا۔ اس طرح سماجی مسائل کو Medicalize کرکے انہیں امراض بنا دیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جدید میڈیسن کے پاس ان مسائل کا "علاج" موجود نہیں ہے، مگر انہیں مرضیات کی اصطلاحوں میں متعین کرکے اور "بیماری" بناکر، ڈاکٹر ان کے لئے معاشرتی رویوں پر حاوی ہوجاتا ہے اور اپنا کنٹرول قائم کرلیتا ہے —— اس کے بعد "سزا" کے الفاظ کی جگہ "تشخیص" اور "علاج معالجہ" لیتے ہیں۔ اس علاج معالجے میں بھی فرد کی اپنی رضامندی کا اسی قدر عمل دخل ہوتا ہے جتنا کہ سزا میں، فرانسیسی فلسفی مشیل فوکو (Foucault) نے "دیوانگی اور تہذیب" اور جرم و سزا پر فکر انگیز کتابیں لکھی ہیں، جنہوں نے اب سے چند برس قبل مغربی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ فوکو ہی کی ایک کلیدی کتاب The Birth of the Clinic میں یہ ماجرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ڈاکٹروں نے کس طرح بیماری کے تجربے کو دیکھنے سمجھنے اور پھر ایک خاص لسانیاتی ڈھانچے میں ڈھالنے کا کام کیا، اور یوں جدید معاشرے میں ایک انتہائی اہم اور مقتدر، پاور گروپ کے طور پر ابھرے۔ فوکو نے جدید میڈیسن کے عروج کی جو داستان لکھی ہے، وہ دراصل Power کے حصول کی کہانی ہے۔ یہ اقتدار اور طاقت جن گروہوں کے اوپر حاصل کیا گیا، ان میں عورتیں اور ان کی صحت سے متعلق مسائل شامل ہیں۔ زچگی، دودھ پلانے کا عمل، ایام ماہواری اور اسی طرح کی مخصوص حالتوں کو جدید میڈیسن کے کنٹرول میں لایا گیا۔

"عورت، صحت اور میڈیسن" میں باربرا کاٹز رو تھمین نے شکوہ کیا ہے کہ "عورتیں محض انسان ہی نہیں ہیں بلکہ عورت تو ایک موضوع ہے جس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور جدید میڈیسن کے طالب علم اس میں مہارت یا اختصاص حاصل کرسکتے ہیں۔" یہ عمل اس غرض سے نہیں ہوتا کہ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے بہتر حل موجود ہیں یا تلاش کئے جاسکتے ہیں، بلکہ کنٹرول حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ ہے۔ اختصاص کے ذریعے کنٹرول، رو تھمین نے نشاندہی کی ہے کہ عورت اور اس کی صحت کے معاملات، خصوصاً زچگی اور وہ معاملے جو عورت سے مخصوص

ہیں، انہیں ایک الگ شعبہ قرار دے کر Obstertrics اور Gynaecology کا نام دے دیا جاتا ہے جس کا مقصد Professionalize کرنا ہے۔ رو تھمین نے خاصی تفصیل کے ساتھ اس کشمکش کا جائزہ لیا ہے کہ زچگی کے عمل پر دائی کے بجائے "ماہر امراض نسواں" قسم کے ڈاکٹر کا قبضہ کیسے قائم ہوا۔ حمل اور زچگی، خاندانی یا مذہبی یا سماجی معاملات کے بجائے Medical Events بن گئے، جن کے لئے ماہر ڈاکٹر کی نگرانی کی ضرورت تھی۔ دائی کو جہالت اور ہنر کی کمی کا طعنہ دیا گیا، رو تھمین نے الزام لگایا ہے کہ میڈیسن کی پیشہ ور تنظیموں نے عورتوں کو معالج یا دائی کی تربیت دینے اور وہ ہنر سکھانے کے بجائے، جو ان کے خیال میں زچگی میں مدد کرنے کے لئے ضروری تھے، اپنی اجارہ داری کو مستحکم کیا۔ جدید میڈیسن کی آئیڈیالوجی کے مطابق، زچگی کے عمل میں مدد دینے کے لئے ڈاکٹر کی موجودگی اس لئے ضروری قرار پائی کہ یہ طے ہوگیا کہ Normal حمل اور زچگی، Exceptions ہیں اور انہیں جسم کی فعلیات کے حسب معمول اعمال سمجھنا غلط ہے۔ اس طرح زچگی پر پیشہ ورانہ Dominance قائم کی گئی۔ اس کے بعد Obstetrics، جس کا تعلق زچگی سے ہے، تیزی سے Gynaecology کے زیر نگیں آتی گئی۔ Gynaecology کا دائرہ کار تمام "نسوانی بیماریاں" ہیں اور اس کی زیر اثر ان تمام معاملات کو "مرضیات" یا Pathology کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ نسوانیت، بیماری کا نام بن گئی، بلکہ بیماریوں کی شاخ، اور زچگی کا عمل، مرض قرار پایا۔

دائی کے برخلاف، ڈاکٹر نے Delivary کو اس کے سماجی، نفسیاتی سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے محض ایک میڈیکل واقعہ بنا دیا، تو رو تھمین کے خیال میں اس کی جڑیں ڈیکارٹ کے اس تصور تک جاتی ہیں کہ ذہن اور جسم میں ایک طرح کی ثنویت ہے۔ ڈیکارٹ کے نزدیک انسانی جسم ایک طرح کی مشین ہے، جس کی ساخت اور فعلیت کو سمجھا جاسکتا ہے جبکہ انسانی ذہن کو بس خدا ہی جانے۔

دیکارت کے اس تصور کی کارفرمائی جدید میڈیسن میں دیکھی جاسکتی ہے جس کی تہہ میں انسانی جسم کے بارے میں کچھ اس قسم کا رویہ موجود ہے کہ انسانی جسم گویا موٹر گاڑی کی طرح ہے' چلتے چلتے ٹھپ ہوجائے تو جس طرح گاڑی کو مرمت کے لئے کارخانے میں کاریگر کے پاس بھیجتے ہیں' اسی طرح جسم کو ہسپتال میں بھرتی کروا دیا جاتا ہے تا کہ کاریگر اپنے اوزاروں سے ٹھونک پیٹ کر' سارے کل پرزے دیکھ لیں۔ انیسویں صدی سے لے کر اب تک میڈیکل ماڈل میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے پہل' یہ ماڈل سراسر Mechanical تھا اور انسانی جسم کو ایک مشین قرار دیتا تھا۔ اس کے بعد اس ماڈل پر کیمسٹری کا غلبہ ہوگیا اور یہ ماڈل انسانی جسم کو کیمیائی نظام یا ایسے نظاموں کا مجموعہ قرار دینے لگا۔ ان دنوں اس پر کمپیوٹر پروگرامنگ کا گہرا اثر ہے اور آج کل کے عام پڑھنے والوں کے لئے طبی موضوعات پر جو کتابیں سامنے آرہی ہیں' ان میں انسانی جسم (اور دماغ) کو بکثرت ایک ایسے کمپیوٹر کے طرز پر بیان کیا جا رہا ہے جس کی پروگرامنگ ممکن ہے۔ اس قسم کے تمام ماڈلوں کے ساتھ ایک مشکل ہے' اور وہ رو تھمین کے الفاظ میں یہ ہے کہ "یہ ماڈل ان مسائل کے لئے تو مفید ہے جو پچھلی صدی میں میڈیسن کو درپیش تھے' مثلاً جراثیم' وائرس اور ان کی پیدا کردہ بیماریاں' چوٹیں اور حادثے وغیرہ' لیکن یہ ماڈل ان مسائل کو سمجھنے میں مفید ثابت نہیں ہوتا جو عورتوں کو پیش آتی ہیں اور جن میں زچگی بھی شامل ہے۔" لہٰذا عورت کو صحت کے معاملے میں Disadvantaged بنا دیا گیا ہے تو اس محکومی کو برقرار رکھنے کے لئے پورا ایک طبی نظام کارفرما ہے' اور یہ محرومی انسانیت کے ایک حصے یا صرف ایک صنف کی نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع انسان کا نقصان ہے کہ زبان کا ایک طاقتور Rhetoric اسے اس کے بدن کی مناسب مثال سے محروم الارث کر رہا ہے۔ کیا مرد کیا عورت' ہم سب اپنے اس انسانی تجربے اور سرمائے سے Displaced لوگ ہیں۔

غلط مثالی نمونوں پر مبنی نظام نے صحت کے تصور کو کس طرح

Manipulate کیا' اس کی تفصیلات بھی روتھ مین کے محولہ بالا مقالے کے حوالے سے درج ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کی معالج کا خود عورت ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے' مگر مغربی معاشرے میں Gynaecologists مرد ہوتے آئے ہیں' اور انیسویں صدی میں جب میڈیسن کی اس شاخ کا فروغ ہوا تو اس کا پہلا مقصد وہدف عورتوں پر مکمل سماجی کنٹرول حاصل کرنے کے لئے عمل جراحی کے ذریعے ان کے نسوانی اعضاء کو نکال پھینکنا تھا۔ مشرقی وسطیٰ کے بعض ممالک میں عورتوں کے Circumcision کے بارے میں خاصا کچھ لکھا گیا ہے۔ (اردو میں اس موضوع پر کشور ناہید نے "آجاؤ افریقہ" میں ایک باب لکھا ہے۔ پہلا ایڈیشن' 75ء)۔ اس قبیح رسم کی وہ شکل زیادہ بھیانک ہے جب جدید علوم کے نام پر یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ عمل جراحی کے ذریعے Clitoris کا انقطاع' نسوانی Circumcision اور بیضہ دانی کو نکالنے کے عمل کو "عورتوں کی دماغی بیماریوں" کے علاج پر باضابطہ طور پر تجویز کیا جاتا رہا۔ پہلا Gynaecologist جس نے Clitoridectomy کی سرجری کی' انگلستان سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے یہ جراحی 1858ء میں سرانجام دی۔ یہ جراحی اور علاج' انگلستان میں رائج نہ ہوسکا مگر امریکہ میں 1904ء تک باقاعدگی سے یہ کام ہوتا رہا بلکہ گاہے بگاہے تجویز کئے جانے کا سلسلہ 1940ء کی دہائی تک جاری رہا۔ جراحی کے اس عمل کو بطور علاج تجویز کیا جاتا تھا تاکہ جنسی خواہش یا جنسی طرز عمل کا مکمل طور پر سدباب کیا جاسکے' کیونکہ کسی بھی عورت میں ان دونوں جذبوں کی موجودگی کو مرض کی نشانی (Pathological) سمجھا جاتا تھا۔ تمام عمر کی عورتوں میں خود لذتی کو روکنے کے لئے Circumcision کا عمل' امریکہ میں 1937ء تک باضابطہ طور پر کیا جاتا رہا۔ نفسیاتی اور جسمانی عوارض کے لئے بیضہ دانی کو نکالنے کی جراحی Oopherectomy' زیادہ عام تھی اور 1946ء تک تجویز کی جاتی رہی۔

جسمانی ساخت اور امراض کا حوالہ دے کر میڈیسن کے نام پر کنٹرول

صرف جراحی کے عمل کے ذریعے ہی نہیں قائم کیا جاتا رہا ہے بلکہ اس کی کئی اور صورتیں بھی ہیں۔ ذہنی بیماریوں کے معاملے میں یہ کنٹرول سب سے زیادہ واضح اور نمایاں ہے' اور سب سے زیادہ بہیمانہ بھی۔ سماجی کنٹرول کس طرح نفسیاتی علاج کا روپ دھار لیتا ہے' بلکہ عورت کی ابتداء بھی ذہنی بیماری بن کر کس طرح نمودار ہوتی ہے' اس اجمال کی تفصیل ایلین شوالٹر (Elaine Showalter) نے اپنی کتاب "نسوانی عارضہ" (The Female Malady) میں درج کی ہے جو 1830ء سے 1980ء تک عورت' دیوانگی اور انگلستانی ثقافت کے باہمی تعلق کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت سماجی تاریخ اور نفسیاتی نظریات تک ہی نہیں' ادبی تنقید کے شعبے میں بھی ہے۔کیونکہ یہ ان الگ الگ عوام کو Inter-Disciplinary اور امتزاجی مطالعے میں لانے کا بھرپور اور کامیاب مظاہرہ کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے انگلستان میں پاگل خانوں میں' مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ بیسویں صدی میں بھی ماہرین نفسیات کے پاس بغرض علاج آنے والوں میں زیادہ بڑی تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ ایلین شوالٹر نے عورت کی دیوانگی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے دو پہلوؤں پر زور دیا ہے' دیوانگی کے نام پر عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتیاں' اور دوسرے یہ کہ دیوانگی کی صورت میں نسوانی فطرت' مرد کی تعقل پسند' سائنسی ذہنیت کے سامنے بے نقاب ہو رہی ہے۔ شوالٹر نے عجیب نکتہ اٹھایا ہے کہ انیسویں صدی میں نفسیاتی میڈیسن کی بیانیہ زبان' اتنی ہی Culturally Determined اور اپنے استعاروں میں بے پردہ ہوجاتی ہے کہ جتنی افسانوی ادب کی زبان' اس مطالعے کی اہمیت فوکو کے مطالعے کی روشنی میں اور بھی بڑھ جاتی ہے' کیونکہ فوکو نے پاگل خانوں کے پس پردہ کام کرنے والی Repressive آئیڈیالوجی کا نہایت عمدہ تجزیہ کیا ہے' لیکن اس زاویئے کو جستجو کے قابل نہیں سمجھا کہ جو غیر تعقل پسند (Irrational) سماجی عدم مطابقت' ان پاگل خانوں کی چار دیواری میں گھٹ کر رہ جاتی تھی' اس کی اساس میں نسوانیت بھی شامل تھی۔ مغربی معاشرے کے

برخلاف' ہمارے معاشرے میں یہ صورت حال اب تک قائم ہے اور ملک کے نفسیاتی ہسپتالوں میں خواتین کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا رہا ہے' وہ اخبارات کے ذریعے ہم سب تک پہنچتا رہا ہے۔ اردو کی شاعرہ سارا شگفتہ نے ایسی ہی علاج گاہ میں اپنے کچھ تجربات قلم بند کئے تھے' اس تحریر سے بھی یہ صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

شوالٹر کے تجزیئے کے مطابق' انگلستان میں دیوانگی کی دو اقسام میں واضح طور پر تفریق کی جاتی رہی ہے' اور اس تفریق کی تمام تر بنیاد عورت اور مرد کی صنفی تفریق پر ہے۔ جہاں عورت اور مرد میں ذہنی عارضے کی یکساں علامات ہوتی تھیں' تب بھی انیسویں صدی کا علم نفسیات عورت اور مرد میں تفریق کرتا تھا' کہ مرد کا عارضہ تہذیب یافتہ افراد پر پڑنے والے معاشی اور فکری دباؤ کا نتیجہ خیال کیا جاتا تھا' اور عورت کا عارضہ جنسیت اور عورت کی فطرت سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ دیوانگی کے اس ٹھپے کے پیچھے عورت کی فطرت کا خوف بہت نمایاں ہے۔

عورت کے بارے میں ایسے رویئے صرف نفسیاتی شعبے ہی تک محدود نہیں۔ ماہرین کا شکوہ ہے کہ ماحول اور اپنی شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ اور متوازن خواتین کی جسمانی صحت اور استقامت کے بارے میں بھی سوال اٹھائے جاسکتے ہیں۔ روتھ مین نے بڑی تلخی کے ساتھ لکھا ہے کہ اس صنف کی فرد ہونے کی وجہ سے عورتیں Illness Labeling کا شکار رہی ہیں اور اب تک ہیں۔ سدا روگی رہنے اور بیماری کی محضر لئے پھرنے کی وجہ کا گہرا تعلق معاشرتی افادیت سے ہے۔ ٹالکوٹ پارسنز نے لکھا ہے کہ کسی بھی سماجی نظام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ارکان کی بنیادی صحت قائم و استوار رہے' کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو سماجی نظام مقدور بھر کام نہ کرسکے گا۔ عورت کو اکثر اوقات سماجی نظام کا مفید یا فعال کارکن نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ بعض معاشروں میں ایسی غیر مستعد اور منفعل خواتین کو ایک اعلیٰ سماجی مرتبے پر فائز سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایرین رائخ اور انگلش نے خواتین کی علامات مرضی کے تجزیئے میں پچھلی صدی کے اواخر اور اس صدی کے

اوائل کی "بیگم صاحبہ" کا ذکر کیا ہے: "یہ خاتون وہ سماجی آرائش تھیں جس سے مرد کی کامیابی کا ثبوت ملتا تھا' ان کی کاہلی' نزاکت' "حقیقت" کے بارے میں بچوں کی سی معصومانہ حماقت اور بے خبری' یہ سب چیزیں مرد کو وہ سماجی مرتبہ عطا کرتی تھیں جو پیسے سے بھی خریدا نہیں جاسکتا تھا۔" پچھلی صدی تو دور کی بات ہے' گڑیا کا یہ روپ ہمارے معاشرے کے لئے کوئی نیا یا انوکھا تصور نہیں ہے۔

قدیم چین میں عورتوں کے پیر باندھ کر ان کے اندر باقاعدہ معذوری پیدا کی جاتی تھی۔ اور معاشرہ اس معذوری کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ روتھ مین کے مطابق' دوسرے معاشروں میں باقاعدہ طور پر معذوری پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی' کیونکہ یہ معاشرے ایام ماہواری' حمل' زچگی اور Menopause کو Incapacitating حالتیں سمجھتے تھے۔ انسانی جسم کے بارے میں رائج میکانکی تصور کے تحت' یہ تمام حالتیں جو عورت کے لئے Normal ہیں' ٹھیک ٹھاک کام کرنے والے نظام میں گڑ بڑ' اور پیچیدگی کے طور پر سمجھی جاتی رہی ہیں۔ ایام ماہواری یا حالت حیض بطور خاص میڈیسن کے اس متعصب اور محدود رویئے کا شکار رہی ہے۔ روتھ مین نے 1961ء میں American Journal of Gynae & OBS. میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جو ایام ماہواری کا ذکر عورت کی Inherent Disability کے طور پر کرتا ہے۔

"یہ امر معلوم ہے کہ عورتیں' اپنی Reproductive Cycle کے بعض حصوں میں کچھ نہ کچھ بے آرامی محسوس کرتی ہیں' اور اکثر اس کے ساتھ خاصی ذہنی و جسمانی تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اپنے ان فطری نقائص کا احساس' عورت کے اندر ذہنی اور پھر جسمانی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے ایسی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن سے ڈاکٹر کو نمٹنا پڑتا ہے۔"

اسی طرح حمل کے لئے بھی Symptoms کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جبکہ حمل نہ تو بیماری ہے نہ کسی بیماری کی پیچیدگی۔ لیکن یہ بہرحال طے

ہے کہ بیمار ٹھہرائے جانے کے لئے پیچیدہ علامات کی ضرورت نہیں' عورت ہونا ہی کافی ہے۔ بیماری کے نسوانی فطرت سے منسلک کئے جانے میں روتھ مین اور اس کے ہم خیال تجزیہ نگاروں کو دو اسباب اہم نظر آتے ہیں ـــــ انسانی جسم کے بارے میں میکانکی تصور جو جسم کو نامیاتی وحدت کے بجائے مشین سمجھتا ہے' اور عورت کو افادیت کے لحاظ میں کم تر سمجھنے کا رجحان' بدقسمتی سے' جدید میڈیسن کی شاندار عمارت ان ہی دونوں مغالطوں پر قائم ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے سابق ڈائریکٹر جنرل اور صحت عامہ کی تحریک کے روح رواں ڈاکٹر ہالینڈ مین ماہلر نے شاندار مگر بے روح جدید ہسپتالوں کو "بیماریوں کے محل" قرار دیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس قصر امراض میں عورت کی بے چین روح بھی بھٹکتی پھرتی ہے۔ اس کی پریشانی کے اسباب معلوم' لیکن اس کی تکالیف کا مداوا اسی وقت ممکن ہے جب عورت کی صحت کے سوال کو صرف ایک طبی مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ عورت کی سماجی ثقافتی حیثیت کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے' اور عورت کی صحت کے لئے روایتی Interventions کی حدود کو سمجھا جائے۔ صحت کے ضمن میں عورت کی ضروریات کو پورا کرنے کا دعویٰ لے کر آگے بڑھنے والے چاہے سرکاری ادارے ہوں یا غیرسرکاری تنظیمیں' ان کی توجہ کا مرکز بالعموم ماں کی صحت (Maternal Care) یا خاندانی منصوبہ بندی کا فروغ رہا ہے۔ توجہ کے اس ادھورے محور کو عورت کے بارے میں بولا جانے والا جھوٹ تو بہرطور نہیں کہا جاسکتا' لیکن ادھورا سچ ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی Reproductive صحت پر ہی ساری توجہ مرتکز کرکے اس کی صحت کی ضمانت دی جاسکتی ہے؟ زچہ اور بچہ کی صحت پر توجہ ضروری ہے' لیکن عورت کی صحت اس سے وسیع تر مفہوم بھی رکھتی ہے۔ زچگی کے معاملات کے علاوہ اس کے سامنے وہ تمام مسئلے بھی ہیں جو اس معاشرے کے کسی اور شہری کے سامنے ہیں۔ سلیم احمد نے معاصر اردو شاعری کے حوالے سے کہا تھا کہ وہ "پورے آدمی" سے ڈرتی ہے۔ پورے آدمی سے ہی نہیں' ہماری شاعری

اور ہمارا معاشرہ پوری عورت سے بھی خوفزدہ ہیں۔ ادھوری اکائیوں کے ڈھیر میں ایک مکمل سالمے سے ڈر تو لگے گا۔

عورت اور اس کی صحت کے بارے میں کثرت سے دہرائے جانے والے مغالطوں کے اس تعارفی جائزے کا اختتام' میں جون اسمتھ Joan Smith کی تحریر سے ایک اقتباس پر کرنا چاہوں گا۔ جون اسمتھ برطانیہ کی بیباک صحافی خاتون ہے' اور اس کی تحریر میں بسا اوقات ایسی تلخی ہوتی ہے کہ میرے لئے اس کا پڑھنا بھی مشکل اور تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں موجود ان جذبوں کے بارے میں لکھتے ہوئے' جو انسانی تعلقات کو مسخ کرتے ہیں اور عورت سے نفرت کو جنم دے کر جنسی جنگ کو ہوا دیتے ہیں' جون اسمتھ نے اپنے مضامین کے مجموعے Misogynies کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے۔

"مرد بھی اسی طرح جھوٹ کے شکار ہیں' جس طرح عورتیں ہیں۔ جب دونوں ایک ساتھ اٹھ کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت کرینگے' اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہم مستقبل کے بارے میں امید افزا ہوسکیں۔"

خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے

ڈاکٹر عارفہ سیدہ

تعلیم کا پہلا اور مرکزی وظیفہ زندگی کا اجتماعی شعور پیدا کرنا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے ہمیں زندگی کے متعلق جو کچھ اطلاع اور خبر ملتی ہے اسے مکمل ہونا چاہئے۔ مکمل ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف ہر پہلو اور ہر زاویئے کے متعلق جان لیا جائے۔ بلکہ تعلیم تعصب سے بالکل پاک ہو۔ جب تعلیم میں صنف' جغرافیہ اور زبان جیسے تعصبات دخل پاجائیں تو وہ تعلیم مکمل تعلیم نہیں رہتی۔ ادھوری رہ جاتی ہے۔ ادھورا علم مرد کی تربیت پوری طرح نہیں کرسکتا اور ادھوری تربیت کسی بھی مرد کو مکمل انسان نہیں بناسکتی۔ نظریاتی طور پر جاننے اور سیکھنے کا سارا عمل اس بات پر دارومدار رکھتا ہے کہ ہر فرد کو اپنے منصب اور اپنے فرائض کا شعور ہو۔ اس طرح ہر فرد' معاشرے کے لئے ایک مفاتی' مفید اور ذہنی طور پر کشادہ وحدت کا کام دیتا ہے۔ جب تعلیم افراد کو متحرک کرنے کی بجائے جامد اور ان کا دائرہ کار بڑھانے کی بجائے محدود کر دیتی ہے۔ اس وقت تمام وسائل' محنت اور نظریات کار آمد اور مفید ہونے کی بجائے غیر موثر اور بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے تعلیم ایک اہم ذمہ داری ہے اور ایک حساس معاملہ ہے۔

عورتوں کی تعلیم دنیا کے تمام معاشروں کے لئے ایک بنیادی اور حساس معاملہ رہا ہے۔ یہ ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی کہ عورتوں کو معاشرے کا فعال اور متحرک حصہ بنایا جائے۔ تا کہ معاشی اور معاشرتی ترقی کے تمام عوامل اپنی قوت کے ساتھ تعمیر و تہذیب میں شامل کئے جاسکیں۔ ہر معاشرے نے اس صورت حال کو اپنے معاشی اور تہذیبی پس منظر میں جاننے اور اپنے فکری ماحول کے حوالے سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی' اور آج تک ان کوششوں کو پرکھنے اور جانچنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں نے منفی تعصب اور ناہمواریوں کو شعوری طور پر ختم کرنے کی کوشش کی

ہے۔ لیکن ابھی تک اس منزل کو نہیں پا سکے جس کا وعدہ تعلیم نے ہم سے کیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی تعلیم کا عمومی اور عورتوں کی تعلیم کا خصوصی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ احساس تو گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ معاشرے کے آدھے جیتے جاگتے حصے کو بے خبر اور جاہل نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ صورت حال ابھی تک واضح نہیں ہوئی ہے کہ عورتوں کو معاشرے کا ایک فعال اور مساوی طور پر متحرک فرد بنانے کے لئے اسے کن خطوط پر تعلیم دی جائے۔ معاشرے کی تعمیر اور ترقی میں عورتوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا شعور بھی موجود ہے۔ لیکن اس کو عملی طور مفید ثابت کرنے کے لئے معاشرتی منشاء کی ضرورت ہے۔ معاشرہ فرد کو کس منصب پر دیکھنا چاہتا ہے اور اس سے کس طرح کے فرائض کی توقع کرتا ہے؟ یہ معروضی زاویۂ نظر ابھی تک تعلیم کے اصول اور حصول پر اثرانداز نہیں ہو سکا ہے۔

عورتوں کی تعلیم، اس کے مناسبات اور متعلقات کا جائزہ لینے کے لئے اس ماحول پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ماحول فکر کا حصہ رہا ہے اور اسی سے معاشرتی منشاء کی ساخت و پرداخت ہوتی رہی ہے۔ یہ تصور تو ہمارے عام یقین کا حصہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کمزور ہیں۔ اور اس لئے وہ مردوں کے مقابلے میں کم تر بھی ہیں۔ ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داریاں انہیں ایثار اور قربانی ہی سکھاتی ہیں۔ اسی لئے عورت کا منصب گھر اور اس کے مناسبات سے متعین کر دیا گیا۔ اس کا فرض خدمت اور اطاعت ٹھہرا۔ جبکہ مردوں کے لئے خدمت کروانا اور اطاعت گزار رکھنا مخصوص سمجھا جانے لگا۔ زندگی شراکت کا نام ہے۔ لیکن یہاں شراکت کی بجائے الگ الگ دائرہ کار مصروف رہنا زندگی کی تعبیر کر دیا گیا۔ ایک طرف نسوانیت آئیڈیل ٹھہرائی گئی لیکن دوسری طرف، معاشرے کی بہت سی سطحوں پر انسانیت کا حق بھی اسے نہیں دیا گیا۔ وہ حق جو اسے مذہب اور اخلاق کے حوالے سے، پیدائشی طور پر میسر ہے۔ محنت و مشقت کرنے والے طبقہ میں تو عورت، زندگی کی مشقت میں برابر کی شریک رہی، لیکن متوسط طبقے میں عزت اور ساکھ کا یہ تصور ابھرا کہ عورتیں گھروں میں رہیں اور حصول معاش کی مصروفیت مردانگی کا جوہر سمجھی گئی۔ دنیا بھر میں اس صنعتی اور کاروباری طرز زندگی کے اثرات انیسویں صدی سے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ جبکہ "گھر

اور کاروبار کے درمیان فاصلہ بڑھا۔ زرعی معیشت میں فرائض اور مصروفیت کا ایسا فاصلہ نہیں تھا۔ اس لئے وہاں مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے چلے آرہے تھے۔ اور یہاں "گھر" یا "باہر" کی کوئی ایسی تفریق بھی نہیں تھی۔ زندگی کی تیزرفتاری نے گھر میں رہنے والی عورت کو بھی روزگار کی ضرورتوں میں شامل کیا۔ انہوں نے اپنے گھروں میں رہ کر ایسے کام کرنے شروع کئے جن سے انہیں آمدنی ہوسکتی تھی اور یہ سلسلہ آج تک چلا آتا ہے۔ سلائی' کڑھائی' بنائی آج تک وہ ذریعہ روزگار ہیں جنہیں عورتیں گھر اور بچوں کی مصروفیتوں کے ماسوا استعمال کرتی چلی آرہی ہیں۔ عورت کی نسوانیت کے لئے یہ لازم ہوگیا کہ وہ گھر کی سہولتوں اور آرام میں جس طرح ہوسکے کوشاں رہے۔ کیونکہ اس کا بنیادی فرض یہی ہے لیکن یہ تصور ہر عورت کا نہیں تھا۔ اس تصور کے تعین میں بھی طبقاتی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے' اپنے خون پسینہ سے گھر کی حالت بہتر کرنے والی یہ عورت اچھی محنتی عورت تھی۔ لیکن "خاتون" اور "بیگم" تو ایک اور عورت تھی جو مہذب اور تعلیم یافتہ بھی تھی اور جو اپنے گھر میں "راج" کرتی تھی۔

تعلیم یافتہ متوسط گھرانوں میں "خاتون خانہ" گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ ان کے کام کرنے کو ملازم اور نوکر موجود ہیں۔ تعلیم کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہ کیا جائے' اور ساری صلاحیتیں صرف دوسروں پر حکم چلانے میں صرف کردی جائیں۔ اس صورت حال نے بعض ایسے تضادات کو جنم دیا جنھوں نے معاشرتی زندگی کی بے چینیوں میں اضافہ کیا۔ زندگی کے لئے سہولتوں اور آسائشوں کا جو معیار مقرر کیا گیا وہ متوسط آمدنی کے اختیار میں نہیں تھا اور دوسری طرف یہ تعلیم یافتہ "خاتون" آمدنی میں اضافے کے لئے کوئی کام نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ اس سے اس کے منصب اور گھر کی آن پر حرف آجاتا۔ وہ تعلیم جو اس وقت انہیں میسر تھی وہ کسی صورت ان کے ذہن میں کشادگی اور نظر میں وسعت پیدا نہیں کرپاتی' کہ تعلیم کا مقصد محدود ہونا نہیں' بلکہ اپنے آپ کو زندگی کی ترقی کے عمل میں زیادہ سے زیادہ شریک کرنے کا نام ہے۔ آخر پڑھی لکھی عورتیں اس سطح پر سوچنے سے کیوں قاصر رہیں کہ وہ بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکتی ہیں تاکہ معاشرے کے اضطراب اور دباؤ میں کمی ہوسکے۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ تعلیمی نصاب تو مردوں اور عورتوں کے لئے مشترک ہی رہے، لیکن عورتوں کی فکری صلاحیتوں کی ضرورت کا احساس نہیں کیا گیا۔ یہ خیال آج بھی موجود ہے کہ فکر اور دانش عورت کو سجتی نہیں۔ اس لئے اس بات کی کبھی توصیف و تعریف بھی نہیں کی گئی، کہ عورتوں کی فکری صلاحیتوں کو نکھرنے بلکہ پنپنے کا ہی موقع دیا جائے۔ آج بھی یہ تصور مٹا نہیں ہے کہ دانش عورتوں کی نسوانیت کی کشش کو ختم کر ڈالتی ہے۔ گو کہ یہ بات واضح ہے کہ صلاحیتوں کے عطا کرنے میں قدرت نے کوئی تفریق نہیں برتی، یہ تو ماحول پر منحصر ہے کہ وہ فرد کو کس طرح پھلنے پھولنے کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ تعلیم کے اس نمائشی حصول نے عورتوں کی فعالیت کو اور بھی محدود کیا، اور انہیں ایسے سطحی تصورات پر یقین کرنے پر آمادہ کرلیا۔ جن کی وجہ سے زندگی کی اصلی صورت حال کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود انہیں یہ خیال رہا کہ وہ ان مسئلوں کے حل میں شریک نہیں ہوسکتیں۔ حالانکہ تعلیم اگر ان معاشرتی روایتوں میں دھندلی نہ کردی گئی ہوتی تو وہ انہیں زندگی کا خاموش کردار بننے کی بجائے کشمکش اور جدوجہد سے براہ راست مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرسکتی تھی۔

اس پس منظر میں ہمارے ملک میں تعلیم اور عورتوں کے لئے اس کی افادیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم کو وقت اور زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ نصاب تعلیم پر پوری توجہ دی جائے۔ اس بات پر توجہ کہ یہ نصاب عورت اور مرد کے سوال سے قطع نظر ایک فرد کو زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کس حد تک تیار کرتا ہے، یہی وہ نقطہ ہے جہاں تعلیم کے معروضی خدوخال واضح کئے جاسکتے ہیں تاکہ عورتوں کے لئے اپنا راستہ متعین کرنے اور معاشی عمل میں اپنی جگہ تلاش کرنے کا مسئلہ آسان ہوسکے۔ یہ مشورہ بات کو ٹالنے یا مسئلہ کی شدت کی نوعیت سے نظریں چرانے کے لئے نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ سنجیدہ خیال ہے کہ تعلیم اگر افادیت نہیں رکھتی، تو وہ ہمارے وسائل پر ایک بوجھ ہے، جو زندگی کے آتش دان پر نمائشی پیکر سجا رہی ہے۔ پانی اب سر سے گزر چکا ہے، اب زندگی کے مسئلوں کا مداوا کرنا ہے، اب ہم اس عیاشی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ نصاب تعلیم کی پہلی ضرورت

یہ ہے کہ وہ عصری تقاضوں سے باخبر ہو۔ پامال اور فرسودہ نصاب' جو ہماری ضرورتوں کے تناظر میں اندھے اور گونگے ہوں' ہماری تعمیر اور ترقی میں مددگار نہیں ہوسکتے۔ تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ تعلیم جس کا بنیادی وظیفہ تعصبات اور تفریقات کو مٹانا ہے۔ وہ تعصب اور تفریق کو بڑھانے کا آلہ کار ہوتی جا رہی ہے۔ حوالے کے لئے سکولوں میں پڑھایا جانے والا اسلامیات کا نصاب دیکھا جاسکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں سرکاری اور نجی اداروں کا جو فرق ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ "خاتون" اور "بیگم" بنانے والے نجی تعلیمی ادارے عورت کو جس زندگی کے لئے تیار کر رہے ہیں وہ اصلی نہیں ہے۔ ادھر سرکاری اداروں میں "اچھی اور محنت کرنے والی عورتیں" تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہیں۔ یہ تفریق صرف طبقاتی نہیں ہے بلکہ زندگی کے بنیادی روّیوں کا فرق ہے۔ ہم اپنی آبادی کو خود بے خبر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دو طبقے جو تعلیم کے حوالے سے شاید لاشعوری طور پر اپنے لئے الگ الگ راستہ اختیار کر رہے ہیں اور معاشرے کو کمزور کرنے میں مددگار ہیں۔ ایک طبقہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود کو اس طرح ارفع و اعلیٰ سمجھنے لگتا ہے کہ زندگی کے مسئلوں کو حل کرنا ان کے خیال میں ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ دوسرا وہ طبقہ جو ایک احساس محرومی کے ساتھ اس تعلیم کو قبول کرتا ہے۔ جس کے علاوہ کوئی اور وسیلہ اسے میسر نہیں ہوتا' خود کو زندگی کے مسئلوں کے سامنے بے بس پاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دونوں سطحوں پر تعلیم افراد کو موثر معاشرتی وحدت بنانے میں ناکام ہو رہی ہے۔

جب تعلیم زندگی کی ضرورتوں سے نبرد آزما ہونے کے کام نہ آسکے' تو پھر یہ بات اپنی اہمیت کھو دیتی ہے کہ جو کچھ سکھایا جا رہا ہے' وہ کیا ہے؟ کیا ہماری زندگی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یا مفروضوں اور نظریوں کو ذہن نشین کرلینا ہی تعلیم یافتہ ہونے کو کافی ہے۔ جب تک تعلیم کو زندگی کی ضرورت نہ سمجھا جائے اور اس رعایت سے نصاب مرتب نہ کئے جائیں اس وقت تک یہ توقع صرف دل بہلاوا ہے کہ یہ تعلیم ہمارے لئے ترقی اور استحکام کی راہ متعین کرے گی۔ اور افراد کو اس طرح باشعور اور ذی ہوش بنا سکے گی۔ کہ وہ زندگی کے مسئلوں اور ان کے حل کو تعلیم سے مطابقت دے سکیں گے اور ان دونوں کے درمیان کے رشتہ اور تعلق کو محسوس کرکے خود کو تیار کرسکیں گے۔ رویوں کی

اس سطحیت نے تعلیم کو عمومی سطح پر ہماری آبادی کا مقدر نہیں بننے دیا۔ عورتوں میں 26 فیصد خواندہ شمار کی جاتی ہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ وہ عورت جو قرآن پاک صرف حروف پہچان کر پڑھ سکتی ہے وہ خواندہ ہے۔ لیکن اردو یا علاقائی زبان کا ایک جملہ بھی نہیں پڑھ سکتی۔ باقی بنیادی لکھائی اور حساب سے واقفیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم کے مسلّمہ معیار یعنی پڑھنے لکھنے اور بنیادی حساب جاننے کی میزان پر شاید صرف 6 فیصد خواتین شمار کی جاسکیں۔ یہ حتمی اعداد و شمار نہیں ہیں۔ یہ ایک محتاط اندازہ ہے جو صورت حال کے غیر جذباتی تجزیہ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ جس ملک کا مسئلہ افراط زر' مہنگائی اور آبادی کے بے اختیار اضافہ کی تہہ داری سے ہر آنے والے دن کے ساتھ سنگین ہوتا جاتا ہو' وہاں تعلیم کے معاملے میں یہ صورت حال روشنی کی کرن بھی نہیں دکھاتی۔

آبادی کے اس تشویشناک اضافہ پر قابو پانے کے لئے عورت کے شعور کو بیدار کرنا اور اس کو اپنی معاشی اور معاشرتی ضرورتوں سے آگاہ کرنا صرف تعلیم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ جب تک تعلیم اسے یہ اطلاع اور اعتماد مہیا نہ کرے کہ معاشرے میں اس کے منصب کا اعتبار اس کے متحرک' فعال' حساس اور باخبر فرد ہونے پر ہے۔ اس وقت تک وہ اپنی شخصیت کو ان ہی روایتی تصورات کے حوالے سے پہچانتی رہے گی جو معاشرتی منشاء میں حکم کا درجہ پا چکے ہیں۔ عورتوں کو ان تصورات پر پورا اترنے کے لئے تمام تر کوشش اور توجہ زندگی بھر صرف کرنا پڑتی ہے۔ تھوڑی دیر کو اگر خود کو یوں فریب دے لیا جائے کہ زندگی کے مسئلوں کو سلجھانے اور معاشرتی منشاء میں صحت مند تبدیلی لانے کے لئے عورت کی شرکت ہرگز ضروری نہیں ہے۔ تو کیا آبادی کے اضافہ کے سوال پر بھی ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ عورت کو وقت کی مناسبت اور حالات کی مطابقت سے تعلیم دیئے بغیر ہم افلاس' مجبوری اور بیچارگی سے اپنے آپ کو اجتماعی طور پر محفوظ رکھ سکیں گے؟ جسے حالات کی نوعیت کی خبر نہیں ہوگی' وہ تبدیلی کے عمل میں کیونکر شریک ہوسکتی ہے؟ یہ فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہیں اپنی زندگی کو پہچاننے اور اسے باشعور فرد کی طرح گزارنے کا سوال ہے۔ ترقی کے راستہ کا کلیدی لفظ احتیاط ہے۔ اس لئے کہ ترقی کی رفتار کا ساتھ احتیاط کے سوا کسی اور طرح نہیں دیا جاسکتا ہے۔ باموقعہ اور برمحل تعلیم احتیاط کے اس

رویئے کی نشوونما کرتی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں انتخاب اور قبول کے ایسے پیمانے مدنظر نہیں ہیں جو وسائل اور وقت دونوں کو احتیاط سے استعمال کرسکیں۔ وہ خوش نصیب عورتیں جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرلیتی ہیں انہیں اپنے علم اور ہنر کو برتنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسلئے کہ تعلیم نے انہیں خاص طور پر زندگی کے لئے تیار نہیں کیا۔ وہ اس بات سے باخبر نہیں ہوتیں کہ ان کی تعلیم ان کے لئے ملازمت کے علاوہ بھی کچھ اور مہیا کرسکتی ہے۔ بات پھر وہیں جا پہنچتی ہے کہ جو کچھ انہوں نے سیکھا وہ زندگی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتا اور تعلیم نے انہیں اس صف میں لاکھڑا کیا۔ جہاں زندگی کو اپنی سمجھ اور اپنی ضرورت سے گزارنا ان کا منصب نہیں بن سکا۔ یہ اختیار اور انتخاب اب بھی کسی اور کا رہا۔ معاشرے میں ذمہ داری کا احساس' فرد کے وجود کی افادیت کو قائم رکھتا ہے۔ اگر ہمارے تمام نصاب بھی اس شعور کو پیدا نہ کرسکیں تو پھر تعلیم کا کیا فائدہ متعین کیا جاسکتا ہے؟

اعلیٰ تعلیم کے تجربے نے عورتوں کے لئے ملازمت کے دروازے کھولے اور عورتوں کا آمدنی کے لئے کام کرنا معاشرے میں کسی حد تک قبولیت کا درجہ پاسکا۔ لیکن ابھی بھی ملازمت پیشہ خواتین کو وہ مقام میسر نہیں' جو امیر گھرانوں کی بے فکر خواتین کا حصہ ہے۔ ماضی قریب تک عورتوں کے لئے قابل قبول معزز' پیشے استاد اور ڈاکٹر بن جانے کے تھے۔ اب اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں ان کا داخلہ ممکن ہے لیکن کلیدی آسامیوں پر تقرری ابھی بھی ان کا حق نہیں ہے۔ معاشرتی منشاء ابھی بھی ان خواتین کو فوقیت دیتی ہے جو تعلیم حاصل کرلیں مگر معاشی مصروفیت میں شامل نہ ہوں۔ اس کی وجہ وہ طبقاتی تفریق ہے جہاں تعلیم کو صرف "ضرورت" پورا کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور تعلیم خود ایک ضرورت نہیں ہے۔ معزز ہونے کے لئے جو فہرست معاشرے نے ترتیب دی ہے اب اس میں تعلیم بھی شامل ہے لیکن اس تعلیم کا فکر و عمل کے لئے شمار کیا جانا ابھی بھی اس فہرست انتخاب سے خارج ہے۔ گو کہ تعلیمی اعداد و شمار اس بات کے گواہ ہیں کہ عورتیں قابلیت' لیاقت اور محنت میں مردوں سے آگے ہیں۔

یہ تقابلی جائزہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر تعلیم کو زندگی کے عملی پہلو سے

زیادہ سے زیادہ مطابق کرنے کی کوشش کی جائے تو عورتیں زیادہ فعال' متحرک اور فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ایک محدود پیمانے پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ مقابلے کی سخت کوشی سے عورتوں کی صلاحیتیں کم نہیں ہوتیں' تو یقیناً انہیں ایسی تعلیم بھی دی جاسکتی ہے جہاں ہمارے وسائل اور وقت کا ضیاع نہ ہو' فرد کی صلاحیتوں کا اعتراف' اور ان کو اجتماعی زندگی میں شامل کرنے کا خیال ہمارے مذہب اور اخلاق کا حصہ ہے۔ متصادم قوتیں تو وہ ہیں جو روایتی طور پر معاشرتی منشا کی تشکیل کرتی چلی آرہی ہیں۔ معاشرے میں مذہبی تصورات سے زیادہ قوی نظر آتے ہیں۔ تعلیم کی بدولت ہی یہ صورت حال شفاف ہوسکتی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ اگر ہم عورتیں حقیقتوں کی ترجمان تعلیم حاصل نہیں کرسکیں گی۔ تو مفروضات پر مبنی روایات ہمارا راستہ روکتی رہیں گی۔ عورتیں زندگی کی برابر کی شریک ہیں جب اس زندگی کے متعلق علم میں بھی وہ اتنی ہی قوت سے شریک ہوں گی تب ہم اپنی تقدیر لکھ سکیں گے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کا معاملہ وقت کی رعایتوں کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اپنی بقاء عزیز ہے تو ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر عورتوں کو ایسی تعلیم مہیا کرنا ہوگی جو انہیں فائدہ مند شہری بناسکے تاکہ وہ معاشرتی بہتری کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر مددگار ثابت ہوسکیں۔ ہمارے نظام تعلیم کو ایک سنجیدہ تنظیم کی ضرورت ہے۔ ایسے مضامین' جن کی تعلیم کے لئے مخصوص ادارے موجود ہیں۔ انہیں عام نصابات میں شامل نہ کیا جائے تاکہ وقت اور وسائل کی بچت ہوسکے۔ ہمارے وسائل ہمارے وقت کی طرح بیش قیمت ہیں اور ہماری صورت حال میں ہم اس تن آسانی اور بے فکری کے متحمل نہیں ہوسکے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اس طرح نصابات زیادہ منظم ہوجائیں گے اور بے کار کی تکرار سے بچ سکیں گے۔ یہ تکرار تعلیم کے مقاصد کو کم اعتبار کرتی ہے اور مجموعی طور پر قومی تقاضوں کی مطابقت سے اس تعلیم کا بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ عورتوں کے لئے بے مقصد' بے نشان اور بے منزل تعلیم ایک مجموعی نقصان ہے۔ ہمیں تعصب سے بلند ہوکر معاشرے کے ہر فرد کی طرح عورت کو بھی زندگی کا شعور اور اس کی قدروقیمت سے باخبر کرنا ہے۔

سماجی اور سیاسی تحریکیں اور خواتین

حنا جیلانی

برصغیر کی عورت کی سماجی تاریخ پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ سماجی اور سیاسی واقعات کی جو تاریخ لکھی گئی ہے اس میں اس بات ذکر مفقود ہے کہ ان واقعات کا عورت کی زندگی پر کیا اثر پڑا یا عورتوں نے اپنی زندگی کے تناظر میں ان واقعات پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا۔ تاہم انیسویں صدی کی ایک معاشرتی تحریک ایسی ہے جسے برصغیر کی مسلمان عورتوں کے لحاظ سے ایک نہایت اہم واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ تحریک تھی مسلمانوں کی تعلیم اور ان میں سماجی شعور بیدار کرنے کے لئے چلائی جانے والی علی گڑھ تحریک' اس نے مسلمان عورتوں کے معاشرتی حالات کو بھی اجاگر کیا۔ ابتداء میں اس تحریک نے عورتوں کی تعلیم کے مسئلے کو بالکل نہیں چھیڑا۔ بلکہ اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ سرسید احمد خاں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے عورتوں کی تعلیم کو ترجیح دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لئے یہ مسئلہ اتنا ضروری نہیں تھا۔ لیکن مسلمانوں میں اس تحریک سے جو عام بیداری پیدا ہوئی اس کے نتیجے میں عورتوں کی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی اور معاشرتی ترقی اور سماجی بیداری میں عورت کے کردار کے بارے میں بھی مسلمانوں کے رویئے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ البتہ یہ رویہ صرف پڑھے لکھے مسلمانوں تک ہی محدود رہا' عام مسلمانوں نے اس سے زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔ بہرحال عورتوں کی بیداری کے لئے جن تبدیلیوں کی حمایت کی جا رہی تھی اس پر عام مسلم معاشرہ کا ردعمل کیا تھا؟ اسے سمجھنے کے لئے اس تحریک کا مطالعہ ضروری ہے۔

بہت سے ماہرین تنظیم اس بات کا رونا روتے ہیں کہ نئے نظام تعلیم نے ہمارے روایتی نظام تعلیم کو ختم کردیا جو صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ ان کے نزدیک پاکستان اور ہندوستان میں تعلیم کے زوال کا بڑا سبب بھی یہی ہے۔ اس نظام کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں حالات کے تحت اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور

وہ صدیوں سے حالات کے نشیب و فراز کا مقابلہ کر رہا تھا اور اسی لئے وہ عام لوگوں میں مقبول تھا۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں لڑکی یا عورت کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسی طرح ہندوؤں میں اچھوت کو بھی اس سے الگ رکھا جاتا تھا۔ 1824ء - 1825ء میں صوبہ بمبئی میں کسی جگہ بھی پڑھنے والی لڑکی کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ کوئی غلطی یا خامی نہیں تھی بلکہ یہ کہ مدرسے اور پاٹھ شالائیں صرف لڑکوں کے لئے ہی ہوتی تھیں۔

دوسرے صوبوں میں بھی حالات اس سے زیادہ بہتر نہیں تھے۔ ولیم ایڈمز نے 1920ء کی دہائی میں تعلیم سے متعلق جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال میں حالات اور بھی خراب تھے۔ بنگال کی 496974 کی آبادی میں صرف چار عورتیں خواندہ تھیں جبکہ خواندہ مردوں کی تعداد 21907 تھی۔ تاہم گھروں میں مسلمان عورتوں کو پڑھانے کا رواج تھا اس طرح پڑھے لکھے ہندو خاندانوں میں بھی لڑکیوں کو گھر میں پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن ایسی تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ بہرحال گھروں یا مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والی چند لڑکیوں کے سوا ملک بھر میں کہیں بھی لڑکیوں کو باقاعدہ تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا چنانچہ عورتیں عام طور پر تعلیم سے محروم رہتی تھیں۔

اس دور میں برطانوی حکام کے درمیان یہ بحث چلتی رہی کہ کیا ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی سماجی حیثیت میں ترقی کے لئے کوئی کام کرے یا نہ کرے؟ ان میں جو قدامت پسند حکام تھے وہ اس سلسلے میں کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں سماجی اور مذہبی معاملات میں غیرجانبدار رہنا چاہئے اور یہ کہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف معاشرہ میں جو تعصب موجود ہے اس کی جڑیں عام لوگوں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں بہت گہری ہیں۔ اسی لئے اگر عورتوں کی تعلیم کے لئے کوئی بھی کوشش کی گئی تو اس سے ہنگامہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ البتہ 1850ء تک یہ رویہ بدل چکا تھا اور اس میں لارڈ ڈلہوزی کا ہاتھ زیادہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے حکومت کو کھل کر تعلیمی اداروں کی سرپرستی کرنی چاہئے۔ 11 اپریل 1850ء کو انہوں نے جو حکم جاری کیا اس سے برطانوی حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کا اندازہ ہوتا

ہے۔ وہ حکم یہ تھا۔

"گورنر جنرل کی رائے میں لوگوں کی عادات و اطوار میں کوئی تبدیلی اس وقت تک زیادہ اہم اور کار آمد نتائج کی حامل نہیں ہو سکتی جب تک ان کی لڑکیوں میں تعلیم کو فروغ نہ دیا جائے۔ عام رواج یہ ہے کہ عورتوں کو جاہل رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس رواج کو مذہبی جواز حاصل نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو خاندان مالی طور پر برداشت کرسکتے ہیں ان کے ہاں گھروں کے اندر لڑکیوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔

گورنر جنرل ہدایت کرتے ہیں کہ تعلیمی کونسل کو مطلع کر دیا جائے کہ آئندہ مقامی لڑکیوں کی تعلیم کو وہ اپنے فرائض میں شمار کرے اور مقامی لوگ جہاں بھی ایسے سکول قائم کرنے کی خواہش ظاہر کریں ان کی پوری حوصلہ افزائی کی جائے اور کونسل کے تحت کام کرنے والے اداروں کے منصوبوں کے مطابق ان کے لئے بھی ایسے منصوبے بنانے میں ان کی مدد کی جائے۔"

انیسویں صدی کے آغاز میں ہی دیسی نظام تعلیم کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ اس صدی کے وسط تک اس طریق تعلیم کی وہ تمام خوبیاں بے کار ہوگئی تھیں جو اس کے ساتھ منسوب کی جاتی تھیں۔ وہ نظام زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہ نظام اپنے قدامت پسندانہ رویئے' متروک افکار اور دقیانوسی طرز کی وجہ سے بالکل ہی بے اثر ہوگیا۔ یہ دور اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ مختلف صوبوں میں نئی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا اور خاص طور سے عورتوں میں تعلیم پھیلانے پر توجہ دی گئی۔ مسلمان اور اچھوت بھی اس میدان میں آگے بڑھے۔ لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے جدید تعلیم کو جلدی قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں کی طرف سے انگریزی تعلیم کے خلاف برابر مزاحمت جاری رہی۔

مسلمان عورتوں کے لئے دیسی نظام تعلیم بے مقصد تھا۔ ان کی زندگی میں وہ بہت کم کام آتا تھا۔ انہیں گھروں میں تھوڑی بہت مذہبی تعلیم دے دی جاتی تھی۔ انہیں قرآن پڑھایا جاتا تھا جسے وہ زبانی یاد کرلیتی تھیں۔ اس کے معنی سمجھنا ان کے لئے ضروری نہیں تھا۔ بہت کم لڑکیوں کو مکتب میں تھوڑی بہت ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ بالغ

ہونے کے ساتھ ہی ان کی شادی کر دی جاتی تھی۔ کچھ لڑکیوں کو عورتیں ہی گھر پر پڑھاتی تھیں۔

البتہ شہزادیاں اور اعلیٰ خاندان کی عورتیں ادب اور سیاست میں نام پیدا کرتی تھیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے مورخوں نے ان خواتین کو بھی ان کا حق نہیں دیا۔ ان خواتین نے ہندوستانی کلچر اور ہندوستان کی سیاست پر جو اثرات مرتب کئے ہیں انہیں عام طور پر نظرانداز کیا جاتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ بعض مورخوں نے ان خواتین کے ساتھ تعصب برتا ہے جنہوں نے سیاسی اقتدار حاصل کیا یا سیاسی حالات پر ان کا کوئی اثر رہا ہے۔ اکبر کے زمانے میں ماہم آنکا کی وزارت عظمیٰ کے دور کو حقارت کے ساتھ اکبر کی "پیٹی کوٹ حکومت" کہا جاتا ہے۔ جن عورتوں نے ملکہ کی حیثیت سے حکومت کی یا حکومت میں انہوں نے کوئی کردار ادا کیا انہیں یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ وہ "حرم کی چالاک اور مکار عورتیں تھیں۔"

انگریزوں کے خلاف 1857ء کی بغاوت کی ناکامی نے نفسیاتی طور پر ہندوستانی مسلمانوں پر بہت برا اثر ڈالا۔ خاص طور سے شمالی علاقوں کے مسلمان اس سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اقتدار چھن جانے کے بعد وہ اچانک حکمران سے ایک اقلیت بن گئے تھے۔ ان کے اندر جو بددلی پیدا ہوئی اس کی وجہ سے وہ اپنے اندر ہی سکڑ کر رہ گئے چنانچہ انہوں نے برصغیر کے دوسرے طبقوں کے مقابلے میں اپنی علیحدہ شناخت کی تلاش شروع کر دی۔ مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس جوں جوں بڑھا ویسے ہی کٹر مولویوں کو یہ موقع ملا کہ وہ ان کے اندر دقیانوس خیالات پیدا کریں اور خاص طور سے اپنی مسلم شناخت پر زیادہ زور دیں۔ انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا گیا کہ ان کے نظام تعلیم کو ہی سرے سے رد کر دیا گیا۔ انگریزی تعلیم کو خلاف مذہب اور ناپاک قرار دے دیا گیا۔ مسلم عورتوں کے لئے تو ایسی تعلیم بالکل ہی ممنوع قرار دے دی گئی۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے اتنی شدومد کے ساتھ نئی تعلیم کی مخالفت اس لئے بھی کی گئی کہ مذہبی تعلیم میں ساری اجارہ داری علماء کی ہوئی تھی۔ نئی تعلیم میں ان کے ہاتھ سے یہ سارا نظام نکلتا جا رہا تھا۔

یہی دور تھا جب سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی معاشرتی اور تعلیمی بیداری کے لئے تحریک شروع کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر مسلمان طاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے جس مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی اس نے مذہبی تربیت کے ساتھ سائنسی علوم اور مغربی فلسفہ کا علم حاصل کرنے کی بھی تلقین کی۔ تاہم مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے ضمن میں ان کے خیالات بھی دقیانوسی مسلمانوں سے مختلف نہیں تھے۔ اس عظیم مصلح قوم نے جو جدید تعلیم کا اتنا بڑا مبلغ تھا ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کے لئے جدید تعلیم کی درسگاہیں قائم کرنے کی وکالت بالکل نہیں کی۔

البتہ بہت سے روشن خیال امراء و رؤسا اور پیشہ ور افراد نے اپنی عورتوں کو جدید تعلیم دلانا شروع کردی تھی۔ چنانچہ بالائی طبقے کی انہیں خواتین نے پھر عورتوں کی تعلیم کے لئے ہی مہم چلائی۔ یہ خواتین چونکہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے والدین اور شوہروں کے بہت زیادہ اثر و رسوخ تھے اس لئے کٹر مذہبی حلقوں کی طرف سے جب اس مہم کی مخالفت کی گئی تو انہوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ اس پوزیشن میں تھیں کہ اس کا جواب دے سکیں۔ مغربی ساحلوں پر رہنے والے کاروباری مسلمان خوجوں اور بوہروں نے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کو جدید تعلیم کے لئے نئی درس گاہوں میں بھیجا۔ شمالی علاقوں کے جاگیردار خاندانوں نے سب سے آخر میں جدید تعلیم کو قبول کیا۔

1886ء میں لاہور میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ جس میں عورتوں کی تعلیم کے لئے جو قرارداد پیش کی گئی' مذہبی اور دقیانوسی حلقوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت کی گئی بلکہ مسلمانوں کے جو روشن خیال طبقے کہلاتے تھے ان کا رویّہ بھی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ سرسید احمد خاں نے اس پر جس ردِ عمل کا اظہار کیا اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"لوگوں کو یہ دیکھ کر ضرور تعجب ہوگا کہ اکثر معاملات میں میرے خیالات ترقی پسندانہ ہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں میرے خیالات وہی ہیں جو بزرگوں کے

ہیں۔ ہندوستان میں یہ وقت مناسب نہیں ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سکول قائم کئے جائیں اور لڑکیوں کے لئے یورپ کے سکولوں کی نقل کی جائے۔"

اس اجلاس میں جو قرارداد منظور کی گئی وہ سرسید احمد خاں کے خیالات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں عورتوں کی تعلیم کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن کہا گیا کہ "یہ تعلیم معزز مسلمانوں کی عزت و وقار اور حالات کے مطابق اور مذہبی تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے۔"

پانچ سال بعد 1891ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں ہوا' اس میں پھر عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ کئی مقرروں نے سرسید احمد خاں کے خیالات کا حوالہ دیا اور ان کے منفی رویہ کی پر افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم کے ان مبلغوں کے لئے عورتوں کی تعلیم کو قبول کرنا اب بھی مشکل تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورتیں بھی مردوں کے برابر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں۔ آخر 1902ء میں علی گڑھ کے شیخ عبداللہ نے مسلمان عورتوں کی تعلیم کا پرچم بلند کیا۔ انہوں نے اپنی بیگم کی مدد سے' جو خود عورتوں کی تعلیم کی زبردست حامی تھیں' 1906ء میں مسلمان عورتوں کے لئے پہلا انگلش سکول کھولا۔ کٹر اور دقیانوسی حلقوں کے زیر اثر عام مسلمان انگریزی تعلیم کو عورت کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اس سے عورتوں کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان حلقوں میں عورتوں کی تعلیم کے حامیوں کو کافر تک کہا گیا۔ کٹر مذہبی مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ بعض قدامت پرست ہندوؤں نے بھی شیخ عبداللہ کی زبردست مخالفت کی۔ تاہم انہیں سروجنی نائیڈو' بیگم عباس طیب جی' لیڈی عبداللہ سہروردی' عطیہ فیضی اور ان جیسی دوسری روشن خیال خواتین کی طرف سے زبردست حمایت حاصل ہوئی۔

1903ء میں کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ یہ اجلاس اس اعتبار سے نہایت اہم ثابت ہوا کہ یہ پہلی بار کانفرنس میں عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ اس اجلاس میں مدراس کی ایک مسلمان خاتون چاند بیگم نے ایک مضمون بھی پڑھا۔ اس مضمون میں انہوں نے "ریفارم پارٹی" کی حمایت کی جو مسلم عورتوں کی تعلیم کے لئے لڑ رہا تھا اور

رجعت پسند مولویوں کو خوب سنائیں۔ انہوں نے مسلمان عورتوں سے اپیل کی کہ وہ ریفارم پارٹی کی کھل کر حمایت کریں۔ ریفارم پارٹی ہندوستان کی تمام عورتوں کے لئے جدید تعلیم کی مہم چلا رہی تھی۔

اس وقت تک یہ تحریک پورے زور شور کے ساتھ چل چکی تھی ادھر ایک اور عنصر نے اس تحریک کو ہی تقویت نہیں بخشی بلکہ ہندوستانی معاشرہ میں مسلمان عورت کے مقام پر بحث و تمحیص کا دروازہ بھی کھول دیا۔

اردو ایک ثقافتی زبان تھی اس لئے اس نے عورتوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ایک فورم مہیا کیا۔ گزشتہ صدی کے اختتام اور اس صدی کے آغاز میں مسلم عورتوں نے ادب اور اردو صحافت میں بڑا نام پیدا کیا۔ 1896ء میں عورتوں کا ایک عہد آفریں، ہفت روزہ "تہذیب نسواں" لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے پہلے ہی شمارہ میں عورتوں کے ایک بڑے حلقے نے اس میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں لکھنے والی عورتیں ملک کے دور افتادہ اضلاع میں رہتی تھیں لیکن وہ سب اصلاحات کی حامی تھیں اور اصلاحی مضامین لکھا کرتی تھیں۔ ان کے مضامین میں جہیز، توہمات اور فضول خرچیوں کے خلاف ہوتے تھے۔ انہی دنوں عورتوں کے کئی اصلاحی ناول بھی شائع ہوئے۔ یہ ادب پڑھی لکھی عورتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں مقبول ہو رہا تھا۔ عورتوں کے اس جوش و خروش نے حساس اور روشن خیال مردوں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے 1905ء کے اجلاس میں مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور نظم "چپ کی داد" پڑھی۔ مولانا کی طرف سے نہایت اثر انگیز انداز میں عورتوں کی تحریک کو یہ خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ عورتوں پر کئے جانے والے مظالم کے خلاف یہ شدید احتجاج تھا۔

1908ء میں شیخ عبداللہ نے بھی ایک ماہنامہ "خاتون" نکالا جس میں پردہ ختم کرنے کی حمایت کی جاتی تھی۔ دہلی سے علامہ راشد الخیری نے اپنا مشہور رسالہ "عصمت" بھی انہی دنوں نکالنا شروع کیا۔ راشد الخیری بہت زود نویس تھے انہوں نے اپنے متعدد ناولوں میں عورتوں کے حالات کو اجاگر کیا اور ان کے مسائل نمایاں کر کے پیش

کیے۔ ان دنوں رسالہ "تہذیب نسواں" اور "عصمت" ایک قسم کے قومی ادارے بن گئے تھے۔ اس کے بعد مختلف شماروں سے عورتوں کے اور بھی رسالے شائع ہونا شروع ہوئے۔ اب عورت کے ہاتھ میں ایک طاقتور اور موثر پریس آگیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس تحریک کا اثر پورے ملک میں محسوس کیا جانے لگا۔ عورتوں کی تعلیم کے لئے رضاکارانہ طور پر جو کام کیے جا رہے تھے۔ انہوں نے مسلمان عورتوں کے اندر بیداری پیدا کی۔ بالائی طبقے کی عورتیں ہی اس تحریک کی قیادت کر رہی تھیں۔ 1920ء کی دہائی تک ایسی عورتوں کی کافی تعداد پردے سے باہر آگئی تھی اور نوجوان عورتوں کے مسائل میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔ متعدد نوجوان عورتیں سکولوں میں استانیاں' کالجوں میں لیکچرار اور سکول انسپکٹر بن چکی تھیں کئی عورتیں ڈاکٹر بھی تھیں۔ ایک اندازہ کے مطابق 1911ء میں پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد فی ہزار صرف دو تھی۔ 1921ء میں یہ تعداد دوگنی ہوگئی تھی۔ ایک اور اندازہ کے مطابق 1942ء میں 137800 مسلم عورتیں خواندہ تھیں جن میں سے 3940 نے جدید تعلیم حاصل کی تھی۔ اگر اس زمانے میں مسلمان عورتوں کی آبادی کو مدنظر رکھا جائے تو متذکرہ تعداد اس تحریک کے زیادہ موثر ہونے کی نشاندہی نہیں کرتی۔ یعنی وہ تحریک تمام حلقوں اور شعبوں پر حاوی نہیں تھی۔ بہرحال یہ تو درست ہے کہ معاشرتی اصلاحات اور تعلیمی سرگرمیاں زیادہ تر شہروں کے متوسط طبقے تک ہی محدود تھیں لیکن اس طبقے کی عورتوں میں جو بیداری پیدا ہوئی تھی اس نے اصلاحات کا حامی ایک بڑا گروپ پیدا کر دیا تھا۔ جس نے ہندوستان کی مسلم عورتوں میں ایک طبقہ کے طور پر ایسا شعور بیدار کیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ترکی میں عثمانی خلافت کے خاتمے کے خلاف ہندوستان میں جو تحریک چلائی گئی اس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہی موقع تھا جب ہندوستان کی مسلمان خواتین نے پہلی بار سیاست میں عملی حصہ لیا۔ تمام مرد رہنما جیلوں میں چلے گئے اور خطرہ تھا کہ تحریک کہیں دم ہی نہ توڑ دے تو مولانا محمد علی کی والدہ بی اماں کی قیادت میں مسلمان عورتیں میدان میں اتریں۔ یہ خواتین صحیح معنی میں سیاسی پیش رو ثابت

ہوئیں اور برصغیر کی تحریک آزادی میں عورتوں کی شمولیت کے لئے انہوں نے راستہ ہموار کیا۔ عورتوں میں سیاسی شعور کی بیداری اس معنی میں نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے بعد ہی عورتوں کو اپنی کمتر حیثیت کا احساس ہوا اور شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنے اور عورتوں سے متعلق قوانین میں اصلاحات کرانے کا جذبہ پیدا ہوا۔

برطانوی حکومت نے چونکہ ہندوستان کو بتدریج سیلف گورنمنٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اس لئے عوامی احساسات کا اندازہ لگانے کے لئے سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان مونٹیگو نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ اس وقت سروجنی نائیڈو کی قیادت میں عورتوں کے ایک وفد نے ان سے ملاقات کی اور پہلی بار عورتوں کے لئے ووٹ کے حق کا مطالبہ کیا۔ تہذیب نسواں نے اس مطالبہ کو خوب اچھالا اور مسلمان عورتوں کو اس حق کے لئے جدوجہد کرنے پر اکسایا۔ تاہم مونٹیگو چیمس فورڈ تجاویز میں عورتوں کے اس مطالبہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا سوائے اس کے کہ ووٹروں کا حلقہ وسیع کرنے کی بات کی گئی تھی۔

یہ مطالبہ سٹیچوٹری کے سامنے 1919ء میں بھی دہرایا گیا لیکن اس موقع پر بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ کمیٹی نے کہا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں عورتوں کو ووٹ کا حق دینا عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ 1919ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بل پیش کئے جانے کے بعد ہی یہ مطالبہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا لیکن وہاں فیصلہ کیا گیا کہ یہ معاملہ صوبائی حکومتوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

لیکن عورتوں نے اپنے مطالبہ کے حق میں جدوجہد برابر جاری رکھی۔ چنانچہ صوبائی اسمبلیوں میں اس پر غور کیا گیا۔ اس سلسلے میں مدراس نے پیش رفت کی۔ بہار اور اڑیسہ کے سوا تمام صوبوں میں 1925ء تک عورتوں کو ووٹ کا حق دے دیا گیا تھا۔ بہار اور اڑیسہ میں 1928ء میں یہ حق دیا گیا۔ تاہم عورتوں کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ شرط تھی کہ صاحب جائیداد شخص ہی ووٹ دے سکتا ہے۔ چنانچہ عورتوں کو مکمل حقوق حاصل کرنے کے لئے کافی عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ پھر بھی ان کی جدوجہد عوام کی

نظروں میں آگئی تھی اور انہیں مختلف حلقوں کی ہمدردیاں حاصل ہو گئی تھیں۔

1919ء کی مونٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات پر غور کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم کی گئی تھی اس نے 1928ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا۔ "رائے شماری کا کوئی نظام اس وقت تک تسلی بخش نہیں ہو سکتا اور اس وقت تک اچھی حکومت کی ضمانت نہیں بن سکتا جب تک دونوں جنسوں کے درمیان رائے شماری میں عدم مساوات برقرار رہے گی اس لئے ہمارا خیال ہے کہ عورتوں کے ووٹ دینے کے لئے اہلیت کی کچھ خاص شرائط مقرر کر دی جائیں۔"

1930-31ء کی پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس صرف اس اعتبار سے ہی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس میں ہندوستانی عورتوں کی طرف سے یادداشت پیش کی گئی تھی بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں جن دو عورتوں نے شرکت کی تھی ان میں مسلمان عورت بیگم جہاں آراء شاہنواز بھی تھیں۔ اس وقت جو یادداشت پیش کی گئی تھی اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ عورتوں کی سیاسی حیثیت کو کانفرنس میں زیر بحث لایا جائے اور کسی مرد یا عورت کو مذہب' ذات' برادری یا جنس کی بنیاد پر سرکاری عہدہ یا تجارت اور پیشے کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔ یادداشت میں جنسی امتیاز کے بغیر ہر شہری کے مساوی حقوق و فرائض کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔

اس ساری مہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا تو ساٹھ لاکھ عورتوں کو ووٹ کا حق مل گیا۔ کونسل آف سٹیٹ کی 160 نشستوں میں سے چھ اور فیڈرل اسمبلی کی 250 نشستوں میں سے نو نشستیں خواتین کے لئے مخصوص کر دی گئیں۔ رائے دہندوں کے حلقے میں توسیع مسلمان خواتین کے لئے اس لئے بہت اہم ثابت ہوئی کہ اس طرح مسلمانوں کی سیاست میں انہیں بھی اہمیت مل گئی۔

مسلم خواتین ووٹروں کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے ان کی سیاسی اہمیت بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ مسلم لیگی لیڈروں کو بھی ان کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ مسلم لیگ نے اب یہ شعوری کوشش کی کہ مسلمان عورتیں سیاست میں سرگرم عمل ہوں۔ انہوں نے عورتوں کے لئے جدوجہد کرنے والی خواتین کو مسلم لیگ کے حق میں اکٹھا کرنا چاہا۔ اس

کے لئے مسلم لیگ نے بھی عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد منظور کی کہ عورتوں کی رائے دہی کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کی جائیں۔ انہیں مساوی حقوق دیئے جائیں اور ان کی مناسب نمائندگی کی ضمانت دی جائے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زنانہ مسلم لیگ قائم کی گئیں انہوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سلسلے میں عورتوں نے زنانہ لیگ کی رکنیت سازی کی، مسلم خواتین ووٹروں کے ناموں کا اندراج کیا اور فنڈز اکٹھے کیے۔

اب مسلمان عورتوں کی تحریک ایک نئے موڑ پر آ پہنچی تھی۔ اب تک مسلمان عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور تھا اور مسلم خواتین ہندوستان کی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر عورتوں کے حقوق اور پرانے رسم و رواج کے خاتمے کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں۔ لیکن اب قیام پاکستان کے لئے تحریک نے زور پکڑا تو مسلمانوں کے مقاصد ہندوستان کی عام تحریک آزادی سے الگ ہوگئے۔ اس نے مسلمان عورتوں پر بھی اثر ڈالا۔ مسلم عورتوں کی تحریک کا رخ بھی اب مسلمانوں کے حقوق اور ان کے مفادات کے تحفظ کی طرف ہوگیا۔ 1938ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں مسلم خواتین سے اپیل کی گئی کہ وہ گھروں سے باہر نکلیں' جدید دور کے تقاضوں سے اپنے آپ کو روشناس کرائیں اور اپنی توانائیاں مسلمانوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے وقف کر دیں۔ عورتوں کے گھروں سے نکلنے والی بات پر اجلاس میں موجود بعض مرد حضرات نے ناک بھوں چڑھائی اور اس پر زبردست بحث شروع ہوگئی۔ قائد نے یہ جھگڑا یہ کہہ کر ختم کرایا کہ "جوش وجذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے صرف اس قرارداد پر توجہ دیجئے جس میں مسلمان عورتوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھا کرنے کی بات کی گئی ہے۔" جو قرارداد منظور کی گئی اس میں اس ضرورت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ عورتوں کو مسلمان قوم کی معاشرتی' اقتصادی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد میں شرکت کے لئے برابر کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ قرارداد میں زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان بھر میں عورتوں کی بیداری کے لئے بھرپور مہم چلائی جائے' تاکہ ان کے اندر زیادہ سے زیادہ سیاسی شعور پیدار ہوسکے۔ اس قرارداد سے عورتوں کی آزادی سے متعلق ان رہنماؤں کے خیالات کی عکاسی ہوتی

ہے جنھوں نے مسلمانوں کو آزادی سے ہم کنار کیا۔ چنانچہ مسلمان عورتوں نے محسوس کیا کہ ہندستان کے اندر مسلمانوں کی جو مملکت قائم ہونے والی ہے اس میں انہیں برابر کا سیاسی مقام حاصل ہوگا۔

عورتوں کی جدوجہد صرف سیاسی حقوق کے حصول تک محدود نہیں تھی۔ ہندوستان کی عورت بلاتمیز مذہب سماجی جبر کا شکار تھی۔ وقتاً" فوقتاً" بعض عورتوں نے صدیوں پرانے جبر کے اس جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کی کوشش کی بھی تھی، مگر بالائی اور امیر طبقے کی عورتوں نے تو کسی طرح اس جبر سے نجات حاصل کرلی تھی لیکن دیہات اور شہر کی غریب عورت ابھی تک اس چکی میں پس رہی تھی۔ یہ عورتیں رسم و رواج کے بندھنوں میں اتنی جکڑی ہوئی تھیں کہ بار بار کی کوششوں کے باوجود ان کی سماجی حیثیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوپائی اور اس تبدیلی کے لئے کی کوششوں کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

عورتوں پر ہونے والے جبر کا خاتمہ کرنے کی پہلی کوشش 1929ء میں کی گئی جب بچوں کی شادی روکنے کے لئے قانون منظور کیا گیا۔ یہ قانون جب پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو اس کی مخالفت صرف دقیانوسی مسلمانوں نے ہی نہیں کی بلکہ کٹر ہندوؤں نے بھی اس کی زبردست مخالفت کی۔ قائداعظمؒ نے کسی شرط کے بغیر اس بل کی حمایت کی حالانکہ دقیانوسی مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا اور اس کے لئے یہ دلیل دی کہ اس طرح مسلمانوں کی شریعت میں دخل اندازی کی جا رہی ہے۔ ادھر سماجی اصلاح کے لئے کام کرنے والی مسلم خواتین نے بھی اس کی پرزور حمایت کی۔

عورتوں کی جانب سے پرسنل لاز میں اصلاح کے لئے جو پہلی کوشش کی گئی وہ عورت کے پرسنل سٹیٹس میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ تھا۔ اس مطالبہ کی وجہ یہ تھی کہ مروجہ قوانین عورتوں کے لئے نہایت ظالمانہ تھے۔ ان عورتوں کا بیان تھا کہ اسلامی شریعت ان قوانین کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسندانہ ہے جو ہندو رسم و رواج کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک اس وقت چلائی گئی جب ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کے مفادات جدا ہوچکے تھے۔ ممکن ہے مسلمانوں کی اپنی

شناخت قائم کرنے کے لئے یہ مہم شروع کی گئی ہو۔

بہرحال مسلمان عورتوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اور 1937ء میں شریعت کا قانون منظور ہو گیا۔ اس قانون کے تحت مسلمانوں کے لئے کئی معاملات میں قانون شریعت کا اطلاق کیا جانے لگا۔ اس قانون کی رو سے ان قواعد و ضوابط کی تنسیخ ہو گئی جو محمڈن لا کے زمرہ میں نہیں آتے تھے۔ اس رواجی قانون کی جو پنجاب اور دوسرے علاقوں میں نافذ تھا اس لئے مخالفت کی گئی تھی کہ اس میں وہ حقوق بھی نہیں دیئے گئے تھے جو محمڈن لا میں موجود تھے۔ خاص طور سے اس قانون کا اطلاق زرعی اراضی کی وراثت پر نہیں ہوتا تھا۔ یہ چیز اس لئے زیادہ اہم تھی کہ اس زمرہ سے ملک کی بہت تھوڑی اراضی ہی مستثنیٰ ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے یہ کام اس لئے کیا گیا تھا کہ بڑی بڑی جاگیروں کی تقسیم نہ ہونے پائے اور موجودہ جاگیرداری نظام برقرار رکھا جائے۔ بہرحال نئے قانون کی سب مسلمانوں کی طرف سے حمایت کی گئی۔ رسم و رواج کا خاتمہ کرنے اور حقوق و فرائض میں توازن پیدا کرنے میں نیا قانون کس حد تک کامیاب ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سماجی انصاف کی ضمانت دینے کے لئے ایک اور دستوری قانون نافذ کیا گیا۔

اس قانون میں شادی بیاہ اور طلاق کو بھی شامل کیا گیا تھا اس کے باوجود مسلمان عورتوں کو طلاق حاصل کرنے میں ہمیشہ دشواری پیش آتی رہی کیونکہ عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ عورت خلع نہیں لے سکتی اور طلاق کا حق صرف شوہر کا ہے۔ وہی طلاق دے سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناپسندیدہ شادی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کئی مسلمان عورتوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس پر یہ مطالبہ نے زور پکڑا کہ مسلم میرج ایکٹ 1939ء منسوخ کیا جائے۔ اس قانون میں یہ درج نہیں تھا کہ اس کی شقیں مسلم قانون کے تابع ہوں گی۔ یہ قانون بذات خود مکمل تھا اور اسلامی شریعت کے بعض حصوں کی وضاحت کرتا تھا جنہیں نفاذ سے پہلے قانونی حیثیت حاصل نہیں تھی۔

اس قانون پر اعتراض صرف یہ تھا کہ اس کو دستوری شکل نہیں دی گئی تھی۔ مسلم پرسنل لا یا اسلامی شریعت میں کبھی یکسانیت نہیں رہی۔ ہر فرقہ اپنے فقہ کے حساب سے اس کی تشریح کرتا تھا۔ اس میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوئی کوشش کامیاب بھی نہیں

ہو سکتی تھی کیونکہ اسے تمام فرقے تسلیم نہ کرتے۔ عام اعتراض یہ ہوتا تھا کہ اس میں دوسرے فرقے کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے اس لئے وہ اسلامی شریعت کے منافی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ زمانہ 1935ء کے انڈیپنڈنٹ ایکٹ 1935ء کے نفاذ کے بعد کا تھا۔ اس وقت تک سیلف گورنمنٹ کا مقصد کافی حد تک حاصل کیا جا چکا تھا۔ متذکرہ بل پر جن لوگوں نے بحث میں حصہ لیا وہ ہندوستانی عوام کے نمائندہ تھے۔ ان میں وہ مسلم ارکان بھی شامل تھے جنہیں جداگانہ طرز انتخاب کی بنیاد پر منتخب کیا گیا تھا۔ گویا اس معاملے پر وہ عام لوگ غور کر رہے تھے جنہیں مسلم علماء اور ہندو پنڈت اس کا اختیار دینے کو تیار نہیں تھے کیونکہ یہ معاملات ہمیشہ سے ان کی اجارہ داری میں رہے تھے۔ مسلمانوں کے لئے یہ معاملہ اور بھی نازک تھا کیونکہ ان کے ہاں ان معاملات میں رواجی قوانین کے بجائے مذہبی اصول ہی تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہندوستان میں چونکہ مسلمان اقلیت میں تھے اس لئے وہ اپنی شناخت اسلام کے حوالے سے ہی کرتے تھے اور علماء مذہب کی تشریح و تفسیر کے اجارہ دار مانے جاتے تھے۔ تاہم شریعت ایکٹ 1937ء واحد قانون تھا جس کی ان علماء کی طرف سے بالکل مخالفت نہیں کی گئی۔ علماء کا خیال تھا کہ اس قانون کے نفاذ کے بعد بھی شریعت کی تشریح کا کام ان کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ لیکن ان کی توقعات کے برعکس انگریزی تعلیم یافتہ وکلاء اور ججوں نے ان کے ہاتھ سے یہ ذمہ داری بھی چھین لی۔ اس پر مولویوں کے حلقے میں خاص لے دے ہوئی۔

اس زمانے میں اسلام کے روشن خیال فلسفہ کے علمبردار مسلمانوں نے علماء کے اندر عدم تحفظ کا احساس اور بھی پیدا کر دیا۔ علامہ محمد اقبال کی قیادت میں مسلم مفکروں نے مولویوں کے خیالات پر یہ کہہ کر حملہ کیا کہ وہ ابھی تک پرانے افکار کی تقلید پر ہی زور دیتے ہیں اور مقلدانہ خیالات و افکار موجودہ زمانہ کے حقائق سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ ان کا بیان تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب یہی تقلید ہے۔ انہوں نے کہا کہ معاشرہ میں انقلابی روح پھونکنے کے لئے ضروری ہے کہ اجماع کے ذریعہ اجتہاد کیا جائے۔ اقبال نے لکھا۔ "مختلف مکتب ہائے فکر کے نمائندوں کے ہاتھ سے اجتہاد کی انفرادی ذمہ داری لے کر قانون ساز اسمبلی کے حوالے کر دی جائے۔ آج کے زمانے میں

اجماع کا یہی ایک ذریعہ ہے۔" انہوں نے اس بات کو "خطرناک" قرار دیا ہے کہ علماء کو قانون سازی کا اختیار دے دیا جائے۔" مولویوں کے لئے تو یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ انہوں نے اسے اپنے دائرہ اختیار میں دخل اندازی سمجھا اور اجتہاد کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا۔

بہرحال 1929ء اور 1939ء کے قوانین کے خلاف مولویوں اور مذہبی گروہوں کی مخالفت کامیاب نہیں ہوسکی اور وہ قوانین بالآخر منظور ہوگئے اور اب تک نافذ العمل ہیں۔ یہاں ان ارکان اسمبلی کے خیالات پیش کرنا بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے ان قوانین کی حمایت کی تھی۔ اس سے یہ بھی انداز ہوجائے گا کہ مسلمانوں میں کس گروہ کو زیادہ حمایت حاصل تھی۔

محمد علی جناح برصغیر میں مسلمانوں کی قومی تحریک کے مسلمہ اور متفقہ قائد مانے جاچکے تھے۔ پاکستان کے بانی اور بابائے پاکستان بھی وہی ہیں۔ بچوں کی شادی کی روک تھام کے بل پر انہوں نے اسمبلی میں جو تقریر کی تھی وہ عورتوں کے حقوق اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے ان کے خیالات کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے ایک نہایت اہم نکتہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا۔

"بمبئی میں (وکیل کی حیثیت سے) تیس سال کی پریکٹس کے دوران میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ شادی کا بذات خود مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شادی اسلامی قانون کے تحت ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے۔"

انہوں نے کہا۔

"——اس ملک میں رائے عامہ پوری طرح باشعور نہیں ہے۔ اگر ہم اس رائے عامہ سے متاثر ہونے لگے جو مذہب کے نام پر پیدا کی جاسکتی ہے تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہمارے اندر اتنی ہمت ہونا چاہئے کہ "نا" کہہ سکیں۔ ہم اس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔"

اس وقت قائداعظم کا تاثر یہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت اس بل کے

خلاف ہے۔ اس تاثر کے باوجود انہوں نے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے لئے یہ استدلال پیش کیا۔

”بعض رسم و رواج ایسے ہوتے ہیں جن کی مذہبی حیثیت اور مذہبی جواز موجود ہو یا نہ ہو امتداد زمانہ سے وہ پختہ ہوجاتے ہیں اور جب ان رسوم و رواج کو ختم کرنے کے لئے کوئی اصلاحی قدم اٹھایا جاتا ہے تو دنیا جانتی ہے کہ وہ لوگ جو ان رسوم کو نیم مذہبی حیثیت دیتے ہیں اس اقدام پر ناراض ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی سماجی زندگی اور ان کے مذہب کی بنیاد پر حملہ کیا جا رہا ہے۔ سماجی مصلح کو اس دقیانوسی فکر کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے پیچھے عقیدہ اور جذبات و احساسات کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ جذبات کسی حد تک قابل فہم اور جائز بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں اور جن کا ہم احترام کرتے ہیں کیا ان کے ساتھ ہم بھی جذبات کی رو میں بہہ جائیں؟ ——— میرا آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا انسانیت کے نام پر ہم تحت الثریٰ چلے جائیں اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں۔“

قائداعظم کو اسبات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ انگریز جو اب تک مذہب اور رسم و رواج کے معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے' اب اصلاح پر رضامند ہوگئے ہیں تو اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ متذکرہ بحث کے دوران جناح نے اپنے رفقاء سے اپیل کی کہ وہ اس تبدیلی کا خیرمقدم کریں اور ایسے تنازعات نہ کھڑے کریں جس سے انگریز حکومت خوفزدہ ہو کر ان اصلاحات سے دست بردار ہوجائے۔

مسلمان خواتین نے تعلیمی ترقی اور سماجی و سیاسی حقوق کی بحالی کے لئے جو تحریکیں چلائیں ان کا اثر برصغیر کی عام زندگی پر بھی پڑا۔ اس نے پورے معاشرے کو متاثر کیا۔ یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ برصغیر کے معاشرہ میں اس دور میں جو تبدیلی آئی وہ سب کے سامنے ہے لیکن بہت کم لوگ یہ مانتے ہیں کہ اس سماجی

تبدیلی میں عورتوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بہرحال عورتوں نے اپنے اندر بہت بڑی تبدیلی پیدا کی۔ انہوں نے ترقی اور اصلاحات کا راستہ کھول دیا۔ اور اگر پاکستان بننے کے بعد حالات سازگار رہتے اور ترقی معکوس نہ شروع ہو گئی ہوتی تو مسلمان عورت اپنے خواب کی تعبیر حاصل کر چکی ہوتی۔

معاشی عمل اور خواتین

خاور ممتاز / فریدہ شہید

پاکستان میں سرگرم عمل مزدوروں میں عورتوں کی تعداد یا ان کی شرکت کس قدر ہے اس کا اندازہ کرنے میں ہرچند مشکلات حائل ہیں۔ ساتویں دہائی کے وسط سے اس ضمن میں جو جائزے لئے گئے یا جزئیاتی مطالعے کئے گئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان سرکاری اعداد و شمار میں عورتوں کا کام' خود عورتوں کی طرف سے لئے گئے جائزوں کے مقابلے میں بہت کم نظر آتا ہے۔ قومی سطح کے کوائف میں ان کی نیچی سطح دکھائے جانے کے ممکن اسباب کی نشاندہی بھی بعض مطالعاتی رپورٹوں میں کی گئی ہے۔ جو صورت حال بر سرزمین نظر آتی ہے اس کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے نتائج کی تصدیق ہوتی ہے تاہم آٹھویں دہائی کے آخر میں جاکر پالیسی سازوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ لیبر فورس میں عورتوں کے حصے کے بارے میں اعداد و شمار کے جو ذرائع ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبہ اور 1989ء کے نیشنل مین پاور کمیشن دونوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اس شعبہ میں اعداد و شمار بہتر اور صحیح طور پر اکٹھے کئے جانے چاہئیں۔ چنانچہ عورتوں کے معاشی شعبہ میں حصے سے متعلق صحیح اعداد و شمار کی فراہمی کے لئے 1991ء کی مردم شماری میں نئی صورتیں رکھی گئی تھیں۔ ایک تو کوائف کی فراہمی کے طریقوں وغیرہ میں تبدیلی کی گئی ہے۔ دوسرے عورتوں مردوں کے بارے میں معلومات کو الگ الگ کر دیا گیا۔ بہرطور اس وقت تک جو اہم سروے کئے جا چکے ہیں ان پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑا' اس لئے عورتوں کی شرکت یا حصے کا اندازہ قومی سطح کے متذکرہ خامیوں والے اعداد و شمار کا چھوٹی سطح اور محدود مگر گہرائی میں کئے گئے مطالعوں کے تقابل سے لگایا جا رہا ہے۔

عورتوں کے معاشی شعبے میں باشرکت کے بارے میں بڑے قومی ذرائع مختصراً یہ ہیں' دس سالہ پاپولیشن سینسز اینڈ ہاؤس ہولڈ اکنامکس اینڈ ڈیموگرافک (ایچ ای ڈی) یعنی مردم' خانہ اور کار شماری اور سالانہ لیبر فورس سروے (ایل ایف ایس)۔ دیہی علاقوں کے

لئے اہم ذریعہ دس سالہ زرعی سروے ـــــ خاص مقاصد کے لئے کئے گئے چند چھوٹے سروے مثلاً نیشنل امپیکٹ سروے (این آئی ایس) پاکستان فرٹیلیٹی سروے (پی ایف ایس) ڈیموگرافک سروے آف پاکستان (ڈی ایس پی) سے بھی کچھ اعداد و شمار مل جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہر ایک جائزے کی بنیاد مختلف ہے' اس لئے ان میں جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں ان کا آپس میں مقابلہ کرنا بھی مشکل ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ خاص مقاصد کے لئے کئے گئے سرویز' عورتوں کی شرکت کی شرح' سالانہ لیبر فورس سروے کے مقابلے مسلسل زیادہ بتا رہے ہیں۔ مثلاً 69-1968ء کے نیشنل امپیکٹ سروے میں بتایا گیا کہ 15 سے 49 سال تک کی خواتین کی شہروں میں شرح شرکت 9 اور دیہات میں بائیس اعشاریہ تین (22.3) فیصد ہے۔ اسی زمانے کے لیبر فورس سروے میں معاشی شعبہ میں عورتوں کی شرکت کی کل شرح چھ اعشاریہ چھ (6.6) فیصد دی گئی ہے۔ اسی طرح 1975ء کے پاکستان فرٹیلیٹی سروے میں شہری عورتوں کی شرح پندرہ اعشاریہ چھ (15.6) اور دیہی عورتوں کی اٹھارہ اعشاریہ ایک (18.1) فیصد ہے۔ 1984/85ء کے پاکستان کنٹراسیپٹو پریویلینس سروے میں شہری عورتوں کی شرح سات اعشاریہ نو (7.9) اور دیہی کی چوبیس اعشاریہ چھ (24.6) ہے اسی زمانے کے لیبر فورس سروے 75-1974ء اور 85-1984ء کی علی الترتیب مجموعی شرح چھ (6) اور آٹھ اعشاریہ سات (8.7) فیصد ہے۔ مردم شماری کا معاملہ اور بھی مایوس کن ہے جس کے مطابق معاشی شعبے میں خواتین کا حصہ یا شرکت 1981ء میں تین اعشاریہ دو (3.2) فیصد بتایا گیا ہے اور 1984ء کے بارے میں تخمینہ تین اعشاریہ تین (3.3) فیصد لگایا گیا ہے۔

متذکرہ بالا بڑے ذرائع میں سے مردم شماری کا ذریعہ تو اس مسئلہ کی گہرائی اور گیرائی ماپنے میں سب سے پیچھے ہے اس میں خواتین کی شرکت کی شرح انتہائی کم ریکارڈ کی گئی ہے۔ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق دیہی اور شہری عورتوں کی شرکت کی شرح صرف تین اعشاریہ دو (3.2) فیصد نکالی گئی ہے جو کل لیبر فورس کا صرف سات فیصد ہے اس میں بہتر (72) فیصد آبادی کو بے روزگار بتایا گیا ہے جس میں ترتالیس (43) فیصد بچے اور چالیس اعشاریہ تین (40.3) فیصد عورتیں ہیں جنہیں "خانہ داری" کے خانے میں ڈالا گیا ہے۔

1961ء اور 1981ء کی خانہ شماری اور 1973ء کی مردم شماری میں کارکن خواتین کی کل تعداد میں بتدریج کمی دکھائی گئی ہے۔ 1961ء میں بتایا گیا تھا کہ اہم شعبوں (زراعت، کان کنی، مینوفیکچرنگ، تعمیرات، تجارت، ٹرانسپورٹ، فنانس اور ملازمتوں) میں عورتوں کی کل تعداد گیارہ لاکھ سترہ ہزار ہے جبکہ 1973ء کی خانہ شماری میں ان کی تعداد آٹھ لاکھ تہتر ہزار اور 1981ء کی مردم شماری میں یہ تعداد سات لاکھ تریسٹھ ہزار رہ گئی ہے۔ اس مقابلے سے ثابت ہوا کہ گذشتہ بیس برس میں خاتون کارکنوں کی تعداد میں بتیس فیصد کمی ہوئی ہے۔ یہ کمی زیادہ تر دیہی شعبہ میں دکھائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دیہی زرعی کارکن عورتوں کی تعداد میں باسٹھ فیصد کمی ہوئی ہے۔ اس تقریباً دو تہائی ناقابل یقین کمی کی تصدیق دوسرے ذرائع سے ہرگز نہیں ہوتی۔ 1981ء کی مردم شماری میں عورتوں کی شرح شرکت عورتوں کی کل آبادی کا صرف تین فیصد بتائی گئی ہے۔ جبکہ 1980ء کی زراعت شماری کی رپورٹ میں خواتین کی کل آبادی کے تہتر (73) فیصد کو کارکن بتایا گیا ہے جو زرعی عمل میں حصہ ڈالتی ہیں۔ کیا زمین آسمان کے اس فرق کو کسی قلابے سے ملایا جاسکتا ہے؟

یہ فرق صرف دیہی علاقوں تک ہی محدود نہیں، شہری عورتوں کے بارے میں بھی اسی قسم کے نمایاں فرق نظر آتے ہیں اور عورتوں کی شرکت کی مجموعی شرح میں بھی۔ 1974.75ء کے لیبرفورس سروے میں شہری خواتین کی شرح شرکت تین اعشاریہ چھ فیصد (3.6) دکھائی گئی ہے جبکہ پاکستان فرٹیلیٹی سروے (1975ء) میں یہ شرح پندرہ اعشاریہ چھ (15.6) فیصد بتائی گئی ہے۔

اعداد و شمار کے ان بڑے ذرائع کا نہ صرف آپس میں بڑا تفاوت ہے بلکہ ایک ہی ذریعہ نے مختلف سالوں میں جو اعداد و شمار دیئے ہیں ان میں بھی بے شمار تضادات ہیں۔ 1972ء اور 1981ء کے درمیان مردم شماری کے مطابق خاتون کارکنوں کی تعداد میں ساٹھ فیصد کمی آئی۔ (مجموعی طور پر شرح نو فیصد سے گر کر تین اعشاریہ تین (3.3) رہ گئی) جبکہ اسی مدت میں لیبرفورس سروے میں اوپر نیچے ہونے والے اعداد و شمار دیئے گئے ہیں۔ 72-1971ء میں یہ شرح آٹھ فیصد اور 83-1982ء میں دس اعشاریہ سات (10.7) تھی، مزید یہ کہ لیبرفورس سروے میں عورتوں کی شرکت کو طویل المعیاد بنیاد پر فروغ پاتے

دکھایا ہے مگر اعداد و شمار میں اتار چڑھاؤ بہت ہیں اور پھر 69-1968ء اور پھر 85-1984ء میں دکھائی گئی کمی بے جواز نظر آتی ہے (69-1968ء میں یہ شرح چھ فیصد تک ہے اور 87-1986ء میں بارہ فیصد تک بلند دکھائی گئی۔)

قومی سطح کے ذرائع کا جب کیس سٹڈیز کے نتائج سے مقابلہ کیا جائے تو اس سے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اعداد و شمار کے بڑے ذرائع میں معاشی یا پیداواری لیبر فورس میں شہری اور دیہی عورتوں کی شرح بہت ہی کم دکھائی گئی یا کم شمار کی گئی ہے۔

معاشی عمل میں عورتوں کی شراکت کے نظرانداز کئے جانے کی بہت سی وجوہ ہیں۔ جن میں بعض اہم یہ ہیں۔ سوال کنندہ اور جواب دہندہ کی صفت (تذکیر و تانیث) سوالنامے کی نوعیت اور ترتیب : سروے کے لئے مقررہ کردہ وقت : معاشی طور پر پیداواری سرگرمیوں کی تعریف یا نشاندہی:

شمار کرنے والے یعنی سوال کنندگان اکثر مرد ہوتے ہیں اور جن سے جوابات مانگے جاتے ہیں وہ بھی مرد ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جو سروے عورتوں نے کئے ہیں ان میں عورتوں کی شرح شرکت بہت زیادہ ہے۔ (سترہ اعشاریہ دو (17.2) اور اٹھارہ اعشاریہ سات (18.7) فیصد یہ تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ شرح کے اس تناسب کی ایک وجہ یہ ہے کہ سوال کرنے والی بھی اور جواب دینے والی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔

پاکستان میں عورتوں کے کاموں کے بارے میں اصل حقیقت سامنے نہ آسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں گھروار عورتیں اگر معاوضے کی خاطر کوئی دوسرا کام کر رہی ہیں تو اس کا اظہار گھرانے کے لئے بے غیرتی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے چھپایا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں اور ان کے کام کو بھی ـــــ چنانچہ مرد اکثر سرعام یہ نہیں بتاتے کہ ان کی عورتیں کھیتوں میں یا گھروں میں رہ کر (معاوضے کیلئے) کام کرتی ہیں چنانچہ مردوں کے ذریعے مردوں سے عورتوں کی معاشی شعبہ میں شرکت کے بارے میں تفصیل حاصل کرنا لاحاصلی کے برابر ہے۔ کام کرنے کے بارے میں اعلان میں جو شرمندگی محسوس کی جاتی ہے یقیناً عورتیں بھی اسے اپنی بدنامی سمجھتی ہیں اس لئے مسئلہ صرف اس بات سے حل نہیں ہوگا کہ عورتیں ہی عورتوں کے بارے میں تفصیلات حاصل کریں۔ تاہم اس طرح قدم صحیح سمت میں اٹھنے لگے گا اور کم از کم ابتدائی رکاوٹوں میں سے ایک

رکاوٹ دور ہو جائے گی۔

لیبر فورس سروے اور مردم شماری میں معاشی لحاظ سے سرگرم آبادی (دس یا بارہ سال سے زیادہ عمر کے افراد وہ ہیں جو تنخواہ یا نفع، نقد) یا جنس کی صورت میں وصول کرنے کے لئے کام کرتے ہیں ان میں بے ہنر معاون خانہ یعنی نوکر بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی وضاحت ہوتی ہے کہ سویلین لیبر فورس کے خانے میں جن افراد کو شامل کیا گیا ہے ان میں وہ شامل نہیں جو خانہ داری کا کام کرتے ہیں۔

"پاکستان کے حوالے سے خانہ داری سے مراد وہ گھریلو خواتین ہیں جو مقررہ مدت کے دوران زیادہ وقت خانہ داری کا کام کرتی ہیں۔" (بیسک مین پاور سٹیٹسٹکس 1984ء viii) اس تعریف کی روشنی میں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ مردم شماری میں جن چالیس فیصد بے روزگاروں کا خانہ بنایا گیا ہے وہ دراصل انہیں خانہ دار خواتین پر مشتمل ہے۔ (مزید ترتالیس فیصد بے روزگار بچے شمار ہوتے ہیں۔)

دوسری طرف خالصتاً زنانہ سروے (این آئی ایس اور پی ایف ایس) کے مطابق خواتین سے پوچھا گیا "کیا آپ نے گھرداری کے علاوہ کبھی کوئی اور کام بھی کیا ہے؟" پھر ان کو سمجھانے کے لئے مزید کہا گیا۔ "آپ جانتی ہیں کہ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں —— میرا مطلب ہے گھرداری کے کام کے علاوہ بھی کام کرتی ہیں کچھ ایسے کام کرتی ہیں جن کے بدلے پیسے یا جنس ملتی ہے۔ کچھ عورتیں چیزیں فروخت کرتی ہیں مطلب ہے چھوٹا موٹا کاروبار کرتی ہیں تو کیا آپ اس وقت اس قسم کا کوئی کام کر رہی ہیں" —— عورتوں کے بارے میں مخصوص زنانہ سروے اور مردم شماری میں فرق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں اتنے تضاد یا فرق کی ایک وجہ استفسار یا سوال کی عبارت کی نوعیت بھی ہے جس سے نتائج پر بہت اثر پڑتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ "معاشی اعتبار سے پیداواری سرگرمیوں" کی تعریف بھی اس طور کی جانی چاہئے کہ اس کے احاطے میں عورتوں خصوصاً دیہی علاقوں کی عورتوں کی سرگرمیاں بھی آجائیں۔ عورتیں ایسے کام بھی کرتی ہیں جو پیداواری عمل کا لازمی حصہ ہیں، مگر انہیں بڑی سادگی سے صرف زنانہ کام کہہ دیا جاتا ہے یا مرد کی مدد کرنے کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مثلاً مرد کے لئے کھانا تیار کرنا، پہنچانا اور مویشیوں کو چارہ

ڈالنا' زرعی پیداواری عمل کا حصہ ہے مگر اس کام کو "معاشی اعتبار سے پیداواری سرگرمیوں" میں سے نکال دیا گیا ہے۔ جہاں دو فصلی سلسلہ ہوتا ہے وہاں عورتیں زائد فصل (زیادہ تر سبزیوں وغیرہ) کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہیں لیکن شمار کرتے وقت یہ قصہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ صرف زرعی پیداوار تک ہی محدود نہیں۔ دستکاریوں میں "آس پاس" کا سارا کام عورتیں کرتی ہیں ان کاموں کے بغیر اصل کام ہو ہی نہیں سکتا مگر ان کاموں کو بھی اصل کام میں شمار ہی نہیں کیا جاتا۔ کپڑا بننے کی مثال لیں عورتیں لومیں نہیں چلاتیں مگر عموماً دھاگہ بناتی ہیں' کپڑا یا دھاگہ رنگتی اور صاف کرتی ہیں۔ چھوٹی دستی لوموں پر وہ کپڑا بھی بن لیتی ہیں مگر یہ کام گھریلو عورتوں کے معاشی پیداواری کاموں میں شاید ہی شمار کیے جاتے ہیں۔

پاکستان میں آئندہ خواتین کی معاشی سرگرمیوں کے بارے میں صحیح کوائف فراہم کرنے کے لئے ان تمام مسائل کو حل کرنا ہوگا' تاہم اس وقت موجود اعداد و شمار کے حوالے سے عورتوں کی شرکت کی شرح کا تعین کرنا مشکل ہے۔

موجودہ رپورٹ ایک طرف قومی سطح کے غیر معیاری کوائف اور دوسری طرف عورتوں سے متعلق محدود سطح کے سروے کے ذریعے ملنے والی اطلاعات میں دب کر تیار کی جا رہی ہے۔ ذیل میں جو اطلاعات دی جا رہی ہیں وہ ان دونوں ذرائع سے کشید کی گئی ہیں اور تمام امور سے متعلق سرکاری اعداد و شمار بھی دیئے گئے ہیں۔

کوائف میں فرق:

کوائف فراہم کرنے میں عام مشکلات کے علاوہ یہ مشکل بھی ہے کہ تذکیر و تانیث کے حوالے سے جدا جدا کوائف نہیں ملتے' گھروں میں عورتوں کی معاشی مشکلات' گھر کی آمدنی کی تقسیم' تقسیم کار یا تقسیم محنت وغیرہ سے متعلق اعداد و شمار موجود نہیں۔ اور تو اور اکثر معمولی سی اطلاعات بھی نہیں ملتیں۔ مثلاً صوبے کی سطح پر بڑی صنعتوں کے ذیلی شعبوں میں کام کرنی والی خاتون کارکنوں' اور دوسرے شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد اور عمر بھی نہیں ملتی۔ صوبے کی سطح پر صنعتی اور دوسرے پیشوں سے متعلق عورتوں کے الگ الگ اعداد و شمار بھی صرف مردم شماری میں ملتے ہیں اور مردم شماری کے نقائص کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ لڑکیاں اور بچیاں جو معاشی کام کرتی ہیں ان کے بارے میں معلومات

کا حصول اور بھی پیچیدہ اور مشکل ہے۔ عمر اور صنف کے لحاظ سے مردوں اور عورتوں کے الگ الگ اعداد و شمار معاشی عمل میں عام لیبر فورس کے حصے تک محدود ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی اعداد و شمار میسر نہیں ہیں۔

عمر' آمدنی' پیشے اور معیار یا سطح کے حساب سے عورتوں کے حصے کا تعین اعداد و شمار کی خامیوں کے باعث بہت مشکل ہے۔ اسی طرح یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ عورتوں کے مختلف طبقے معاشی سرگرمیوں میں کس حد تک شامل ہیں اور ان میں باہمی فرق کیوں ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں۔ اسی طرح عورت کے لیبر مارکیٹ میں داخل ہونے کی راہ میں رکاوٹیں اور مارکیٹ میں جانے کی وجوہات کا تعین بھی مشکل ہوتا ہے۔

صوبائی کوائف:

قومی سطح کے ذرائع' اعداد و شمار کی صوبائی سطح پر جمع تفریق کم ہی پیش کرتے ہیں اس لئے صوبائی اعتبار سے متوازن کوائف کی فراہمی ایک اور حل طلب مشکل ہے۔ استثنا صرف مردم شماری والے کوائف کا ہے مگر انہیں استعمال کرنے کی راہ میں سخت رکاوٹیں ہیں۔ مثلاً مختلف علاقوں کی اپنی معاشرتی اور ثقافتی حدود و قیود ہیں اور یہ وہاں کی عورتوں کے معاشی سرگرمی میں حصہ لینے یا نہ لینے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

چھوٹے یا مخصوص قسم کے جائزوں میں اور بھی مشکلیں ہیں۔ صوبے میں گہرے جائزوں کے لئے کام بھی غیر متوازن طریق سے تفویض کیا گیا۔ زیادہ تر کیس سٹڈیز پنجاب میں کی گئیں اس کے بعد حال ہی میں سندھ کا نمبر آتا ہے۔ صوبہ سرحد میں عورت کے معاشی عمل میں حصہ کے بارے میں ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس ضمن میں صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے اب کچھ کام شروع ہوا ہے۔ خصوصاً یونیسف نے ہر صوبے کے اعداد و شمار کی فراہمی کے لئے کام سونپ دیا ہے۔ مگر ابھی تک ان میں سے تین رپورٹیں حاصل ہوئی ہیں۔ پنجاب' سندھ اور بلوچستان کی۔ موجود اعداد و شمار' صوبوں کے آپس میں تقابل اور تسلسل کے کام کو مشکل بناتے ہیں۔ چنانچہ صوبائی سطح کی اطلاعات زیادہ تر چھوٹے جائزوں اور مطالعوں کی بنیاد پر دی جا رہی ہیں۔

وہ شعبہ جسے مشکل کاموں کا جزوی شعبہ کہا جا سکتا ہے' اعداد و شمار کے تکلفات سے الگ رکھا گیا ہے لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی معاشی سرگرمیاں زیادہ تر اسی

شعبہ میں ہوتی ہیں۔ عالمی بینک کا اندازہ ہے کہ اس شعبہ کے شہری حصہ میں بیس لاکھ کے قریب عورتیں کام کرتی ہیں۔ بڑی صنعتوں میں کارکنوں کی کم گنجائش کی بنا پر اس شعبہ کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ زیادہ تر عورتیں گھروں میں بیٹھ کر فی نگ کے (پیس کریٹ) حساب سے جزوقتی کام کرتی ہیں۔ عالمی بینک کا ہی تخمینہ ہے کہ اس شعبہ کی پندرہ لاکھ عورتوں میں سے ستر فیصد وہ ہیں جو گھروں میں رہ کر جز وقتی کام کرتی ہیں۔ باقی کی عورتیں جو اکثر غیر ہنر مند ہوتی ہیں گھروں سے باہر نکل کر مینوفیکچرنگ' کنسٹرکشن اور سروسز میں کام کرتی ہیں۔ ان خواتین کو چونکہ کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان کا بہت استحصال ہوتا ہے۔

پیس ریٹ کے حساب سے عورتیں اس لئے کام قبول کر لیتی ہیں کیونکہ ان کے لئے روزگار کے متبادل مواقع نہیں ہیں اس کے علاوہ گھروں سے باہر جا کر کام کرنے سے بدنامی ہوتی ہے اور وہ نہیں چاہتیں کہ اس طرح ان کو اور ان کے خاوندوں کو جو روٹی کماتے ہیں' خفت اٹھانی پڑے۔ دکاندار یا دلال ان کام کرنے والی عورتوں کو خام مال فراہم کرتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق انہیں معاوضہ دیتا ہے۔ ان کی آمدنی بہت ہی حقیر ہوتی ہے مگر چونکہ متبادل روزگار موجود نہیں ہے اس لئے انہیں طوہا" وکرہا" یہ کام کرنا پڑتا ہے تاہم ان عورتوں کو اس طرح ایک سہولت ضرور میسر ہے کہ یہاں وقت کی پابندی کم ہے اور ان کاموں کے ساتھ ساتھ گھر کا کام کاج بھی نسبتاً آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ شعبہ ان عورتوں کو بھی آمدنی کا ایک وسیلہ فراہم کرتا ہے جو رسم و رواج کی بنا پر گھروں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔

صورت حال

ان حالات میں معاشی شعبہ میں عورتوں کی شرکت کے بارے میں ٹھیک کوائف پیش کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ چنانچہ مخصوص قسم کی اطلاعات فراہم کرنے کے سلسلے میں اس رپورٹ میں متعدد متبادل طریقے آزمائے گئے ہیں اس رپورٹ میں ان ذرائع کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے جن میں عورتوں کی شرکت کی شرح زیادہ دکھائی گئی ہے کیونکہ تفتیش کرنے والوں کا تجربہ ان ذرائع کی صحت کی تصدیق کرتا ہے۔ اس رپورٹ میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ موجود اعدادوشمار کی مدد سے عورتوں کے معاشی شعبہ میں حصہ

کے متعلق زیادہ سے زیادہ قابل اعتبار اعداد و شمار کی ایک بنیاد فراہم ہو جائے چنانچہ قومی سطح کے اور چھوٹی محدود سطح کے جائزوں کو اس رپورٹ میں سمو لیا گیا ہے ان میں اس شعبہ کی تفصیلی معلومات بھی ہیں اور تازہ تر اعداد و شمار بھی—معاشی شعبہ میں عورتوں کی کارکردگی اگرچہ بڑی اہم اور مختلف النوع ہے مگر اس کی موجودگی کی طرف کم ہی دھیان دیا گیا ہے چنانچہ ان کے بارے میں موجودہ ذرائع اطلاعات سے اس کی تصویر کشی کا واحد طریقہ یہی تھا جو اس رپورٹ میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس رپورٹ میں ذرائع معلومات کے فرق اور اختلافات اور صرف نظری کو اس لئے نمایاں کیا گیا ہے کہ مستقبل میں اس ضمن میں کام کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں اور زیادہ صحیح کام ہو۔

نسوانیات اور نفسیات

حمیرہ ہاشمی

پاکستان کی تاریخ میں اسّی (80) کی دہائی ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے یہی وہ وقت تھا جب اس ملک کی خواتین کو قانون کی نظر میں غیر مساوی قرار دے دیا گیا۔ حدود آرڈی نینس کو عورتوں کے خلاف جنس کی بنیاد پر امتیازی تفریق کرنے کے ایک ذریعے کے طور پر نافذ کیا گیا۔ تاہم اس قسم کی تفریق صدیوں سے انسانی تاریخ کا حصہ رہی ہے اور اس کی جڑیں انسان کے معاشرتی و معاشی حالات میں پائی جاتی ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ یوں ہوا کہ ذاتی ملکیت کے جنم لینے کے ساتھ ہی عورت نے اپنے باپ یا شوہر' یعنی کسی مرد پر انحصار کرنے لگ گئی۔ جس بنا پر عورتوں کو ان کے معاشی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا' انہیں روحانی اور ذہنی طور پر غلام بنا لیا گیا' اور ان کے فرائض منصبی کو محض گھریلو کام کاج تک محدود کر دیا گیا۔ بہرحال سرمایہ داری نظام کے آغاز کے ساتھ خواتین کے کردار کی تنگ حدود بھی کشادہ ہو گئیں کیونکہ انہیں منافع کمانے کے ایک اضافی ذریعے کے طور پر پیداوار کے عمل میں شامل کر لیا گیا۔ اگرچہ سرمایہ داری نظام بھی جنس کی بنیاد پر امتیازی تفریق کے حالات پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ نظام خواتین کی آزادی کی جدوجہد کے تخلیق کرنے میں ممدومعاون بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اس مثال پر غور کیجئے کہ اس نظام میں حالانکہ مساوی کام کے لئے مساوی معاوضے کا دعویٰ کیا جاتا ہے' مگر پھر بھی تمام تر سرمایہ دار دنیا میں عورتوں نے ایک جتنے اور ایک ہی نوعیت کے کام کے لئے مردوں کی نسبت 20 سے 50 فیصد کم معاوضہ وصول کیا۔ (Geintse, 1984ء) ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کام کرنے والی تمام تر زنانہ افرادی قوت کا دو تہائی حصہ گھریلو' کلرکانہ' یا بطور سیلز ورکر کام کرتا ہے۔ ابھی پچھلے کچھ عرصے تک کالج سے گریجویٹ کرنے والی امریکی عورت' ایک امریکی مرد کالج گریجویٹ کی

کمائی کے مقابلے میں محض ایک تہائی کماتی تھی۔ (U.S.Census) ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں کام کرنے والی عورتوں میں سے 76 فیصد "غیر مستقل" کارکن ہیں اور ان کو "مستقل" کارکنوں کو ملنے والے فوائد حاصل نہیں۔ ان فوائد میں سے چند ایک یہ ہیں: بہتر یا زیادہ ابتدائی تنخواہ یا معاوضہ' چھٹی کا بونس' پوری تنخواہ کے ساتھ چھٹی' میڈیکل یا بیماری کی چھٹی' یونین سازی کا حق وغیرہ (Mumtaz, 1990ء) اس معاشی تفریق کے علاوہ عورتوں کو سیاسی تفریق کا بھی نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اور ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے عورتوں کو اس سلسلے میں کچھ کامیابی ہوئی ہے۔ بالخصوص سیاسی الیکشن میں ووٹ کے حق کے معاملے میں پچھلے چند برسوں کے دوران پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش' اسرائیل' فلپائن اور برطانیہ کو جمہوری طریقے سے منتخب شدہ خواتین لیڈران حاصل ہوئیں۔ مگر یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پھر بھی پوری دنیا میں صرف 907 فیصد خواتین قومی' صوبائی یا بعض جگہ شاہی امور سے متعلقہ عوامی عہدوں پر فائز ہیں (Viewpoint, 1990ء) خواتین یا ہماری "خاموش اکثریت" کے خلاف یہ امتیاز بلاتخصیص جاری ہے۔ ماہرین نفسیات اسے "سیکس ازم"۔ "جنسی امتیاز" یا "جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک" کا نام دیتے ہیں۔ سیکس ازم نے موجودہ صدی کے پہلے چوتھائی حصے میں علم نفسیات کی راہیں تاریک کئے رکھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب علم نفسیات فلسفے کی کوکھ سے جنم لینے کے بعد اپنی ماں سے جدائی کے صدمے سے گزر رہا تھا۔ جیسے جیسے یہ نوزائیدہ علم مادر فلسفہ سے جدا ہوتا گیا۔ اور اس نے مختلف تجرباتی علوم مثلاً فزکس' کیمسٹری' بائیالوجی' فزیالوجی اور میڈیسن وغیرہ کا ذائقہ چکھنا شروع کیا' ویسے ویسے ہی یہ اسی سانچے میں نشوونما پاتا گیا اور پختہ ہوتا گیا۔ بالآخر یہ اس مقام پر آپہنچا جہاں اس علم نے اسے تقویت فراہم کرنے والے علوم کی روح کو ہی خود میں جذب کرلیا —— یعنی تجربہ کاری اور مشاہدات کی بنیاد پر علم کی جستجو کو منسلک کیا۔ آج حالانکہ نفسیاتی لٹریچر سے بنیادی طور پر تجربیت کا رنگ ہی ٹپکتا ہے مگر پھر بھی اس کی تہہ میں کئی ایسے شعبوں اور موضوعات کے بارے میں بے بنیاد مفروضات اور افکار کے اثرات پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں تجرباتی اور مشاہداتی شہادت کا فقدان ہے۔ ان ہی شعبوں میں سے ایک

انسانی نفس یا سائیکی میں انسان کی جنس کی بنیاد پر پایا جانے والا تفاوت ہے۔

جدید دور کے ماہرین نفسیات میں سے غالباً فرائڈ وہ پہلا فرد تھا جس نے عورتوں کا ایک الگ نفسیاتی نظریہ پیش کیا۔ بچوں کی نفسیاتی اور جنسی نشوونما کا نظریہ پیش کرتے ہوئے فرائڈ ایک بچے اور ایک بچی کی نشوونما کے مراحل میں تفریق کرتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق لڑکا اپنے بچپن کے برسوں میں اپنی ماں کو اپنی محبت کا مرکز سمجھتا ہے اور محبت کے اس مرکز کے ساتھ اپنے تعلق کے سلسلے میں وہ اپنے باپ کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ماں سے محبت اور باپ سے نفرت کرتا ہے۔ فرائڈ اسے "ایڈی پس کمپلیکس" (Oedipus Complex) یعنی "ایڈی پس تنقید" کا نام دیتا ہے۔ یہ نام ایڈی پس کے مشہور یونانی المیئے سے لیا گیا ہے۔ لڑکی کے بچپن کی صورت میں یہ صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ وہ باپ کو اپنی محبت کے قابل چیز سمجھتی ہے۔ جبکہ اس محبت کے تعلق کے معاملے میں اس کی ماں اس کی رقیب ہوتی ہے۔ یوں ایک بچی اپنے باپ سے محبت اور ماں سے نفرت کرتی ہے۔ فرائڈ نے اس کو "الیکٹرا کمپلیکس" (Electra Complex) یعنی "الیکٹرانی تنقید" کا نام دیا ہے' جو کہ Agamemnon کی اس بیٹی کا نام تھا جس نے اپنی ماں کے قتل کا اہتمام کیا تھا۔ فرائڈ سمجھتا تھا کہ لڑکی اپنی ذات میں ایک عضوی کمی محسوس کرتی ہے' جس کے انکشاف کے نتیجے کے طور پر وہ اپنی توجہ اپنے باپ کی جانب مبذول کر دیتی ہے۔ وہ اپنے جسم میں اس مخصوص عضو کی کمی کے لئے اپنی ماں کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے اور اس امید میں اپنی محبت باپ کی طرف منتقل کردیتی ہے کہ اس طرح اس کی خامی کی تلافی ہوجائے گی۔ (Freud, 1923ء) اس طرح کے نظریات قائم اور پیش کرتے ہوئے غالباً فرائڈ پہلے جنسی امتیاز کرنے والے (Sexist) ماہر نفسیات کے طور پر ابھرتا ہے۔ یعنی ایک ایسا ماہر نفسیات جو افراد کی جنس کی بنیاد پر ان میں امتیاز کرتا ہے۔ کیا یہ سب فرائڈ کی جانب سے ایک واضح طور پر معاشی و سیاسی معاملے کو دھندلانے اور اسے ایک "جنسی" رنگ دینے کی دانستہ کوشش تھی؟

یونگ (Jung) فرائڈ کے جانے پہچانے پیروکاروں میں سے ایک تھا' جو کہ بعد

میں ایک مشکوک سی شہرت کے حامل ماہر نفسیات کے طور پر جانا گیا۔ اس نے بھی انسانی نفس یا ذات کی دو مختلف توضیحات پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ یعنی مردانہ نفس اور زنانہ نفس۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک مرد' اور ایک عورت کی نفسیاتی ساخت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں' لیکن ان دونوں کی سوچ' تفکر اور جذبات میں بہت واضح اور صریح قسم کے اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس قسم کے اختلافات نخستمثال (Archetype) میں بڑے واضح طور سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے نظریئے کے مطابق نخستمثال انسانی ذہن میں اساسی یا ابتدائی طور پر پائے جانے والے عکس ہیں۔ چنانچہ ایک مرد کے ذہن میں ایک عورت کا تصور موجود ہوتا ہے جس یونگ نے "انیما" (Anima) یا تصویر زن کا نام دیا۔ اسی طرح سے ایک عورت کے ذہن میں ایک مرد کا تصور موجود ہوتا ہے جسے یونگ "اینی مس" (Animus) یا تصویر مرد کہتا ہے۔ انیما ایک مرد کے اندر پائی جانے والی عورت ہے' اور اینی مس ایک عورت میں موجود مرد کا نام ہے۔ یونگ کے کہنے کے مطابق مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے مختلف انداز میں سوچتے' محسوس کرتے' اور عمل کرتے ہیں' کیونکہ ان میں ایسا کرنے کا ایک اندرونی یا پیدائشی رجحان موجود ہوتا ہے (Jung, 1956ء) اس لحاظ سے یونگ وہ دوسرا نامور ماہر نفسیات تھا جس نے ایک ماہر نفسیات کی بجائے ایک جنسی امتیاز کرنے والے (Sexist) کی طرح سے بات کی۔

فرائڈ اور یونگ کے نظریات کو کل بھی اور آج بھی محض مفروضوں کی حیثیت حاصل ہے۔ نفسیاتی لٹریچر میں جدید رجحانات کا جھکاؤ تجرباتی تحقیق کی جانب زیادہ ہے بہ نسبت محض نظریات پیش کرنے یا خیالی باتیں کرنے کے۔ انسانی نفس' ذات یا سائیکی میں جنس سے متعلقہ اختلافات کے متعلق بہت سی تجرباتی شہادتیں سامنے آئی ہیں جن کا ذکر یہاں کرنا مناسب ہوگا۔ آیئے اس موضوع پر موجود مواد میں سے کچھ کا جائزہ لیتے ہیں۔

تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ اگر حاملہ خواتین کا جائزہ لیا جائے تو لڑکیوں کی نسبت نرینہ بچوں والے حمل تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔ (یعنی 100 مادہ حمل کے مقابلے میں 130 سے 150 نرینہ حمل موجود ہوتے ہیں۔) مگر اسقاط کی شرح نرینہ حمل کے لئے

زیادہ ہے اور مادہ حمل کے لئے کم۔ یوں زندہ بچ جانے یا بقاء کا تناسب تقریباً 106 نرینہ بچوں کے مقابلے میں 100 مادہ بچے ہیں۔ یعنی حمل پانے والے نر اور مادہ جنین میں ایک سو لڑکیوں کے مقابلے میں 106 لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔
(Developmental Psychology Today, ء1975) دیکھا گیا ہے کہ مادہ جنین (قبل از پیدائش بچہ) نرینہ جنین کی نسبت زیادہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔ یہ بات تمام زندگی کے دورانیئے پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ اس طرح کہ موت کی شرح خواتین کی نسبت مردوں میں زیادہ ہے۔ جبکہ عورتوں کی متوقع عمر بھی مردوں کی نسبت زیادہ ہے۔
یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حقائق دیگر غیرانسانی مخلوقات مثلاً چوہوں' بھنوروں' اور مکڑیوں وغیرہ کے بارے میں بھی درست ہیں۔ مزید برآں اس بات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ دماغ کی نشوونما کے سلسلے میں بھی جنس سے متعلق نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ لڑکیوں اور لڑکوں کا دماغ پیدائش سے قبل بھی مختلف شرح یا رفتار سے نشوونما پاتا ہے۔
لڑکیوں میں دماغ کا بایاں نصف کرہ تیز رفتاری کے ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ جبکہ لڑکوں میں دماغ کے دائیں نصف کرے کی نشوونما کی رفتار نسبتاً تیز ہوتی ہے (Levy, ء1974)
چنانچہ لڑکوں میں میکانکی مہارت لڑکیوں کی نسبت تیزی سے نشوونما پاتی ہے جبکہ لڑکیوں میں لفظی مہارت لڑکوں کی نسبت زیادہ تیزی سے نشوونما پاتی ہے۔
(Kimura, ء1985) - (اب اگر آپ آئندہ کسی ایسی لڑکی کو دیکھیں جو الفاظ پر مکمل عبور رکھتی ہو اور گفتگو میں طاق ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟) اس کے علاوہ عورتوں کا دماغ اور مردوں کا دماغ' دونوں اپنی ساخت اور اپنے نظام کی بنا پر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دماغ کے دائیں اور بائیں نصف کرے کو آپس میں ملانے والے عصبی ریشے مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ کثیف ہوتے ہیں' جس کی وجہ سے دونوں نصف کروں میں بہتر رابطہ پایا جاتا ہے۔ نتیجتاً" دوسری بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ عورتوں میں بہتر لفظی مہارت کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔

(De Lacoste - Utamsing & Holloway, ء1982, Wada et al, ء1975).

چنانچہ عورتوں اور مردوں کے دماغ کچھ لحاظ سے بڑے لطیف مگر نمایاں طریقے سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں میں دیگر جسمانی اختلافات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً لڑکے عموماً کلی حرکی مہارت میں لڑکیوں کی نسبت ارفع ہوتے ہیں، جبکہ لڑکیاں آنکھوں اور ہاتھوں کی باہمی مطابقت کے معاملے میں لڑکوں سے بہتر ہوتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ایک طرف تو عظیم مرد کرکٹر پائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کشیدہ کاری میں شاندار مہارت رکھنے والی خواتین پائی جاتی ہیں۔ تحقیق میں دیکھا گیا ہے کہ لڑکوں میں رنگ اندھا پن (Colour Blindness) پائے جانے کا امکان لڑکیوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ رنگ اندھا پن جنس سے متعلقہ رجعی ارثیوں (Vecessive Genes) کے نتیجے میں پایا جاتا ہے۔ یہ ارثیئے عورتوں میں رجعی ہوتے ہیں اور مردوں میں غالب، غالباً عورتوں کے اپنے لباس اور میک اپ کے رنگوں کے بارے میں بہت باشعور ہونے اور چھان پھٹک کرنے کی ایک وجہ یہ امر بھی ہے۔ عورتوں میں سونگھنے اور سننے کی حس بھی نسبتاً تیز ہوتی ہے۔ شاید عورتیں اپنے پرفیوم یا خوشبو کے انتخاب کے بارے میں بھی اسی لئے زیادہ غور و فکر کرتی ہیں۔ اور شاید یہ اچھی حس سماعت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ باربرا سٹرا ئیسنڈ، روشن آرا بیگم، ام کلثوم، لتا اور ماریا کالیس جیسی بہترین گلوکارائیں پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

(Vierling & Rock, 1967, Zimbardo, 1979).

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں ضرر دماغ اور اقل فتور، فعل دماغ (Minimal Brain Dysfunction) زیادہ تواتر سے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں ذہنی معذور لڑکیوں کی نسبت ذہنی معذور لڑکے زیادہ نظر آتے ہیں۔ لڑکیوں میں ذہنی انطباء (Mental Retardation) کی شرح فیصد بھی لڑکوں کی نسبت کم دیکھی گئی ہے۔ بالیدگی کے سلسلے میں بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کی نسبت تقریباً دو برس پہلے پختہ ہو جاتی ہیں۔ اس امر کو ہم آغاز طمث (یا Menarche) کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی لڑکیوں میں حیض کا آغاز۔

مردوں اور عورتوں میں ان نہایت ظاہری اور واضح جسمانی اختلافات کے علاوہ کچھ کم ظاہری قسم کے فرق بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں مردوں اور عورتوں کی جسمانی زوال پذیری اور جنسیت شامل ہیں۔

مثال کے طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عقلی صلاحیت (Kinsey et al, 1948ء, 1953ء) یا ذی فہمی کی صلاحیت کی زوال پذیری عمر رسیدہ عورتوں کی نسبت عمر رسیدہ مردوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ اگر باقی تمام عوامل یکساں (Neugraterv, Levinson, 1978) ہوں تو مرد اپنی ذہانت اور عقلی صلاحیتیں بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے کھو دیتے ہیں۔ انسانی جنسیت کے بارے میں کی گئی تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنے جنسی ردعمل کے سلسلے میں چار مراحل سے گزرتے ہیں، یعنی 1) ہیجان - 2) ہمواریت - 3) انتہا اور 4) تحویل قوت - پہلے مرحلے میں فرد کی جنسی بیداری کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمواریت میں ہیجان بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ انتہا کے مرحلے میں اسے رہائی یا استخلاص کے ایک شدید احساس کا تجربہ ہوتا ہے۔ چوتھے اور آخری مرحلے کے دوران جسم بتدریج اپنی نارمل حالت کی طرف لوٹتا ہے جس میں اور علامات کے علاوہ بلڈ پریشر کم ہوتا ہے اور دل کی دھڑکن نسبتاً سست ہوتی ہے (Masters and Johnson, 1970ء) - مگر ان ردِاعمال کے ایک پہلو کے معاملے میں دونوں اصناف میں ایک نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ عورتیں خلقی طور پر تیزی اور تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے ایک سے زیادہ بار انتہا کی حد تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں جو کہ مردوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس سلسلے میں پائے جانے والے حقائق کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم اس معاملے میں تو عورت مرد کے مقابلے میں صنف قوی کا درجہ رکھتی ہے۔(Hall, 1969ء)

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی عمر میں ایک اوسط درجے کی عورت عام طور پر اس سے زیادہ دیر زندہ رہتی ہے۔ جتنا کہ ایک مرد رہتا ہے۔ بعض ممالک میں یہ فرق سات سال تک کا بھی پایا گیا ہے۔ (U.S.Census, 1985, Troll, 1975) رنڈوے

مردوں کی شرح اموات بیوہ عورتوں کی شرح اموات سے خاصی زیادہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی طور پر عورت کی نسبت مرد دباؤ اور فشار کے معاملے میں زیادہ غیر محفوظ اور ضرب پذیر ہوتا ہے' (Stroave & Strove, 1983 ; Treas, 1975)

پھر صنف نازک کون ہے؟ جنسیت کے معاملے میں' طویل عمری کے لحاظ سے' مختلف بیماریوں کی مدافعت' اور دباؤ کو برداشت کرنے کے سلسلے میں بظاہر عورت ہی "صنف قوی" دکھائی دیتی ہے نا کہ مرد حضرات!

حالیہ برسوں میں کچھ ماہرین نفسیات نے انسانی نفس کے مطالعے کے سلسلے میں ایک امتیازی انداز فکر ظاہر کیا ہے۔ اور اسے ایک لاشعوری عمل یا لاشعوری میکانیت کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی کچھ لوگ لاشعوری طور پر عورتوں کے خلاف امتیاز برتتے ہیں۔ (Cisler, ء1970) - انہوں نے اس انداز فکر کے جواز اور اس کی معقولیت کے لئے "لاشعور" کو منتخب کیا ہے۔ جس کی قوتیں انسان کے اختیار سے باہر ہیں' جو ادراک اور تفکر کا سب سے آخری نہاں خانہ ہے' اور جو ایک ناقابل دفاع قوت کا آخری درجہ ہے (یعنی جس تک آپ پہنچ ہی نہیں سکتے) کیا ہمارے پاس نفسیات میں جنس کی بنیاد پر کی جانے والی انفرادی تفریق کے انداز فکر کو سہارا دینے کے لئے کوئی حقائق پر مبنی اور تجرباتی شہادتیں موجود ہیں؟ ان میں سے کچھ اختلافات کی موجودگی یا ان کے فقدان کا ہم نے پچھلی سطور میں جائزہ لیا تھا۔ آیئے ہم ان میں سے کچھ اور پر نظر ڈالیں۔

ذہانت کو ماہرین نفسیات اس دنیا کو سمجھنے کی استعداد' اور اس کا مقابلہ' اس کی عہدہ برآری اور اسے تبدیل کرنے کی سوجھ بوجھ کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذہانت' کم از کم کسی حد تک' ایک طبعی استعداد ہے۔ وہ ایک جانب تو اس استعداد کا تعلق انسان کی اپنی عمر کے ساتھ دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اسے اسی عمر کے دیگر افراد میں اس استعداد کی مقدار کے حوالے سے جانچتے ہیں۔ یوں انسان کی طبعی استعداد یا صلاحیت اور اس کی زمانی یا طبعی عمر کے درمیان ایک تناسب حاصل کیا جاتا ہے۔ جسے مقیاس ذہانت یا آئی کیو (I.Q) کہا جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات نے مقیاس ذہانت کی پیمائش کے لئے بہت سے ٹیسٹ بنائے ہیں۔ مگر ذہانت کی ان آزمائشوں کی وجہ سے ماہرین نفسیات

کے درمیان بہت سنجیدہ قسم کے نظریاتی تنازعات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ایسا بالخصوص ذہانت پر ورثے کے اثرات کے حوالے سے ہوا ہے۔ جسے "Heritability Coefficient" یا موروثیت کی قدر کہا جاتا ہے۔

(Baltes et al, ء1977) اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ذہانت یا (I.Q) کا بڑا حصہ طبعی ہوتا ہے۔ (80 فیصد) اور صرف ایک معمولی حصہ (20 فیصد) ماحولیاتی عوامل کی وجہ سے تشکیل پاتا ہے۔ اسی طرح سے انسان کی نسل کے حوالے سے ذہانت میں پائے جانے والے فرق سے متعلق بھی بحث ہوتی رہی ہے' اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک یہ ظاہر نہ ہوگیا کہ درحقیقت نسل سے مراد مفلس اور غربت زدہ ماحول ہے نا کہ کسی کی جلد کا رنگ یا اس کی مادری زبان ۔(Eysenck, ء1981, Nicholas, ء1984)

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "کالوں" کے مقیاس ذہانت کے سکور یا IQ - "گوروں" کے مقیاس ذہانت کے سکور سے دس سے پندرہ درجے تک کم پائے گئے تھے۔ اسی طرح یہ دیکھا گیا کہ تیسری دنیا کے لوگوں کا مقیاس ذہانت بظاہر امریکہ اور یورپ میں رہنے والے ان کے ہم عصروں سے کم تھا۔

(Munroe & Munroe, ء1975 ; Shepard, ء1970.) ذہانت کا ایک اور متنازعہ فیہ پہلو اس کا انسان کی جنس کے ساتھ رشتہ ہے۔ حالیہ برسوں میں دیکھا گیا ہے کہ ذہانت میں جنس سے متعلقہ جن بڑے عمومی اختلافات کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے' ان اختلافات کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ (Morgan et al, ء1986) حالانکہ پہلے اس بات کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی ذہنی نشوونما کے مختلف مراحل میں اس قسم کے کچھ فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ بڑھنے والی عورتیں ایسے امور میں مردوں سے بہت زیادہ بہتر ہوتی ہیں جن میں لفظی مہارت استعمال ہوتی ہو۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورتیں ایسے امور میں مردوں کی نسبت زیادہ "ذہین" ثابت ہوئیں جن میں تفصیلات کا ادراک اور ہاتھوں کی تیز اور درست حرکات درکار ہوں (Witkin, ء1959) اور یہ بھی دیکھا گیا کہ لڑکے ایسے امور میں زیادہ "ذہین" پائے گئے

جن میں میکانکی' مکانی (Spatial) - اور عددی صلاحیتیں استعمال ہوتی ہوں۔ تاہم یہ معمولی قسم کے اختلافات ہیں اور یہ بھی محض عنفوان شباب کے دوران پائے جاتے ہیں۔ ان کے سوا عورتوں اور مردوں کی ذہانت میں کوئی قابل غور یا واضح اختلافات نہیں پائے گئے۔ مگر پھر بھی عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم ذہین ہی سمجھا جاتا رہا ہے اور ان کے خلاف طبعی عوامل یا لاشعوری اعمال جیسی غلط بنیادوں کی بنا پر امتیاز برتا جاتا رہا ہے۔

ذہانت سے بہت قریبی تعلق رکھنے والی دو ایسی خصوصیات ہیں جن کی عورتوں میں نسبتاً غیر موجودگی یا فقدان کو عورتوں کی کمتری کی علامات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ہماری مراد تخلیقیت (Creativity) اور تحریک حصول (Achievement Motivation) جیسی شخصی خصوصیات سے ہے۔ تخلیقیت کو کسی انسان کے غیر معمولی مگر مناسب ردعمل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ تخلیقی ہوتے ہیں۔ مگر تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ تخلیقیت کا تعلق دلچسپی' رجحانات اور انسان کے میلانات سے ہوتا ہے نا کہ اس کی جنس سے (Dallas & Gaier, ء1970)- تخلیقیت اور ذہانت میں ایک منفی تعلق پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت اعلیٰ درجے کی ذہانت رکھنے والے لوگ (یعنی بہت زیادہ ذہین لوگ) تخلیقی نہیں ہوتے (Terman & Oden, 1959) : تخلیقیت کا تعلق قبول ذات' اضطراری پن' اور وحدانیت یا اندرونی بصیرت سے بھی پایا گیا ہے۔ (Mc Kinnon, ء1961) - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا تعلق "نرومادگی" یا Androgyny سے ہے' جس سے مراد ایک انسان کے اندر پائی جانے والی یہ استعداد ہے جس کے تحت وہ اپنی ذات میں پائے جانے والے مردانہ پن اور زنانہ پن دونوں کو قبول کرتا ہے۔ (Helson, 1962; Spence & Helmreich ء1968) - ابھی تک تخلیقیت میں' بطور انسانی شخصیت کے عمل کے' جنس سے متعلقہ کوئی تفاوت نہیں پائے گئے۔ پھر بھی عام لوگ روزمرہ زندگی میں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تخلیقی سمجھتے ہیں۔ کیا یہ بات عجیب نہیں ہے؟

کامیابی کے حصول کے عمومی میلان کو ماہرین نفسیات "تحریک حصول" کا نام

دیتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں میں تحریک حصول زیادہ ہوتی ہے اور کچھ میں کم۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کامیاب لوگوں میں اونچے درجے کی تحریک حصول پائی جاتی ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو اپنی زندگی میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب کیونکہ فرض کیا جاتا ہے کہ لوگ یا تو زیادہ تحریک حصول رکھتے ہیں اور یا کم' اس لئے اس حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے گروہ یا پورے کے پورے ملک' اور درحقیقت اقوام بھی' اس تحریک کے معاملے میں کم یا زیادہ درجے کی حامل ہوتی ہیں ــــــ یعنی زیادہ تحریک حصول رکھنے والی اقوام اور کم تحریک حصول رکھنے والی اقوام۔ کم کامیاب اور پسماندہ ممالک اور اقوام کے مقابلے میں کامیاب اقوام کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تحریک حصول پائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اقوام میں اپنی تاریخ کے کسی خاص مقام پر بہت زیادہ تحریک حصول پائی جائے' اور یہ تحریک ان کے اعلیٰ درجے کے نفیس فنون لطیفہ اور تہذیب کے حصول میں جھلکے ــــــ اور پھر ہو سکتا ہے کہ یہی قوم کم تحریک حصول کے درجے پر پہنچ جائے اور پھر اس کی تہذیب و تمدن' جس کا اظہار اس کے عسکری' فنون لطیفہ سے متعلق' اور تہذیبی حصول کے ذریعے ہوتا تھا' زوال اور انحطاط کا شکار ہو جائے۔ بعض ماہرین نفسیات سلطنت روم کے زوال اور خاتمے کو اس قوم میں تحریک حصول کے فقدان کے ساتھ ہی وابستہ کرتے ہیں۔

(Mc Clelland, 1961; Atkinsow, 1964; Feather, 1967) - ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں ماہرین نفسیات نے تحریک حصول میں جنس سے متعلقہ اختلافات کی جستجو کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ عورتیں اپنے مرد ساتھیوں کی نسبت بہت زیادہ تحریک حصول اس لئے نہیں رکھتیں کیونکہ وہ عموماً اپنے گھر تک ہی محدود رہتی ہیں۔ اور حتیٰ کہ جب وہ کام کرنے کے لئے باہر کی دنیا میں نکلتی بھی ہیں تو وہ بہت زیادہ نفع بخش اور با اثر ملازمتیں حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ اس قسم کی تحقیق کے نتیجے میں کچھ ماہرین نفسیات نے یہ دیکھا کہ عورتیں واقعی تحریک حصول کے معاملے میں مردوں سے کم درجے پر ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس فقدان کو عورتوں میں "کامیابی کا خوف" (یا Fear of Success) کہا۔ (Horner, 1969ء)-

اور پھر ماہرین نفسیات نے آخر کار یہ دریافت کر ہی لیا کہ کیوں عورتوں کو اپنے کام کا کم معاوضہ ملتا ہے' کیوں انہیں معمولی قسم کے امور تک ہی محدود رکھا جاتا ہے' اور کس طرح وہ کبھی بھی باہر کی اس "حقیقی" دنیا میں مرد کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی جسے ہمیشہ سے اور بجا طور پر "مرد کی دنیا" ہی سمجھا جاتا ہے! مگر وہ ماہرین نفسیات جو تجربی تحقیق کرتے ہیں وہ ایک اپنی ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو آسانی سے ہار نہیں مانتے۔ چنانچہ کامیابی کے خوف نامی مجموعہ علامات کی "دریافت" کے بعد جیسے اس موضوع کے بارے میں تحقیقی سرگرمیوں کا ایک سیلاب آگیا۔ اس کے نتیجے میں ہونے والی تقریباً دو سو سے زائد تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ اب تک جس چیز کو کامیابی کا خوف کہا جا رہا تھا وہ دراصل ایک اجتنابی ردِّعمل ہے جو معاشرتی' معاشی اور تاریخی حالات کی بنا پر جنم لیتا ہے۔ اس تحقیق سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ ردِّعمل نسل انسانی میں مرد اور عورت دونوں میں پایا جاتا ہے (Tresemer, ء1976) - چنانچہ کامیابی کے بارے میں پایا جانے والا جنسی امتیازی نظریہ تجربی تحقیق کے سامنے بھی نہ ٹھہر سکا جو کہ ظاہر ہے کہ ایسے نظریات کے مالک نفسیات دانوں کے لئے تو باعث حیرت ہی تھا۔

پچھلی دو' یا اس سے کچھ زیادہ' دھائیوں کے دوران علم نفسیات میں ایک اور اہم تصور کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس تصور نے تجربی و تجرباتی تحقیق کے نتیجے میں جنم لیا ہے۔ یہ "طلب تحس" یا Sensation Seeking کا تصور ہے۔ طلب تحس کو کسی انسان کی شخصیت کی ایک خصوصیت یا نمایاں صفت' اور ایک مخصوص انداز میں محسوس کرنے اور کردار اپنانے کے رجحان کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ طلب تحس سے مراد جدت کی حامل اور تہیج انگیز صورت حالات کی طلب اور تلاش' اور ان کا جائزہ لینا ہے۔ (Zuckerman, ء1979) - طلب تحس اور "تجسس" (Curiosity) میں ایک تعلق پایا جاتا ہے' اور وہ یہ کہ یہ دونوں رجحانات کسی بھی عضویہ یا جاندار کو جرات آزمائی کرنے' نامعلوم کو معلوم کرنے' اور اس قسم کی سرگرمی سے لطف اندوز اور محظوظ ہونے پر اکساتے ہیں۔ طلب تحس کی حیاتیاتی یا طبعی بنیادوں کی کھوج کے نتیجے میں نفسیات دانوں کو معلوم ہوا ہے کہ اس رجحان کی جڑیں مرکزی نظام عصبی کے اعمال میں پائی جاتی

ہیں۔ تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ کسی عضویہ کا مرکزی نظام عصبی سرگرمی کی ایک مستقل سطح برقرار رکھتا ہے اور اس میں رجعی تغذیہ (Feedback) کا ایک اندرونی نظام موجود ہوتا ہے جو بیرونی تہیج کی عدم موجودگی یا کمی کی صورت میں اپنے آپ کو خود ہی سرگرم رکھ سکتا ہے۔ (Suedfeld, ء1969) چنانچہ جب ہم کسی کبوتر کو بغیر کسی بیرونی ظاہری وجہ کے اڑتے اڑتے ہوا میں یکایک قلابازی لگاتے ہوئے دیکھیں تو ہمیں اس کے اس عمل کی وجہ سمجھ آجانا چاہیے۔ یعنی اس نے ایسا اس لئے کیا ہوگا کہ اس کے تہیج کی سطح گر گئی ہوگی' اور وہ خود کو تہیج فراہم کرکے اس کی ایک مسلسل سطح برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ گویا یہاں بھی تحسس طلبی کار فرما تھی۔ اسی طرح سے آپ نے اکثر ایسے نوجوان دیکھے ہوں گے جو سڑک پر اچانک اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بے حد تیز کرتے ہوئے اس کا اگلا پہیہ زمین سے اوپر ہوا میں اٹھا لیتے ہیں۔ اس حرکت کی بھی کوئی بیرونی طور پر ظاہری وجہ نظر نہیں آتی اسے بھی اس نوجوان کی طلب تحسس کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ یا پھر کسی ایسے شوہر کی مثال میں جو دفتر سے گھر لوٹتے ہی اپنی بیوی کے ساتھ لڑائی جھگڑا شروع کردیتا ہے' جبکہ اس حرکت کی بھی کوئی ظاہری وجہ نہیں ہوتی۔ شوہر کے اس رویئے کو بھی اس کے طلب تحسس کے رجحان کے حوالے سے سمجھا اور بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں کی جانے والی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ سنسنی خیزی یا طلب تحسس کے معاملے میں عورتوں اور مردوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ عورتوں کی نسبت مردوں میں طلب تحسس کا بہت نمایاں طور پر زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مردوں میں طلب تحسس کے رجحان کی یہ اونچی سطح تہذیبی اور نسلی لحاظ سے مختلف لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان تہذیبی گروہوں میں یورپی' ایشیائی اور امریکی مرد شامل ہیں۔ یعنی طلب تحسس کا یہ اونچی سطح کا میلان دنیا کی تمام بڑی تہذیبوں کے مردوں میں پایا جاتا ہے۔

(Ohkubo, 1972; Berkowitz, 1967; Zucker-man, ء1964)

بیویوں کی مارکٹائی' جوا بازی' نشہ آور ادویات کا استعمال' حد سے زیادہ شراب نوشی یا الکحل ازم' کرداری کج روی' اور معمولی درجے کا مجرمانہ کردار۔ یہ وہ مسائل ہیں

جو خصوصی طور پر مردوں ہی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کو بھی ہم طلب تحس کی اونچی سطح کے رجحانات کے حوالے سے سمجھ سکتے اور ان کی وضاحت کرسکتے ہیں۔ اس کے برعکس کیونکہ عورتوں میں طلب تحس کے رجحان کی سطح نیچی پائی جاتی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ وہ کم جارح' کم تشدد کرنے والی اور جوئے بازی' نشہ بازی اور شراب نوشی کی جانب کم راغب اور مائل ہوں۔ مزید برآں اسی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ وہ معمولی قسم کے مجرمانہ کردار میں ایک نچلے یا کم درجے کی سطح تک ہی ملوث ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو عورتوں کے کردار کے بارے میں آج کل یہی صورت حال ہے۔

(Clark & Midanik, 1982 ; Martin, ء1976).

نفسیاتی اعمال کا ایک اور بڑا شعبہ جس میں عورتیں مردوں سے مختلف ہوسکتی ہیں' وہ ذہنی امراض ہیں۔ ذہنی امراض کو شخصیت کی ایک نسبتاً شدید' مستقل اور تکلیف دہ خرابی سمجھا جاتا ہے' جو انسان کی روزمرہ زندگی میں دخل انداز ہوتی ہے۔ نفسیاتی معالجین (کلینیکل سائیکالوجسٹ) ذہنی امراض کو عموماً چار بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (الف) عصبانیت یا Neurosis (ب) اختلال ذہنی یا Psychosis (ج) شخصیاتی خلل یا Personality Disorders اور (د) ذہنی پسماندگی یا Mental Retardation

عصبانیت یا نیوراتی ذہنی امراض سے مراد نسبتاً معمولی درجے کے وہ عوارض ہیں جس میں اس کا شکار ہونے والا انسان اپنی ذات پر اپنا اختیار' اور حقیقت کے ساتھ اپنا رابطہ نہیں کھوتا۔ وہ یوں تو اپنی روزمرہ زندگی نارمل طریقے سے گزارتا ہے مگر اس کی شخصیت میں کسی قسم کی کج روی آجاتی ہے۔ مثلاً مستقل اور بے بنیاد فکر ("تشویش")' یا کسی خیال کا مستقلاً" بار بار اس طرح ذہن میں آنا کہ انسان کو بظاہر اس پر کوئی اختیار نہ ہو ("خبط")' یا اپنے ہاتھ بار بار دھونے کا رجحان ("اجبار") وغیرہ۔ یہ تمام عصبانیت کی علامات ہیں جو کہ ذہنی امراض کی ایک نسبتاً معمولی شدت والی قسم ہے۔ اختلال ذہنی' ذہنی امراض کی نسبتاً شدید قسم ہے جس میں کوئی شخص احساس حقیقت کھو دیتا ہے' اور اپنی ذاتی' خود ساختہ' اور اکثر بے ربط دنیا میں گم ہوکر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ذہنی اختلال کا شکار ایک فرد حقیقت میں غیرموجود ایسی آوازیں سن سکتا ہے جو اس سے گفتگو

میں عجیب و غریب سی باتیں کر رہی ہوں۔ (شیزوفرینیا یا انشقاق ذہنی) ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بس میں سفر کر رہا ہو اور اسے "محسوس" ہو کہ لوگ اسے "کہہ رہے ہیں" کہ وہ ایک "پیغمبر" ہے (پیرانویا' یا خبط عظمت) ۔ وہ اپنی ماں کو اپنا سخت ترین دشمن سمجھ سکتا ہے اور چھری سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اضمحلالی مدہوشی میں داخل ہو جائے اور کئی کئی دن تک بغیر کچھ کھائے پیئے اس حالت پر پہنچ جائے کہ یہ فاقہ کشی اس کی جان کے لئے خطرہ بن جائے۔ (اضمحلالی اختلال ذہنی) ۔

شخصیاتی خلل ایسے کرداری انداز ہوتے ہیں جو مخفی ہوتے ہیں اور خاص واضح یا نظر آنے والے نہیں ہوتے' اور ان میں بعض عصبانی یا اختلالی امراض سے مشابہت پائی جاسکتی ہے۔ یہ ایسے غیر لچکدار اور حالات کے مطابق نہ ڈھل سکنے والے شخصیاتی خصائل ہوتے ہیں جو ان کا شکار ہونے والے شخص اور اس کے آس پاس کے لوگوں کے لئے تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ کرداری اطوار مریض کی شخصیت میں خوابیدہ ہوتے ہیں اور نفسیاتی دباؤ کی صورت میں بیرونی طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا شکار انسان عموماً نارمل دکھائی دیتا ہے' لیکن معاشی خسارے' کسی قریبی عزیز سے کسی حادثے کے نتیجے میں جدائی' یا ملازمت کھو دینے کی صورت میں وہ اچانک یہ سوچنا شروع کر سکتا ہے کہ تمام کی تمام دنیا اس کی دشمن ہے۔ یا اس کے دشمنوں نے اس کے سونے کے کمرے میں اس کی وہ باتیں سننے کے لئے مائیکروفون نصب کر رکھے تھے' جس کے نتیجے میں اسے یہ معاشی خسارہ ہوا۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ اس کے دشمن کئی برس سے اس کے خلاف منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ ذاتی المیہ برپا ہوا۔ چنانچہ شخصیاتی خلل وہ غیرنارمل کردار یا رویئے ہوتے ہیں جو کچھ اس طرح سے شخصیت میں مخفی ہوتی ہیں کہ ایک عام آدمی کو ان کا ادراک نہیں ہوتا' لیکن ایک تربیت یافتہ نفسیاتی معالج ان کو بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔

ذہنی البلاء دماغ کو ضرر پہنچنے کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ یہ دماغی ضرر پیدائش سے قبل ماں کے پیٹ ہی میں لاحق ہو سکتا ہے۔ یا پیدائش کے بعد کسی بیماری' جینٹک یا ارثیوں کی خامی' حادثے یا ماں یا معالج کی بے احتیاطی کی وجہ سے بھی رونما

ہو سکتا ہے۔ ذہنی انطباع کے شکار لوگوں کا مقیاس ذہانت کم درجے کا ہوتا ہے۔ (یعنی 100 سے کم)۔

نفسیاتی تحقیق کے نتیجے میں آج ہم سینکڑوں ایسی ذہنی علامات سے واقف ہو چکے ہیں جن کی شناخت اور درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ان سینکڑوں علامات میں سے صرف چوالیس (44) ایسی ہیں کہ جن میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ جتنی بھی علامات ہیں مرد اور عورتیں دونوں ان کا ایک سے تواتر اور شدت کے ساتھ شکار ہو سکتے ہیں۔ ان چوالیس علامات میں سے' جن میں جنس کے حوالے سے فرق پایا جاتا ہے' تیئیس (23) ایسی ہیں جو مردوں میں نسبتاً زیادہ تواتر سے پائی جاتی ہیں' جبکہ اکیس (21) عورتوں میں زیادہ دیکھی گئی ہیں۔

(Diagnostic & Statistical Manual of Mental Disorders, or DSM, ء1987)

اوپر دیئے گئے اعداد و شمار جس ذریعے سے لئے گئے ہیں۔ (DSM) اسے دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ذہنی مرض کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو اس میں مریض کی جنس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مرد و زن دونوں کسی بھی ذہنی مرض کا شکار ہو سکتے ہیں' گو زیادہ ذہنی امراض کا حملہ عورتوں کی نسبت مردوں پر ہوتا ہے۔ اب اگر عورت اتنی ہی مضبوط ہے' اور کئی لحاظ سے مردوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے' اور اگر مرد اور عورت دونوں کے نفسیاتی افعال میں کسی نمایاں تفاوت کو ثابت کرنے کے لئے کوئی تجرباتی شہادت بھی موجود نہیں ہے' سوائے طلب تجسس اور ذہنی امراض کے وقوع کے (جو کہ عورتوں ہی کی حمایت میں جاتا ہے) تو پھر کیوں اور کس طرح سے عورتوں کو کمزور یا کم تر جنس گردانا جاتا ہے؟

مندرجہ بالا حقائق و نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اب یہاں اس تمام تر تحقیق کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو کہ ماہرین نفسیات اور دیگر اسی قسم کے علوم کے ماہرین نے پچھلے تقریباً پچاس برس کے دوران جنس سے متعلق پائے جانے والے اختلافات اور تفریق کا جائزہ لینے کے لئے کی ہے۔

عورتوں اور مردوں میں پائے جانے والے واضح جسمانی فرق کے علاوہ یہ دیکھا گیا

ہے کہ مردوں اور عورتوں کے دماغ کی ساخت اور اس کی نشوونما کے سلسلے میں کچھ باتیں فرق ہیں۔ پیدائش سے قبل دونوں کے دماغ کی نشوونما اور اس کی شرح مختلف انداز میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لڑکیوں کا بایاں نصف کرہ اور لڑکوں کا دایاں نصف کرہ زیادہ تیزی کے ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ مادہ جنین درحقیقت زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ شیر خوار بچوں کی شرح اموات لڑکیوں کی نسبت لڑکوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ ضرر دماغ (Brain Damage) لڑکیوں کی نسبت لڑکوں میں نمایاں طور پر زیادہ پایا گیا ہے۔ (لڑکیوں اور لڑکوں میں ایک اور پانچ کا تناسب ہے۔) عورتوں کی بصری تیزی یا تیز بصارت' حس شامہ اور سمعی حس مقابلتاً" بہتر ہوتا ہے۔ عمر رسیدگی کے نتیجے میں ہونے والا ذہنی انحطاط عورتوں کی نسبت مردوں میں زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ جہاں تک نفسیاتی اعمال کا تعلق ہے۔ عورتوں اور مردوں کی ذہانت' تخلیقی صلاحیت' یا تحریک حصول میں کوئی فرق نہیں پایا گیا—— چنانچہ مشاہدے سے ظاہر ہوا ہے کہ مرد و زن دونوں برابر کے ذہین' تخلیقی اور حصول کرنے والے ہوتے ہیں۔ طلب تحس کے سلسلے میں دونوں میں کچھ فرق پائے گئے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ مرد طلب تحس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ ذہنی امراض کے سلسلے میں بھی کچھ اختلافات نظر آئے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ چوالیس ایسے ذہنی عارضے ہیں جن میں جنسی اختلافات موجود ہیں۔ ان چوالیس میں سے تیئس ایسے ہیں جو مردوں میں زیادہ تواتر سے پائے جاتے ہیں چنانچہ تحقیق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرنے کا کوئی خاطر خواہ جسمانی یا نفسیاتی جواز نہیں ہے۔ اور اگر ہم اسی بات پر اڑے رہیں کہ مرد و زن مختلف ہی ہیں تو جب کبھی اور جہاں بھی کوئی فرق نظر آیا ہے وہ عورتوں کی حمایت میں ہی جاتا ہوا پایا گیا ہے۔ پھر بھی عورتوں کے خلاف امتیاز برتا ہی جاتا ہے۔ اس امتیازی سلوک کی جڑیں دراصل ان رویوں میں پائے جانے والے اختلافات میں موجود ہیں جو معاشرہ عمومی طور پر مردوں اور عورتوں کی جانب روا رکھتا ہے' جبکہ درحقیقت دونوں جنسوں میں کوئی نمایاں حیاتیاتی یا نفسیاتی تفاوت موجود نہیں ہے۔ یہ صورتحال Chapki (1988ء) نے یہ کہتے ہوئے بیان کی گئی ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی مردوں سے علیحدگی کی وجہ سے عورتیں

ایک طرف تو بڑی محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی، اور مددگار بن جاتی ہیں اور دوسری جانب وہ لازماً محتاج، دوسروں پر انحصار کرنے والی، کمزور اور کمتر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہ رویہ، ماہرین نفسیات کی نظر میں، ایک مخصوص طریقے سے محسوس کرنے اور پیش آنے کے مستحکم میلان طبع کا نام ہے۔ یوں کسی شخص کا بہت مذہبی (یا غیرمذہبی) ہونے کا رجحان بھی اس کا رویہ ہے۔ رویہ مثبت بھی ہو سکتا ہے اور منفی بھی۔ مثلاً اگر کوئی شخص بہت مذہبی خیالات کا مالک ہے تو اسے مذہب کی جانب اس کا مثبت رویہ کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص بالکل غیرمذہبی ہے تو اسے مذہب کی جانب اس کا منفی رویہ کہا جائے گا۔ کوئی رویہ تین اجزاء پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ (الف) کسی بھی رویے میں عقیدے یا نظریئے کا ایک نظام ہوتا ہے، یعنی رویئے کے پس پشت ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ (ب) اس میں جذباتیت کا عنصر شامل ہوتا ہے، یعنی انسان اپنے رویئے کے نتیجے میں ایک مخصوص طریقے سے محسوس کرتا ہے۔ اور (ج) رویہ انسان کو عمل کرنے پر مائل کرتا ہے، یعنی انسان کے کردار پر اثرانداز ہوتا ہے۔ چنانچہ رویہ انسان کو ایک نظریئے میں یقین کرنے پر آمادہ کرتا ہے، انسان کو ان تمام چیزوں کی جانب مثبت طریقے سے پیش آنے پر مجبور کرتا ہے جو اس نظریئے کے ساتھ مطابقت رکھتی ہوں، اور پھر وہ انسان سے ایسے اعمال کرواتا ہے جو اس نظریئے میں بیان کردہ ہوں۔ رویئے انسان کی شخصیت کے وہ نفسیاتی اعمال ہیں جو انسان سیکھتا ہے۔ وہ سیکھتا ہے کہ مسلمان، ہندو یا عیسائی کیسے بنا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات میں جمہوری یا تحکم پسند ہونا سیکھتا ہے۔ اور اس طرح سے وہ مردانہ یا زنانہ خصائل کا حامل ہونا سیکھتا ہے۔ اپنی پیدائش کے بعد سے ہی ہمیں ہمارے جنسی کردار کی تربیت دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ آیا ہمیں مردوں کی طرح بننا ہے یا عورتوں کی طرح۔ ایسے ہی جنسی کردار ہم مرتے دم تک ادا کرتے رہتے ہیں۔ اسی تربیت کے نتیجے میں انسان مردانہ یا زنانہ خصوصیات سیکھتا ہے۔

یہ آموزش ہمیں سب سے پہلے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ذریعے فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہمارے ہم عمر، دوست، رشتہ دار اور اساتذہ، اور پھر عمومی طور پر پورا معاشرہ ہمیں یہ تربیت دیتے ہیں۔ شروع میں ایسا ان کے بولے ہوئے الفاظ اور

عمل کے ذریعے' اور پھر ذرائع ابلاغ' ریڈیو' ٹیلی ویژن' کتابوں' رسالوں' اخباروں وغیرہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ (Manes & Melynk, ء1974) - مردوں کو مردانہ رویئے سکھائے جاتے ہیں۔ یعنی مضبوط' جفاکش' جارح' اور پراعتماد بننا سکھایا جاتا ہے۔ مردوں کے جذباتی' نرم دل یا کمزور ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ عورتوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ حساس' شرمیلی' خدمت گزار اور جاں نثار بنیں۔ ان کے بہت زیادہ پراعتماد' حصول پسند یا حاوی ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ یوں جنسی کردار کی تربیت یا مردانہ یا زنانہ رویئے سیکھنا' اس دنیا میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے' اور سن بلوغت اور پختہ عمر میں بھی جاری رہتا ہے۔ والدین' رشتہ دار' دوست احباب' اساتذہ اور ذرائع ابلاغ ان رویوں کے بنانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

(Goldberg, ء1968; Soario et al, ء1973; Cantor, ء1972.)

ماہرین نفسیات نے بہت سے ایسے طریقے دریافت کئے ہیں جن کی مدد سے کسی جاندار کو کسی بھی "پسندیدہ" انداز میں پیش آنا" یا عمل کرنا سکھایا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم ان میں سے دو طریقوں کا تذکرہ کریں گے۔ یہ طریقے "عاملانہ طریق ہائے کار" (Operant Procedures) اور "انضباط بذریعہ کراہت کے طریق ہائے کار" (Aversive Control Procedures) ہیں۔ ان طریق ہائے کار کی مدد سے کتوں کے لعاب دھن کا نکلنا' کبوتروں کا چگنا اور چونچ مارنا' چوہوں کو اپنے پنجرے کا لیور دبانا' اور بلیوں کو میاؤں میاؤں کرنا سکھایا جاسکتا ہے۔ انہی طریقوں سے عورتوں کو زنانہ انداز برتنا اور مردوں کو مردانہ اطوار اپنانا سکھایا جاسکتا ہے۔ یہ طریقے مچھلیوں' پرندوں' ممالیاؤں اور انسانوں غرضیکہ ہر جاندار کو "پسندیدہ" کردار یا انداز عمل سکھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ آیئے اب ہم ان طریقوں کا مختصرا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کس طرح سے ان کو معاشرتی کردار یا رویئے' بالخصوص جنسی کردار' یعنی زنانہ یا مردانہ پن سکھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

عاملانہ طریق ہائے کار میں سے ایک جاندار سے کوئی پسندیدہ عمل کروانے کے لئے اس کی تحریک میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً کچھ تجربات میں چوہوں کو کچھ مخصوص

حرکات سکھانے کے لئے ایک پنجرے میں بند رکھا جاتا ہے۔ پنجرے میں انہیں وقتاً فوقتاً خاص مقامات کو چھونے سے بجلی کا جھٹکا دیا جاتا ہے۔ اس جھٹکے کے ذریعے انہیں جواباً کوئی مخصوص عمل کرنے کے لئے تحریک پہنچائی جاتی ہے۔ انسانوں کے معاملے میں انہیں محض سزا کی دھمکیوں اور انعام کے وعدوں کے ذریعے بھی کسی پسندیدہ کردار کو اپنانے کی اچھی خاصی تحریک دی جاسکتی ہے۔ مثلاً معاشرتی پسندیدگی (یا خدا کی خوشنودی) کے خیال سے لڑکیاں دوسروں کی موجودگی میں اپنا سر ڈھکنا شروع کردیتی ہیں۔ ایک اور عاملانہ طریقہ کار وہ ہے جس میں ماحول کو اس طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ "پسندیدہ کردار" یا رویہ جنم لے۔ اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ گھر' کالج' سکول' گاؤں' شہر اور ملک کا ماحول اس طرح سے ساخت کیا جاتا اور ترتیب دیا جاتا ہے کہ لڑکیوں کے شرمیلے پن' اور لڑکوں کی دلیری اور پراعتمادی کو تعریف یا انعام سے نوازا جاسکے۔ چنانچہ پرانے گھروں میں زنان خانے کو اصل گھر سے الگ رکھنا بھی ایک ایسا ہی طریقہ کار تھا جس میں ماحول کو اس طرح سے ترتیب دیا جاتا تھا کہ لڑکیاں حیاداری اور دیگر زنانہ رویئے سیکھ سکیں۔

جس طرح "پسندیدہ" کردار عاملانہ طریقے سے جاری کیا جاسکتا ہے' اسی طرح "ناپسندیدہ" کردار کو روکنے' ختم کرنے یا تبدیل کرنے کے لئے بھی بہت سے طریقے موجود ہیں۔ انہیں "انضباط بذریعہ کراہت کے طریق ہائے کار" کا نام دیا جاتا ہے۔ انضباط بذریعہ کراہت "ناپسندیدہ" کردار کو روکنے کے لئے درد' تکالیف یا سزا کے استعمال پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں سزا کسی بھی نوعیت کی ہوسکتی ہے۔ مثلاً جسمانی ایذا' معاشی خسارہ' عوامی تضحیک یا تنہائی میں اٹھائی جانے والی شرمندگی' ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے کہ کس طرح سے ہمیں اپنے لڑکپن میں اکثر اپنے آنسو دوسروں سے اس خوف کے مارے چھپانے پڑتے تھے کہ کہیں ہمارے ساتھی اس بات کا مذاق نہ اڑائیں کہ ہم لڑکے ہوکر رو رہے ہیں۔ اسی طرح سے اکثر خواتین کو یاد ہوگا کہ لڑکپن میں کس طرح سے انہیں ہمسائے کے کسی لڑکے کے سامنے اس لئے معصومیت برتنا پڑتی تھی کہ کہیں والدین سے "بے شرم" ہونے پر ڈانٹ نہ پڑ جائے۔

اس تمام بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے "معاشرتی قانون

ساز"، والدین، دوست، رقیب، استاد اور دیگر اہم لوگ ہمیں ہمارے جنس سے متعلقہ کردار سکھانے کے لئے عاملانہ اور انضباط بذریعہ کراہت کے طریق کار اپناتے اور استعمال کرتے ہیں۔

جنسی کردار یا زنانہ و مردانہ رویئے، محض بیرونی اور ماحولیاتی عوامل کے ذریعے ہی نہیں سیکھے جاتے، بلکہ ان کے سیکھنے میں وقوفی اعمال (Cogniture Processes) بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان محض انفعالی یا غیر متحرک طور پر ہر چیز کو وصول اور قبول کرنے والا ہی نہیں۔ وہ متحرک، چیزوں کو سمجھنے والا، تنقید کرنے والا، تجزیہ کرنے والا اور مختلف معلومات کو یکجا کرنے اور بعض غیر ضروری معلومات کو پس پشت ڈال دینے والا بھی ہے۔

انسان خود کو ملنے والے علم کی نوعیت اور انداز پر اپنا کچھ نہ کچھ اختیار استعمال کرسکنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور یوں اسے اپنی آموزش پر اختیار ہوتا ہے۔ پس انسان اپنی تمام تر آموزش کا کم از کم کچھ حصہ وقوفی اعمال کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ مثلاً کسی مہیج کو کوئی معانی دینا، اس کا تجزیہ کرنا اور کچھ اخذ کرنا، مہیجات کا موازنہ اور تقابل کرنا، اور مختلف مہیجات اور واقعات کو یکجا کرکے ایک بامعنی شکل دینا۔ اس طرح کی وقوفی آموزش کے ایک پہلو کا ذکر ہمارے اس وقت زیر بحث موضوع سے بہت قریب ہوگا۔ اس پہلو کو ہم "عوضی آموزش" (Vicarious Learning) یا "مشاہداتی آموزش" (Observational Learning) کہتے ہیں۔ اس قسم کی آموزش میں ہمارا سامنا کسی ماڈل یا قابل تقلید نمونے سے ہوتا ہے۔ یہ ماڈل کسی ایسے فرد یا کسی ایسے کرداری نمونے کی صورت میں ہوسکتا ہے جس کی مثال ہم اپنانا چاہیں، اس کی تقلید کرنا چاہیں، یا اس جیسا بننا چاہیں۔ کسی ماڈل کی تقلید کرنا، یا اس کے نقش قدم پر چلنا، عوضی آموزش کی ایک قسم ہے جسے آموزش حاصل کرنے والا شخص دانستہ طور پر منتخب کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کمسن لڑکی دانستہ طور پر اپنی ماں یا بڑی بہن کی تقلید کرتی ہے، اور یوں مردوں کی موجودگی میں اپنا سر اور سینہ ڈھانپنا سیکھتی ہے۔ لڑکے کے لئے اس کا باپ یا بڑا بھائی ماڈل ہوتے ہیں، اور انہی سے وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھنا یا مہمانوں سے مصافحہ کرنا

سیکھتا ہے۔ تقلید کے لئے مناسب ماڈلوں کی دستیابی یا موجودگی انسان کی اس آموزش کا ایک بڑا ذریعہ ہے جس میں خاص طور پر زنانہ اور مردانہ کردار بھی شامل ہیں۔

ایک پاکستانی خاتون ماہر نفسیات نے کچھ عرصہ پہلے اس سلسلے میں ایک بڑی معلومات افزا تحقیق کی تھی۔ انہوں نے اس تحقیق میں یہ معلوم کیا کہ پاکستان عورت کو ذرائع ابلاغ، بشمول فلم، ریڈیو، ٹی وی، ناول اور رسالے وغیرہ۔ میں کس انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں اس تحقیق کے کچھ اہم نتائج کو پیش کرنا بے جا نہ ہوگا کیونکہ حالیہ برسوں میں ہمارے ذرائع ابلاغ میں جس طرح سے عورت کی کردار نگاری کی گئی ہے وہ اس ماڈل کی ایک مثال ہے جو ہماری خواتین کو تقلید کرنے کے لئے پیش کیا گیا۔ اس تحقیق کے مطابق جو زنانہ ماڈل دریافت کیا گیا وہ کچھ یوں تھا۔ (ترجمہ شدہ):

"وہ جذباتی تھی اور اسے اپنی سلامتی کے لئے معاشرتی سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ قربانی دینے والی تھی اور اس نے اپنے انسانی حقوق قربان کردیئے۔ اس کا تصور ذات ہیچ تھا۔ وہ خود کو کمتر محسوس کرتی تھی اور اپنی اس کمتری کو بڑی آسانی سے قبول کرلیتی تھی۔ اس نے اپنی قسمت کے آگے ہتھیار ڈال رکھے تھے۔ وہ توہم پرست تھی اور اپنی ذات اور تمام زندگی کی جانب اس کا رویہ بہت تقدیر پسندانہ تھا۔ وہ مجہول اور انفعالی تھی۔ واقعات اس کے ساتھ خودبخود رونما ہوجاتے اور وہ معاشرتی ناانصافیوں کے سامنے بغیر کسی احتجاج اور لڑائی کے بے بس ہوجاتی۔ اس میں بے جا تنقید کے سامنے اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ وہ بے حد دکھی محسوس کرتی اور اس کے دکھ کو حسین اور نظر فریب بنا کر پیش کیا جاتا۔ وہ اس قدر منکسر المزاج اور اطاعت گزار تھی جیسے کسی دروازے میں پڑا پائیدان۔ وہ فیصلہ نہ کرسکنے والی تھی۔ دوسرے لوگ ہی اس کے معاملات کا فیصلہ کرتے اور وہ ان فیصلوں کو بغیر کوئی سوال کئے قبول کرلیتی۔ اسے خدمات گزاری کی شدید خواہش تھی اور اسے کبھی بھی کسی مطالبے کی یا اپنی من مانی کرنے کی خواہش نہ ہوئی۔ رومان کو اس کی تمام تر وقت کی مصروفیت کے طور پر پیش کیا گیا۔ اور رومان ہی اس کی زندگی کی نمایاں صورتحال تھا۔ اس کی زندگی کا مشن ایک مناسب مرد ساتھی کی تلاش تھا جس کے بغیر وہ نامکمل اور بے کار تھی۔ وہ بے عقل تھی اور اس کی زندگی کے فیصلوں کی

بنیاد تعقل پر نہ تھی۔ اسے چاہے جانے اور سراہے جانے کی شدید خواہش تھی۔ اور دوسروں کی محبت اور تعریف حاصل کرنے کا طریقہ یہی تھا کہ اس کے پاس خوبصورت لباس اور زیورات ہوں نت نئے فیشن اپنائے جائیں' اور میک اپ کیا جائے۔ وہ معاشی طور بے کار اور بے منفعت تھی۔ اور اگر کبھی اس نے کام کیا بھی تو وہ معاشی جزا کے لئے نہ تھا۔ اس کا جذباتی اور معاشی دونوں سطح پر استحصال کیا جاسکتا تھا۔"

(Pervaiz, ۱983ء)

جب ہمارے ذرائع ابلاغ ہی عورت کو اور باتوں کے علاوہ کمتر' کمزور' محتاج' بے عقل' فیصلہ نہ کرسکنے والی' توہم پرست' تقدیر پسندانہ' اور معاشی طور پر بے کار ہستی کے طور پر پیش کریں گے تو پھر ہم اپنی خواتین' بالخصوص جلد متاثر ہونے والے ذہنوں کی مالک کم عمر بچیوں سے کیا بننے کی توقع رکھتے ہیں؟ صرف بہت ہی زیادہ روشن خیال لوگ ایسے ماڈلوں سے مزاحمت کرسکتے ہیں اور تقلید کے لئے کہیں اور سے مثالوں اور ماڈلوں کی تلاش کرسکتے ہیں۔ عام خواتین ایسا نہیں کرسکتیں۔

جس شخص کو قدرت نے تھوڑی سی بھی عقل دی ہے وہ جانتا ہے کہ عورتوں کا اس قسم کا تصور حقیقت سے بہت دور ہے۔ مگر ذرائع ابلاغ اسے پھر بھی اسی طرح پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حقیقت کو اس طرح دانستہ توڑ موڑ کر پیش کرنے کے پیچھے کوئی "پوشیدہ ہاتھ" ہے' اور یقیناً اس کارگزاری کا کوئی "حقیقی" مقصد بھی ہے۔ "خفیہ ہاتھ" ظاہر ہے کہ ہمارے ملک کے اب تک کے کئی غیر نمائندہ' غیر حقدار اور مسلط شدہ ارباب اختیار ہیں۔ اس کارگزاری کے مقصد کے دو پہلو ہیں۔ (الف) عورتوں کو ان کی محنت اور حصول و کارکردگی کے حوالے سے مردوں کے مقابلے میں کمتر قرار دے دیا جائے اور یوں انہیں ان کی مشقت کے معاشی ثمرات سے محروم کردیا جائے اور (ب) عورتوں کو کمتر اور معاشرتی طور پر ناحقدار اور بے کار قرار دے کر انہیں سیاسی طور پر رائے دہی کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ اور یوں انہیں ان کے انسانی حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے۔

عورت کو معاشی طور پر محروم کرنے اور اس سے رائے دہی کا حق چھیننے کے لئے

ہر قسم کے مذہبی اور تاریخی حوالے سامنے لائے جاتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بار احکام قرآنی کو بھی اس مقصد کے لئے غلط طریقے سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ جاننا خارج از دلچسپی نہ ہوگا کہ قرآن پاک کی جو متعلقہ آیات میں نے پڑھی ہیں۔ ان میں، میرے (بے شک کم مایہ اور نامکمل) علم کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "امر جیسے (مردوں کا حق) عورتوں پر ویسے دستور کے مطابق عورتوں کا (حق مردوں پر)" (البقرہ۔پ) ۔اور "ہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے" (البقرہ۔پ) اور پھر حکم ہوتا ہے کہ "اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ دے ڈالو۔" (النساء۔پ۔ اور مسلمانو تم کو روا نہیں کہ عورتوں کو میراث (میت) سمجھ کر زبردستی ان پر قبضہ کرلو۔" (النساء۔پ)۔ قرآن پاک میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کسی کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں برابری نہ کرسکے۔ "تو بالکل (ایک ہی طرف) مت جھک پڑو کہ دوسری کو (اسطرح) چھوڑ بیٹھو گویا (ادھر یا بیچ) میں لٹک رہی ہے۔ اور اگر (آپس میں) موافقت کرلو (ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے) بچے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے" (النساء۔پ) عورتوں پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کے بارے میں حکم ہوتا ہے کہ "جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا) کی تہمت لگاتے ہیں جو (بیچاریاں ایسی باتوں سے محض) بے خبر ہیں اور ایمان رکھتی ہیں ایسے لوگ دنیا اور آخرت (دونوں) میں ملعون ہیں اور (قیامت کے دن) ان کو بڑا عذاب ہوگا۔" (النور۔پ)

ہم جیسے فانی، گناہ گار اور کم مایہ لوگ جب قرآن پاک میں محفوظ خدا تعالیٰ کے احکامات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ملتی جو عورتوں کے لئے اہانت آمیز ہو یا کسی طرح سے بھی منفی طور پر امتیاز کرتی ہو۔ مگر پھر بھی ہمارے کئی ارباب اختیار اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے آیات و احکامات قرآنی کو غلط رنگ دے کر پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا بھی ایک قول ذہن میں آتا ہے جس کا اکثر عورتوں کے خلاف امتیاز برتنے کے جواز کے طور پر سیاق و سباق سے الگ ہٹا کر حوالہ دیا جاتا ہے۔ "لوگو! عورتوں کا ایمان اور ان کی عقل ناقص ہیں۔ برے کردار کی عورتوں سے بچو" (نہج البلاغہ، 2891983)

اس قول کے استعمال کو ہم غلط اس لئے کہہ رہے ہیں کہ یہ قول دراصل کمزور کردار کی مالک عورتوں کے بارے میں ہی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں تمام عورتوں کے بارے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ ناقص العقل ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کے فرمان اور دیگر ایسے بزرگوں کے اقوال، جن کی ہم بے حد عزت اور تعظیم کرتے ہیں، کی ہی غلط تعبیر و تشریح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر یہ امر کوئی خاص قابل حیرت نہیں ہونا چاہئے کہ حقیقت کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور سائنسی شہادت کو چھپایا اور غلط تعبیر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے —— تاکہ اور باتوں کے علاوہ عورتوں کے خلاف امتیاز بھی کیا جاسکے۔

کیا یہ بات باعث استعجاب نہیں ہے کہ معلومات کو اس قدر توڑنے، مروڑنے اور سائنسی معلومات کو اتنا بگاڑنے کے باوجود نسوانیات نے اس قدر قبول عام حاصل کیا اور تیزی سے نشوونما پائی ہے؟ یقیناً نسوانیات کے پیچھے اس قوت سے بھی زیادہ طاقتور کوئی نفسیاتی قوت موجود ہے۔ چنانچہ معاشی اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے عورتوں کی کمتری کے جو خیالی قصے گھڑے جاتے رہے ہیں وہ انسانی نفسیاتی قوت کے نتیجے میں آہستگی کے ساتھ، مگر یقینی طور پر، فنا ہوتے جا رہے ہیں۔ یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مردوں کے ساتھ برابری کے تصور کی فتح ہو رہی ہے۔ اور یقیناً یہی تاریخ کا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ میرے خیال میں اس راستے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ عورتوں کا اپنی ذات کی جانب رویہ ہے۔ یا تو ہماری عورت اس کمتری کو بڑی آسانی اور انفعالی طریقے سے قبول کرلیتی ہے۔ اور یا پھر بڑے متکبرانہ انداز میں اس کمتری کو محض مردوں کے بنائے ہوئے ایک کلنک کے ٹیکے کے طور پر رد کر دیتی ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک صحت مندانہ رویہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں نسوانیات نہ تو اس تصوراتی کمتری کی قبولیت کا نام ہے اور نہ ہی یہ ایک مردانہ انداز میں احتجاج کرنے کا رویہ ہے۔

نسوانیات سے مراد، میری نظر میں، بطور ایک انسان اپنی خامیوں اور خوبیوں کو تسلیم کرنا ہے۔ یعنی نسوانیات اپنی کمزوریوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مضبوط خصائل و اطوار سے آگاہی اور ان کو قبول کرنے کا نام ہے۔

متعہ کی شادی

(شہلا پائڑی)

متعہ کی مطلب وقت گزاری کے لئے شادی کرنا ہے۔ یہ طریقہ قبل از اسلام سے چلا آ رہا تھا جسے اثناء عشری شیعہ فرقہ نے بھی اختیار کر لیا۔ متعہ ایک ایسا عقد ہے جس میں ایک مرد اور ایک غیر شادی شدہ عورت غیر معینہ مدت کے لئے شادی کا معاہدہ کرتے ہیں۔ اس میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ عارضی بیوی کو کتنی رقم فراہم کی جائے گی۔ ساتویں صدی میں خلیفہ عمر ابن خطاب نے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن شیعہ فرقہ نے اس پابندی کو قبول نہیں کیا اور اسے مذہبی طور پر جاری رکھا۔ اس کے لئے وہ قرآن کے چوتھے پارہ کی سورۃ 42 سے جواز لاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ متعہ پر ابتدا میں ذرا پابندی لگا دی گئی تھی لیکن بعض سنی فرقوں میں بھی اس کا رواج موجود رہا ہے۔ تاہم اس پر بحث مباحثہ برابر جاری رہا۔ خلیفہ مامون نے نویں صدی میں متعہ کو جائز قرار دے دیا تھا لیکن سنی علماء کی طرف سے جب اس کی بہت زیادہ مخالفت کی گئی تو انہوں نے اپنا حکم واپس لے لیا۔

متعہ کی رو سے کوئی بھی شیعہ مرد بیک وقت جتنی چاہے عارضی شادیاں کر سکتا ہے۔ یہ شادیاں ان چار بیویوں کے علاوہ ہوں گی جن کی اسلام اجازت دیتا ہے۔ شیعہ فقہ کے امام جعفر صادق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ "کیا متعہ والی بیوی چار بیویوں میں سے ایک ہو گی؟" تو انہوں نے جواب دیا "ان میں سے ایک ہزار سے شادی کر لو کیونکہ وہ کمائی کرنے والی [آجر] ہیں۔" لیکن اس مسئلے پر اختلاف موجود ہے۔ مطہری اور امام خمینی نے اس سے اختلاف کیا ہے کہ کوئی مرد ایک وقت میں چار سے زیادہ عارضی [متعہ والی] بیویاں رکھ سکتا ہے یا یہ کہ شادی شدہ مرد متعہ کر سکتا ہے یا اسے متعہ کرنا چاہیے۔

کنواری یا مطلقہ شیعہ عورت کو ایک وقت میں صرف ایک ہی مرد سے متعہ کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ متعہ کی ہر شادی کے بعد اسے عدت کی مدت پوری کرنا ہو گی خواہ متعہ کی شادی کا عرصہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو بچہ کے باپ کا پتہ چل سکے گا۔ متعہ کی شادی سے پیدا ہونے والے بچے جائز مانے جاتے ہیں اور انہیں مستقل شادی سے پیدا ہونے والے بچوں کے برابر ہی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ہی وہ اصول ہے جو متعہ کو عصمت فروشی سے الگ کرتا ہے حالانکہ دونوں میں بہت مشابہت معلوم ہوتی ہے۔

تاہم متعہ کی صورت میں بظاہر قانون ماں اور بچہ کو تحفظ فراہم کرتا ہے لیکن اس وقت قانون خود اپنی روح کی نفی کرتا ہے جب مرد یہ قبول کرنے سے انکار کر دے کہ وہ بچہ اس کا ہے۔ اس صورت میں قانون مرد کا ساتھ دیتا ہے۔ اگر مستقل شادی کی صورت میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو مرد کو حلف اٹھانا پڑتا ہے۔

لیکن متعہ کی حالت میں اسے اس قسم کی کسی اخلاقی یا قانونی آزمائش سے نہیں گزرنا پڑتا۔ تاہم متعہ کے بارے میں یہ کہنا غلط ہو گا کہ وہ کسی قسم کی عصمت فروشی ہے۔ اس پر اس پس منظر میں گفتگو کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ان دونوں میں جو مماثلت نظر آتی ہے اس کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ متعہ کی شادی کے طریق کار اور اس کے رواج میں شروع سے ہی ابہام چلا آ رہا ہے۔ اس طرح لوگوں کو اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملا ہے۔ متعہ کا بنیادی تصور بھی مسلمان معاشروں میں موجود عورت مرد کی جنسی تفریق کی نفی کرتا ہے' اور اس موقف کی بھی نفی کرتا ہے کہ اسلامی قانون قطعاً غیر متبدل ہے/اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی اس کی تشریح و تعبیر میں جو اختلافات موجود ہیں ان کی وجہ سے بھی اسے مختلف معانی پہنا لئے جاتے ہیں اور اپنے مقصد کے لئے اسے استعمال کر لیا جاتا ہے۔ یہ کام صرف فقہا اور مفسرین ہی نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو عیاشی کرنا چاہتے ہیں' یا اپنے عمل کے لئے اخلاقی جواز حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی مرضی کے تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔

متعہ شادی کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں مرد عورت کے تعلقات، شادی، جنس، اخلاقیات، مذہبی اصول، دنیوی قوانین اور ثقافتی رسوم و رواج سب اکٹھے ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایسا رواج بھی ہے جو مذہب اور عوامی کلچر میں فرق پیدا کرتا ہے۔ مثلاً مذہب کی رو سے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ کنواری عورت متعہ نہیں کر سکتی لیکن عام رواج یہ ہے کہ پہلی مستقل شادی کے وقت عورت کو کنواری ہونا چاہئے۔ مستقل اور عارضی شادی [متعہ] دونوں کو مرد اور عورت کے درمیان معاہدہ ہی مانا جاتا ہے لیکن اس موضوع پر شیعہ علما کی جو کتابیں موجود ہیں ان میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ وہ دونوں کس قسم کے معاہدے کے تحت آتی ہیں۔ خاص طور سے جدید علماء کے یہاں یہ ابہام زیادہ موجود ہے۔ شیعہ علماء جنسی اختلاط کے ان دونوں طریقوں کے فرق کو نظرانداز کرتے رہے ہیں اور صرف اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ ان دونوں میں بس اتنا فرق ہے کہ ایک میں مدت مقرر کی جاتی ہے اور دوسری میں کوئی مدت مقرر نہیں ہوتی۔ لیکن میرے خیال میں متعہ کی یہ غلط تعبیر ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان دونوں معاہدوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک معاہدہ گویا پٹہ ہوتا ہے اور دوسرا مستقل خریداری جیسا معاہدہ ہوتا ہے۔

شیعہ مسلمان اسلامی قانون کی قطعیت کے جس طرح قائل ہیں اس کی مثال قانون قدرت سے ہی دی جا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون مرد اور عورت کو الگ الگ بناتا ہے اور ان کے باہمی رشتے کا تعین کرتا ہے یعنی جس طرح قانون قدرت قطعی ہے اسی طرح شریعت بھی قطعی ہے کیونکہ اس کی اساس قرآن اور پیغمبر اسلام کی سنت پر ہے۔ شہوانی خواہش کو بھی قطعی مانا جاتا ہے کیونکہ یہ خواہش بھی فطری چیز ہے، یہ جبلی بھی ہے اور ناقابل تغیر بھی۔ الوہی اور فطری قوانین کی قطعیت جس طرح شیعہ عقیدے میں شامل ہے اسی نے مرد عورت، ان کے باہمی تعلقات اور ان تعلقات کے جواز کے بارے میں علماء کو بھی فقہی مسائل کے لئے دلائل فراہم کر دیئے ہیں۔

شادی اور شہوانی خواہش سے متعلق اسلامی عقائد کے بارے میں شیعہ

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ عقائد مثبت ہیں' اپنی سند آپ ہیں اور انسانی ضرورت کے مطابق ہیں۔ شادی آنحضرت کی سنت ہے اس لئے عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس تجرد کو برا اور غیر فطری مانا جاتا ہے۔ علماء کے نزدیک اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا مقصد انسانی دکھ درد کو کم کرنا ہے۔ وہ صرف روح کی بالیدگی پر ہی زور نہیں دیتا بلکہ جسم کی تسکین کا خیال بھی رکھتا ہے۔ جسمانی خواہشات کو شیعہ علماء تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کو خطرناک بھی قرار دیتے ہیں اور سماجی نظام کے لئے تباہ کن بھی مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے قانونی حدود میں پابند کیا جانا چاہیئے اور اخلاقی دائرہ میں رہنا چاہیئے۔ ایران اور دوسرے مسلم معاشروں میں عورت اور مرد الگ رکھے جاتے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ فطری خواہشات کے سامنے اخلاقی اصول پارہ پارہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کوشش کی جاتی ہے کہ جنسی تفریق برقرار رکھنے کے لئے صرف اخلاقی اور قانونی ضوابط کی پابندی ہی نہ کرائی جائے بلکہ ایسا طریقہ بھی اختیار کیا جائے کہ دونوں جنسیں کہیں اکٹھی نہ ہو سکیں۔ یعنی انہیں پوری طرح قابو میں رکھا جائے۔

بظاہر مستقل شادی اور متعہ کی بیک وقت موجودگی میں تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن دراصل وہ ایک ہی نظریہ کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف تو شہوانی خواہش کی حقیقت کو تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف اسے مذہبی حدود کا پابند کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک سطح پر تو مرد اور عورت کے ملنے جلنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اور دوسری سطح پر ایسی قانونی اور مذہبی سہولت مہیا کی جاتی ہے کہ عورت اور مرد کا ملاپ آسان ہو جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ شادی کی اس مسلّمہ قسم پر جس میں خاصہ ابہام موجود ہے عمل کس طرح کیا جاتا ہے۔؟ اس خیال کو عملی شکل کیسے دی جاتی ہے کہ شہوانی خواہش تو ٹھیک ہے لیکن روزمرہ زندگی میں عورت مرد کو الگ رکھنا چاہیئے۔؟ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ فرد اس نظریہ اور عقیدہ کو اپنے مقاصد کے لئے کس طرح استعمال کرتا ہے۔؟ یعنی صاف لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ متعہ کون کرتا ہے؟ کون سی چیز لوگوں کو متعہ کی ترغیب دیتی ہے؟ اور مرد اور عورت متعہ

کے لئے کن حدود و قیود کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں؟

شیعہ علماء عصمت فروشی اور متعہ کی مماثلت کو کبھی اظہار بیان میں اور کبھی کھل کر تسلیم کرتے ہیں لیکن ان دونوں میں فرق اس طرح کرتے ہیں کہ فرد کی بھلائی اور معاشرتی نظام پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایران جیسے مطلق العنان اور عورت مرد کی علیحدگی اور مرد کی بالادستی تسلیم کرنے والے معاشروں میں طوائف کو سماج دشمن اور نافرمان عورت تسلیم کیا جاتا ہے۔ عصمت فروشی معاشرتی نظم و نسق کی خلاف ورزی مانی جاتی ہے' جو مروجہ قوانین کو چیلنج کرتی ہے۔ عصمت فروشی زنا ہے جسے قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ عصمت فروشی گناہ ہے اور غیر قانونی جنسی عمل ہے۔ اسے معاشرہ کے عام مزاج اور معیار کے خلاف مانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس متعہ کے بارے میں شیعہ علما کا خیال ہے کہ اس میں فرد جنسی ضرورت پوری کرتے ہوئے معاشرہ کی پابندیوں کا احترام کرتا ہے اور اس سے سماجی ڈھانچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ جو لوگ متعہ کرتے ہیں وہ گویا اسلامی اصولوں کا احترام کرتے ہوئے اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ متعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اخلاقی اور قانونی اعتبار سے ہی جائز ہے بلکہ اس سے بے اعتدالی پر قابو پانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

لیکن جہاں تک تہذیبی امتیاز کا سوال ہے متعہ اور عصمت فروشی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایران میں جنسی عمل پر پابندی اور اس کی اجازت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو متعہ اور مستقل شادی کے بارے میں عام تصور عصمت فروشی اور دینی حرمت و حلت کے درمیان ڈولتا نظر آتا ہے۔ متعہ کو ایران میں قانونی حیثیت حاصل ہے اور اسے حلال مانا جاتا ہے مگر اس کے باوجود کم سے کم 1979ء کے انقلاب تک اسے عوامی قبولیت حاصل نہیں تھی۔ مذہبی حلقوں سے باہر اس قسم کی شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایران کے زیادہ پڑھے لکھے متوسط طبقوں میں متعہ کو قانونی عصمت فروشی کا نام دیا جاتا تھا۔ ادھر مذہبی رجحان رکھنے والے عوامی حلقے اسے مغرب کے انحطاط پذیر معاشرہ کی جنسی آزادی کا ایسا نمونہ قرار دیتے تھے جسے مذہبی حلت دیدی گئی ہے۔ ایران میں حکومت کی پالیسیوں کے

ساتھ متعہ پسند اور ناپسند کا گراف بھی بڑھتا گھٹتا رہا ہے۔ پہلوی سلطنت [1952۔ 1979] نے اس بارے میں اپنا رویہ غیر جانبداری کا رکھا لیکن اسلامی انقلاب کے بعد حکومت نے متعہ کی کھلے عام حمایت کی اور اسے انسان کے جنسی عمل کے لئے ضروری قرار دے دیا۔ جواز کے لئے اسلامی شریعت کے شواہد بھی پیش کئے گئے۔

اگرچہ اکثر و بیشتر متعہ کی اخلاقی حیثیت کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا جاتا رہا ہے لیکن پچھلے چند سال سے اس کے حق میں بے شمار دلائل دیئے گئے ہیں اور بہت سے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ ان حوالوں میں متعہ کے مذہبی جواز کو ہی ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ متعہ کرنا ثواب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا اور ان کے کئی صحابیوں نے متعہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے شیعہ علماء اور رہنماؤں کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ ایک قول جو بار بار دہرایا جاتا ہے' وہ امام جعفر صادق کا یہ قول ہے کہ متعہ کے بعد "غسل جنابت کے ہر قطرہ سے ستر فرشتے پیدا ہوں گے جو قیامت کے دن اس شخص کی' جانب سے گواہی دیں گے جس نے متعہ کیا ہے۔" امام صادق کا ایک اور قول یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ "متعہ کے سلسلے میں' میں کبھی تقیہ پسند نہیں کرتا"

اس طرح امام جعفر صادق اور ان کے والد امام محمد باقر سے ایک اور واقعہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے امام سے سوال کیا کہ کیا متعہ کی شادی ثواب ہے' تو انہوں نے جواب دیا۔ "جو شخص اللہ کی خوشنودی کے لئے مذہب اور آنحضرت کی تعلیمات کے مطابق اور اس شخص کے حکم کی خلاف ورزی کے لئے (اشارہ حضرت عمر کی طرف ہے) متعہ کرتا ہے جس نے اس پر پابندی لگا دی تھی تو وہ اپنی متعہ والی بیوی سے جو بھی لفظ بھی بولے گا اللہ تعالیٰ اسے ثواب میں لکھے گا۔ وہ اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھائے گا تو اللہ ثواب لکھے گا۔ پھر جیسے ہی وہ وظیفہ زوجیت ادا کرے گا تو ویسے ہی خداوند تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دے گا۔ پھر وہ جب غسل جنابت کرے گا تو اللہ اس کے ہر اس بال کے برابر اسے ثواب دے گا جو غسل کے اس پانی سے تر ہو گا۔"

1979ء میں ایران میں اسلامی انقلابی حکومت کے قیام کے بعد متعہ کے سلسلے میں سرکاری پالیسی میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ اس سے پہلے عام ذہن میں متعہ کا تصور واضح نہیں تھا اور اس سلسلے میں عوام کا رویہ مبہم تھا۔ جو لوگ اس پر عمل بھی کرتے تھے وہ بھی زیادہ سے زیادہ کسی مولوی یا دوست سے اس کی شرعی حیثیت معلوم کر لیتے تھے۔ شہنشاہ کے دور میں جو لوگ متعہ کرتے تھے وہ اسے زیادہ سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ متعہ اس وقت بھی غیر قانونی نہیں تھا۔ لیکن عام لوگوں میں اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا' چنانچہ متعہ کرنے والے مرد عورت اسے کم ہی ظاہر کرتے تھے۔ لیکن اسلامی حکومت نے شروع ہی سے یہ منظم کوشش کی ہے کہ متعہ کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے' اس کی افادیت ثابت کی جائے' اسے معاشرہ کے لئے سود مند قرار دیا جائے اور موجودہ حالات میں اسے انفرادی اور اجتماعی طور پر ثواب کا کام قرار دیا جائے۔ ہائی اسکولوں' مساجد' مذہبی اجتماعات' اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس کے لئے باقاعدہ پروگرام ہوتے ہیں' جن میں اس کی افادیت اور اس کے ثواب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایران عراق جنگ میں چونکہ لاکھوں مرد ہلاک ہو گئے تھے اس لئے متعہ کی ضرورت کا اور بھی شدت سے احساس کیا جا رہا ہے۔

حال ہی میں حکومت نے جو مہم چلائی ہے اس میں اسے اسلام کا ایک "زبردست قانون" قرار دیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ کئی عورتوں کے ساتھ متعہ کے ذریعہ انسان [مرد] کی بنیادی ضرورت پوری کی جا رہی ہے۔ علما اسے مغرب سے انحطاط پذیر جنسی آزادی کا متبادل قرار دے رہے ہیں۔ وہ یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ متعہ یا عارضی شادی' مستقل شادی کے مقابلے میں ایک آسان چیز ہے۔ اس میں زیادہ ذمہ داری بھی قبول نہیں کرنا پڑتی۔ آیت اللہ خمینی نے آنحضرت کے زمانے اور ایران عراق جنگ کے زمانے کا تقابل کرتے ہوئے اعلان کیا کہ تمام مردوں کو جنگ کے شہداء کی بیواؤں سے متعہ یا مستقل شادی کرنا چاہیے۔ انہوں نے شہدا کی بیواؤں کو بھی ہدایت کی کہ وہ اس جنگ کے سپاہیوں سے شادی میں پس و پیش نہ کریں۔ ایرانی پارلیمنٹ کی خاتون رکن مریم بہروزی

نے متعہ کی افادیت کے بارے میں عورتوں کے اجتماعات میں تقریریں کیں اور انہیں ہدایت کی کہ وہ خود غرضی چھوڑ دیں اور اپنے شوہروں کی فطری خواہش کا احترام کریں [یعنی انہیں دوسری عورتوں سے متعہ کرنے دیں)

اسلامی حکومت نے متعہ کے حق میں اتنی زبردست مہم چلا کر عوام کو بھی اس کے بارے میں باشعور کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ ان کے ساتھ متعہ کے لئے عورتیں موجود ہیں۔ گویا انہیں ان باتوں سے باخبر کر دیا ہے جو پہلے مبہم اور غیر واضح تھیں۔

متعہ کی شادیوں کی تعداد ایران میں کیا ہے؟ اس کے بارے میں صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مردم شماری کے وقت مستقل یا عارضی شادی کا الگ الگ اندراج نہیں کیا جاتا۔ دوسرے ایسی شادیاں عام طور پر ظاہر نہیں کی جاتیں۔ 1978ء میں جب میں نے تہران میں سروے کیا تھا تو اس وقت اکثر لوگ کہتے تھے کہ متعہ کی رسم متروک ہو چکی ہے۔ لیکن قم اور مشہد میں لوگوں نے بتایا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یہ رسم متروک ہو گئی ہے 1981ء کے سروے سے پتہ چلا کہ متعہ کی شادیاں تیزی کے ساتھ رواج پا رہی ہیں اور یہ کام صرف مشہد جیسے مقدس مقامات پر ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی بڑھ رہا ہے۔

اس بارے میں مزید بات کرنے سے پہلے ان مقدس مقامات کی فضا اور ماحول کی وضاحت ضروری ہے جہاں اس قسم کا متعہ عام ہے۔ ایران میں مشہور ہے کہ اگر متعہ کرنا ہو تو قم یا مشہد جانا چاہئے۔ یہاں جو مزارات ہیں ان سے ملحق عمارتیں نہایت پیچ دار گلیوں پر مشتمل ہیں اور عمارتیں بھی خاصی بڑی بڑی ہیں۔ ان میں ہمیشہ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ ان مقامات پر عورت کے لئے لازم ہے کہ وہ حجاب میں رہے۔ ان مقامات کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہاں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ جب تک وہ درگاہ کے اندر یا درگاہ کی غلام گردشوں میں عبادت کرتے ہیں اس وقت تک تو مرد عورت الگ الگ ہوتے ہیں، لیکن جب وہ سنہری جالی کو چومنے جاتے ہیں تو ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ اس

مقام پر اور اس سے باہر ایک دوسرے سے اتنے قریب رہنے کی بنا پر جسمانی حدت اور جسمانی خوشبو ایک دوسرے کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے اور خواہشات وہاں اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ وہاں روحانی تسکین ہی اصل مقصد ہوتا ہے لیکن انسانی خواہشات سے بہر حال مفر نہیں ہے اور مرد اور عورت کی قربت' اشتہا میں اضافہ کرتی ہے۔

اسلامی حکومت کے زمانے بھی خواہشات کا یہ عمل اور حجاب کی خلاف ورزی جاری رہی۔ چنانچہ اسلامی حکومت نے مستحکم ہونے کے فوراً بعد مرد اور عورتوں کی عبادت کے لئے مختص حصوں کے درمیان شیشے کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اب عورت اور مرد کو وہاں جمع ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن مرد اور عورت کو اس طرح ایک دوسرے علیحدہ کرنے کی پالیسی کی وجہ سے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس اور بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ مرد کی نظر عورتوں کی طرف اور عورتوں کی نظر مردوں کی طرف ضرور جاتی ہے۔

ان مزارات پر ہر وقت عورتوں اور مردوں کا جو ہجوم رہتا ہے اور ایک دوسرے کی قربت جس طرح حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ سے متعہ کرنے میں زیادہ سہولت مل جاتی ہے۔ جو لوگ متعہ کرنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ کسی کی وساطت سے یہ کام آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ قم اور مشہد میں گزارا۔ وہاں میں نے اندازہ لگایا کہ ان عظیم درگاہوں کی دو خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ یہ خصوصیات ان مقامات کی ندرت' ان کا نادر تجربہ' وہاں کے لوگ اور ان کی گمنامی ہے۔ جو زائرین وہاں جاتے ہیں وہ اپنی دنیا اور دنیوی آلائشیں اپنے پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ وہاں روز مرہ کی زندگی سے انکا کوئی ناطہ نہیں ہوتا۔ وہاں انہیں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ان کے اپنے علاقے کے نہیں ہوتے بلکہ دوسرے شہروں اور دوسرے گاؤوں کے ہوتے ہیں۔ چونکہ وہاں لوگ "عبوری حالت" میں ہوتے ہیں اس لئے وہ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ متعہ کی شادی کر لیں اور پھر بھی "گمنام" رہیں کیونکہ وہاں تو انہیں کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ زیارتوں میں اپنی حدود کا احساس اصل چیز ہوتا ہے۔ کہ ہمیں کس حد تک

جاتا ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے زائرین جتنا بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

جو عورت متعہ کے لئے موزوں یا دستیاب ہوتی ہے اسے اصطلاح میں "زن صیغہ" کہا جاتا ہے۔ اس زن صیغہ کو کیسے پہچانا جاتا ہے؟ یا ایسی عورت کسی مرد کو اپنی جانب کیسے راغب کرتی ہے؟ اس کا انحصار عورت مرد کی ذاتی چالاکی اور پرانی داستانوں سے واقفیت پر ہوتا ہے۔ میری توقعات کے خلاف مجھے بتایا گیا کہ عورتیں کسی طرح اس معاملے میں پیش قدمی کرتی ہیں اور کس طرح متعہ کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔مثال کے طور پر جو عورت یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ متعہ کے لئے حاضر ہے تو وہ اپنی چادر الٹی طرف سے اوڑھتی ہے۔ یا پھر وہ اپنی نقاب اس طرح اٹھاتی ہے کہ اس سے اس کی خواہش کا اظہار ہو جائے۔ اس کے علاوہ عورت کی چال ڈھال سے بھی اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جو عورت بے مقصد گھوم رہی ہو یا چلتے ہوئے بار بار مڑ کر دیکھ رہی ہو وہ بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جو عورت زیادہ پردہ کئے ہوتی ہے اور زیادہ پوشیدہ ہوتی ہے وہ متعہ کے لئے زیادہ تیار ہوتی ہے۔ البتہ براہ راست رابطہ کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مشہد کے ایک عالم امین آقا کا بیان ہے کہ "جو کوشش کرتا ہے وہ ضرور پالیتا ہے۔ (کل من جد وجد)

میں نے اپنا بیشتر وقت قم اور مشہد میں گزارا۔ قم ایک بیزار کن شہر ہے جو ریگستان نمک کے قریب واقع ہے۔ یہ تہران سے 135 کلو میٹر جنوب میں ہے۔ یہاں آٹھویں امام رضا کی بہن معصومہ کا روضہ ہے۔ اسلامی انقلاب سے قبل ایران کا یہ واحد شہر تھا جہاں عورت کے لئے مکمل پردہ لازم تھا۔ باپردہ عورت کی طرح قم کی بھی اپنی کوئی پہچان نہیں ہے وہ بالکل بے وضع شہر ہے۔ ایران میں مذہبی تعلیم کے جو دو مرکز ہیں' قم ان میں سے ایک ہے۔ عام طور پر اسے "شہر صیغہ" کہا جاتا ہے حالانکہ علما اس نام سے بہت ناراض ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مشہد مذہبی اور سیاسی طور پر زیادہ متنوع شہر ہے۔ یہ شہر صوبہ خراسان میں واقع ہے اور ایران کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ اسے

ملک کے خوش حال اور گنجان آباد شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیعہ مذہب کے آٹھویں امام رضا کا عظیم الشان روضہ اس شہر کی سب سے بڑی خاصیت ہے۔

پیچ دار عمارتوں' انکی بارہ دریوں اور غلام گردشوں میں ایسے مخصوص مقام واقع ہیں جہاں عارضی شادی کی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ جو مرد اور عورت متعہ کرنا چاہتے ہیں وہ ان مقامات پر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان مقامات میں مسجد کا کوئی گوشہ' بجلی کا کوئی کھمبہ' کوئی خاص دروازہ' یا کوئی کھڑکی ہو سکتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ بدنام جگہ "پنجرہ فولاد" [فولاد کی کھڑکی) ہے یہ زمین سے دیوار تک جانے والی کھڑکی ہے جو روزہ کے صحن میں واقع ہے۔ وہاں سے روضہ صاف نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو عورتیں متعہ کراتی ہیں وہ یہاں گھومتی پھرتی پائی جاتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو "صیغہ رو" کہا جاتا ہے۔ وہ خود مردوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں یا متعہ کے خواہش مند مرد خود ان سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ جگہ اتنی بدنام ہے کہ فارسی زبان میں قابل اعتراض جنسی تعلقات کے لئے ایک محاورہ بن گیا ہے۔ ان سرگرمیوں کو "زیر پنجرہ فولاد" سرگرمیاں کہا جاتا ہے۔

قم اور مشہد کی طرح عراق کا شہر نجف بھی متبرک حیثیت رکھتا ہے۔ عراق میں بعث پارٹی کی حکومت سے قبل 1950ء کی دہائی تک نجف' متعہ کے معاملے میں قم اور مشہد پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ وہاں قم اور مشہد سے بھی زیادہ متعہ کی شادیاں ہوتی تھیں۔

ان مشہور شہروں کے علاوہ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی متعہ کی شادیاں ہوتی ہیں البتہ ان کی تعداد کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تہران کے بعض علاقے اس معاملے میں زیادہ مشہور ہیں۔ ایران کے جنوب میں شاہ عبدالعظیم کا روضہ اس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ روضہ رے کے قدیم شہر میں واقع ہے۔ ادھر یورپ اور امریکہ میں بھی شیعہ حضرات متعہ کی شادیاں کرتے ہیں۔

1978ء کے موسم گرما میں مجھے قم کے ایک ایسے خاندان کے ساتھ

ٹھہرنے کا موقع ملا جو میرے دادا کا واقف تھا۔ چونکہ میں ایک ایرانی عورت تھی اور پھر میرے دادا مشہور آیت اللہ تھے اس لئے اس خاندان اور اس محلے کے لوگوں نے مجھے بخوشی قبول کیا بلکہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میں نے ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں سے کھل کر بات کی۔ میں نے عورتوں کے مذہبی اجتماعات میں بھی شرکت کی جو ان دنوں بہت مقبول ہو رہے تھے۔ میں نے مبلغ خواتین کے انٹرویو کیے اور ان سے اجتماعی اور انفرادی طور پر بات چیت کی۔ حضرت معصومہ کے روضے اور آیت اللہ شریعت مداری کے گھر پر جمع ہونے والی عورتوں میں بھی گھل مل جاتی تھی۔ میرے والد چونکہ آیت اللہ کے بیٹے تھے اس لئے انہوں نے اس زمانے کے دو بڑے آیت اللہ' آیت اللہ نجفی رعشی اور آیت اللہ شریعت مداری سے میری ملاقات کا اہتمام کر دیا تھا۔ وہ قم میرے ساتھ ہی گئے تھے اور کئی ملاقاتوں میں وہ میرے ساتھ ہی رہے۔ اس وجہ سے میری بھی عزت کی جاتی تھی اور اسی وجہ سے مجھے ملاقاتوں اور انٹرویو وغیرہ میں سہولت رہی۔

میں روضہ پر ایسے مقامات پر چلی جاتی تھی جہاں اس قسم کی عورتیں ہوتی تھیں یا جہاں ملّا موجود ہوتے تھے۔ میں ایسی جگہ جاتی جہاں ملّا بیٹھے ہوتے' ان کے گرد عورتیں اکٹھی ہوتیں اور اپنے مسائل بیان کرتیں اور ان سے ہدایات حاصل کرتیں۔ بعض فقہی اور شرعی مسائل تو ایسے ہوتے جنہیں سن کر مجھے شرم آ جاتی۔ مگر عورتیں ان پر کھل کر سوال کرتیں۔ عام طور پر یہ سوالات بچوں کی پرورش' شوہروں کے ساتھ تعلقات' اپنی سوکن کے ساتھ رشتے اور مذہبی فرائض کی ادائیگی سے متعلق ہوتے۔ مولوی اس پر کھل کر صاف صاف بات کرتے۔ اس وقت میں بھی ملّا سے یا عورتوں سے سوال کرتی۔ ملّا سے بات کرتے وقت میں اس بات کا خیال رکھتی کہ اس کے پیروکاروں کی زیادہ تعداد وہاں موجود نہ ہو ورنہ بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں عام طور پر پختہ عمر کی عورت سے بات کرتی کیونکہ نو عمر عورت کے مقابلے میں متعہ کے بارے میں اس کا تجربہ اور معلومات زیادہ ہوتی ہیں۔ قانونی طور پر کنواری عورت کے لئے متعہ کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن چونکہ ایران میں شادی کے وقت عورت کے کنواری ہونے کو بہت اہمیت دی جاتی

ہے اس لئے کنواری لڑکیاں متعہ نہیں کرتیں۔ قم کی جن پانچ عورتوں سے میں نے بات کی انہوں نے اصولی طور پر تو متعہ کی حمایت کی لیکن ذاتی طور پر انہوں نے متعہ کو پسند نہیں کیا۔ ان کا بیان تھا کہ متعہ کے بعد عورت کی شہرت اچھی نہیں رہتی اور اس کے بعد مستقل شادی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

بہت سے مرد اور زائر خواتین میرے دوست بن گئے اور انہوں نے میرے ساتھ کھل کر بات کی۔ میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں شادی کے مختلف طریقوں پر کتاب لکھ رہی ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے متعہ کیا ہو یا پھر وہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھے البتہ ان میں سے اکثر ایسے لوگوں کو جانتے تھے جنہوں نے متعہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں انہوں نے مجھے بہت تفصیل کے ساتھ بتایا۔ میں نے روضہ کی خادماؤں سے بھی بات کی اور ان سے بھی اس بارے میں پوچھا۔

میں 1981ء میں دوبارہ قم گئی۔ اس وقت تک حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے تھے۔ میری میزبان کا شوہر ایک سال پہلے فوت ہو چکا تھا اور اسے ہر وقت یہ پریشانی رہتی تھی کہ وہ چونکہ نسبتاً کم عمر ہے اس لئے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ایک بار میرے جاننے والے ملا مجھ سے ملنے آئے تو میری میزبان اس ڈر سے گھر چھوڑ کر چلی گئی کہ محلے والے کیا کہیں گے کہ ایک مرد اس کے گھر آیا ہے۔ بعد میں مجھے بھی اندازہ ہوا کہ میری اس حرکت نے مجھے بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ پاسداران انقلاب مجھے بھی بدکرداری کے الزام میں پکڑ سکتے تھے۔ اس کے بعد میں بہت محتاط رہنے لگی۔

لیکن متعہ کی شادی کی اہمیت کا اندازہ صرف اعداد و شمار سے ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایرانی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 1962 سے 1971 تک پہلی بار متعہ کرنے والے مردوں کی تعداد 1146 تھی جبکہ وہ پہلی بار متعہ کرنے والی عورتوں کی تعداد 1105 تھی۔ لیکن اسی عرصے میں دوسری بار متعہ کرنے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ یعنی یہ تناسب 198 - اور 60 کا تھا مختلف زمانوں میں متعہ کی شادیوں کی تعداد میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اکثر ایرانی عوام کا ذہن صاف نہیں تھا حتیٰ کہ جو لوگ متعہ کرتے تھے وہ بھی اس

کے بارے میں شکوک میں مبتلا نظر آتے تھے۔ متعہ کی حلت اور حرمت کا سوال تو اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ شیعہ معاشرہ اس کا وجود تسلیم کرتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو معاشرہ مرد عورت کے آزادانہ ملاپ کی اجازت نہیں دیتا اور جنسی اختلاط کو گناہ گردانتا ہے وہ صرف ایک نجی ملاقات میں ہی متعہ کا معاہدہ کر کے جنسی اختلاط کو جائز اور حلال قرار دے دیتا ہے، گویا متعہ کا لفظ استعمال کرتے ہی عصمت فروشی کا دھبہ دھل جاتا ہے۔

میں نے مختلف عمر اور مختلف پس منظر رکھنے والی چالیس سے زیادہ عورتوں سے ملاقات کی اور ان میں سے تیرہ کے ساتھ تفصیلی بات چیت کی۔ ان میں سے آٹھ نے تو ایک بار یا اس سے زیادہ متعہ کئے تھے اور پانچ ایسی تھیں جن کے شوہروں نے دوسری عورتوں کے ساتھ متعہ کیا تھا اور ان کی سوکنیں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جن مردوں سے میں نے معلومات کیں ان میں سے زیادہ تر ملّا تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ تو میری ملاقات قم یا مشہد کے روضوں میں ہوئی اور کچھ سے میری ملاقات ان ملّاؤں نے کرائی۔ میں نے جب بھی کسی سے کہا کہ مجھے ایسے مرد سے ملاؤ جس نے متعہ کیا ہو تو عام طور پر مجھے کسی ملّا کا پتہ دیا جاتا تھا کیونکہ عام طور پر مذہبی رہنما ہی زیادہ متعہ کرتے ہیں۔ یہ ملّا جنہیں ایران میں "روحانیوں" کہا جاتا ہے متعہ کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ وہ شرع اور فقہ کا علم زیادہ رکھتے ہیں اس لئے وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں نے ان سے بات کی تو انہوں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس سلسلے میں مجھے معلومات بہم پہنچائیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے لوگ متعہ نہیں کرتے۔

ملّا چونکہ مذہبی نمائندے ہوتے ہیں اور مذہبی رسوم و رواج میں وہی رہنمائی کرتے ہیں اس لئے مساجد، مزارات اور گھروں میں ہونے والی مذہبی تقریبات میں وہ ضرور شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح انہیں مختلف خاندانوں اور ان کے افراد کے بارے میں زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔ اس سے ان کی پوزیشن مضبوط ہو جاتی ہے اور عورتیں اور مرد سب ان کی مدد حاصل کرتے ہیں۔

چونکہ متعہ کے بارے میں مکمل اعداد و شمار موجود نہیں ہیں اس لئے

اس رسم کے معاشرتی اور ثقافتی اثرات کا جائزہ لینا بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ ایران میں متعہ کی معاشرتی تاریخ مرتب کرنے کے لئے میں نے دوسرے حوالوں سے استفادہ کیا ہے۔

مغربی سفارت کاروں' سیاحوں اور مشنریوں کی یادداشتوں سے ہمیں متعہ کے بارے میں کچھ جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ ان میں موریئر [1855] شیل [1856] ٹننگ [1857] سولیز [1866] کوزن [1892] اور براؤن [1893] شامل ہیں لیکن ہمیں ان یادداشتوں سے متعہ کرنے والے فریقین کی عمروں یا ان کے سماجی' پیشہ ورانہ اور تعلیمی پس منظر کا علم نہیں ہوتا۔ اس قسم کی شادیوں میں جنسی تلذذ کا جو عنصر شامل ہے اس نے ان لوگوں کو چٹ پٹی کہانیاں گھڑنے کا بھی خوب موقع دیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے اکثر سنی سنائی باتوں پر بھی اعتبار کیا ہے۔ ڈی لوری نے لکھا ہے۔ "نچلے طبقے کی عورتیں جو "صیغہ" کہلاتی ہیں وہی اس قسم کی شادیاں کرتی ہیں" کوزن نے تو مشہد کے بارے میں لکھا کہ وہ "ایشیا بھر میں سب سے زیادہ اخلاق سے و شرافت سے عاری شہر ہے کیونکہ وہاں سب سے زیادہ متعہ ہوتے ہیں۔"

ڈی لوری نے اپنی کتاب "Queer Things About Persia" میں متعہ کو قبل از اسلام کے ایرانی رواج کا متبادل قرار دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ۔ "متعہ ایران میں زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ مشہور ایرانی سورما رستم نے شکار کھیلتے ہوئے بادشاہ کی بیٹی تہمینہ سے متعہ کی شادی ہی کی تھی جس سے سہراب پیدا ہوا۔" "اس کے بیس سال بعد بینجمن نے بھی اسی داستان کا حوالہ دیا۔ لیکن ان دونوں نے رستم اور تہمینہ کے درمیان شادی کو متعہ اس لئے تصور کرلیا کہ وہ دونوں بہت کم عرصے ساتھ رہے تھے۔ ادھر چونکہ شیعہ مسلمانوں کو مجوسی عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لئے بنجمن نے یہ بھی فرض کرلیا کہ شادی کا یہ طریقہ مجوسیوں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

تاہم قبل از اسلام کے مجوسیوں یا زرتشت کے ماننے والوں میں تعددِ ازدواج کا جو طریقہ رائج تھا اسے البتہ قبل از اسلام کے عرب رواج کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ قبل از اسلام ایران میں

عارضی شادی کا رواج تھا لیکن وہ متعہ سے مشابہت نہیں تھا۔ مجوسیوں میں یہ رواج تھا کہ کوئی شوہر یا خاندان کا سربراہ اپنی بیوی یا اپنی بیٹی کو اپنی برادری کے کسی مرد کی درخواست پر عارضی طور پر اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ ایک خاص مدت کے لئے اس کی بیوی بنتی تھی۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ عورت اصل میں پہلے شوہر کی ہی بیوی رہتی تھی۔ اس عارضی شادی سے جو بچے ہوتے تھے وہ مستقل شوہر کے ہی مانے جاتے تھے۔

مغربی مفکروں نے تو اس پر بہت غور کیا ہے لیکن ایرانی مفکروں اور دانشوروں نے متعہ کی شادی کے سماجی اور ثقافتی اثرات پر زیادہ توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ 1906ء کے آئینی انقلاب نے دانشوروں میں پردہ' بچوں کی شادی' اور عورتوں کے لئے تعلیم کی کمی کے مسائل نے زبردست جوش و جذبہ پیدا کیا تھا۔ لیکن متعہ اور اس کے اثرات کے بارے میں مشکل سے ہی کسی نے کچھ لکھا ہے۔ ہاں' ایرانی ناول نگاروں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور عورتوں پر اس کے منفی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مشفقی کاظمی نے اپنے 1961ء کے ناول "تہران مخفوف (ہیبت ناک تہران) میں ضمنی موضوع کے طور پر ایک ایسی عورت کی داستان بیان کی ہے جو اپنی مرضی کے خلاف متعہ کی رسم کا شکار ہو جاتی ہے۔ دوسرے ناول نگار چیک نے اپنے طویل افسانے "سنگ صبور" میں متعہ کرنے والی ایک عورت کی موت کی کہانی سنائی ہے لیکن اس نے اس عورت کی زبان سے کچھ بھی نہیں کہلوایا کیونکہ کہانی کے شروع میں ہی وہ عورت قتل ہو جاتی ہے۔

علی احمد نے اپنے افسانے "جشن فرخندہ" میں ایک مولوی کی کہانی بیان کی ہے جسے 1936ء میں آزادی نسواں کے سرکاری جشن میں شرکت کا حکم ملتا ہے۔ وہ پردہ کے خلاف حکومت کے نئے حکم کو تسلیم نہیں کرتا لیکن اس حکم کی خلاف ورزی بھی نہیں کر سکتا اس لئے وہ یہ چکر چلاتا ہے کہ اپنے دوست کی بیٹی سے دو گھنٹے کے لئے متعہ کر لیتا ہے اور اس لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر بے پردہ درباری جشن میں لے جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنی اصل بیوی کو بے پردہ نہیں کرتا اور اس طرح وہ پردہ کے خلاف سرکاری حکم سے بغاوت کرتا ہے۔

گلستان نے اپنے ڈرامہ "سفرِ عصمت" میں متعہ اور عصمت فروشی میں مماثلت تلاش کرتے ہوئے ایک طوائف کو اپنے پیشے سے توبہ کرتے اس طرح دکھایا ہے کہ وہ متعہ کر لیتی ہے۔ اس معاملے میں اس کی رہنمائی' ایک خوش شکل مّلا کرتا ہے۔ اس طرح جمال زادہ نے "معصومہ شیرازی" میں ایک بدنام زمانہ "زنِ صیغہ" کی روحانی عظمت کے مقابلے میں ایک بلند پایہ مّلا کی روحانی خباثت کی دھجیاں اڑائی ہیں۔

شہنشاہ کے آخری زمانے میں متعہ پر مختلف حلقوں کی طرف سے شدید نکتہ چینی شروع ہو گئی تھی۔ عورتوں کا مشہور رسالہ "زنِ روز" بھی اس مہم میں شامل تھا۔ لیکن مولویوں کی طرف سے اس مہم کی زبردست مخالفت کی گئی تھی۔ اس میں پیش پیش آیت اللہ مطہری تھے۔

اس مسئلے کا عمرانی طور پر کبھی جائزہ نہیں لیا گیا البتہ اس پر مذہبی نقطہ نظر سے بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ان تمام کتابوں میں اس کی مذہبی اہمیت واضح کی گئی ہے اور اسے کئی اعتبار سے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں خاندان' شادی اور عورت کے حوالے سے گفتگو کی جاتی ہے۔ سنی مسلمان اس قسم کی شادی کو زنا قرار دیتے ہیں جس کے جواب میں بھی اس کی افادیت کے لئے بے شمار دلائل دیئے جاتے ہیں۔ ادھر مغرب اور خود ایرانی دانشوروں کی طرف سے اس کی مخالفت زیادہ بڑھی ہے تو اب متعہ کے لئے یہ دلیل دی جانے لگی ہے کہ موجودہ زمانے [ایران عراق جنگ میں مردوں کی بڑی تعداد کی ہلاکت کے بعد) اس کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

لیکن یہاں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ متعہ' جنسی تعلقات' عورت اور مرد کے رشتے اور جنس کے بارے میں جتنا بھی لکھا گیا ہے اس کے لکھنے والے سب مرد ہی ہیں۔ اس مسئلے پر خواہ ہمدردانہ غور کیا گیا ہو یا اس کی مخالفت کی گئی ہو وہ سب مردانہ تناظر میں ہی لکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں عورتیں کیا سوچتی ہیں ان کا ردعمل کیا ہے؟ اسے بالکل غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ آج تک عورتوں کے نقطہ نظر کو بالکل سامنے نہیں لایا گیا ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر اور عورت

ژواں ایڈورڈ کامیو

جدید زندگی میں مکانوں کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ وہ اپنے رہنے والوں کو پناہ یا سر چھپانے کی جگہ فراہم کرتے ہیں لیکن فن تعمیر پر مذہبی اثرات کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جدید تہذیب سے پہلے کے مکانوں میں مذہبی تقاضوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ مقامی تہذیب اور مذہب مل کر مکان کی ہیئت کا تعین کرتے تھے۔ تصور یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ مکان یا گھر پر اصل عمل داری عورت کی ہوتی ہے اس لئے مکان کی تعمیر میں عورت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ مذاہب عالم کے مورخ پروفیسر ژواں ایدوارود کامیو نے اسلامی فن تعمیر کا مطالعہ کرتے ہوئے مسلم ملکوں خاص طور سے مصر میں مکانوں کی تعمیر اور اس کے حوالے سے گھریلو زندگی میں مذہبی علامتوں کی موجودگی کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مسلم ملکوں میں مکان کا مرکز و محور عورت ہے جو "حریم" بھی ہے اور "حرم" بھی جیسے مکان "حرم" ہے۔(مترجم)

مصر میں کہا جاتا ہے "البیوت لہا حرمتہ" یعنی مکانوں کی اپنی حرمت ہوتی ہے۔ مسلم ملکوں یا مصر میں گھر کو جو عزت اور احترام دیا جاتا ہے اس کا اظہار جس خوبصورتی کے ساتھ اس کہاوت میں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ معانی کے اعتبار سے اس کہاوت کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ کسی مکان میں داخل ہونے سے پہلے اس میں رہنے والوں کی عزت اور حرمت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کی ضرورت خاص طور سے اس لئے بھی ہوتی ہے کہ گھر پر اصل میں عورت کی عمل داری ہوتی ہے اجازت کے بغیر کسی گھر میں داخل ہونا' یا غلط انداز سے داخل ہونا اور پھر عورت کا نام اس طرح زور سے لینا کہ باہر بھی لوگ سن لیں' یا بدتمیزی سے بولنا یا کسی گھر میں جھانکنا' اس مکان اور اس مکان میں رہنے والوں کی بے حرمتی ہے۔ یہ حرکات ایسی ہیں جن کی اجازت کسی حالت میں بھی

نہیں دی جا سکتی۔ مسلمانوں کے نزدیک عورت کی حرمت اور مکان کی حرمت میں بہت ہی قریبی رشتہ ہے - اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حرم اور حریم کے الفاظ عورت اور مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں الفاظ عزت و شرف کے الفاظ ہیں۔ مکان کی عزت و حرمت کا اصل مرکز و محور عورت ہی ہوتی ہے۔ عوت جو ماں ہے' بہن ہے' بیوی ہے اور بیٹی ہے' چنانچہ اس طرح دیکھیں تو اس کہاوت کے ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ مکان کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ اس میں عورتیں رہتی ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ چونکہ مکان کی اپنی حرمت ہے اور اس کا تعلق شادی شدہ عورتوں سے ہوتا ہے اس لئے اس رہائشی جگہ اور عورت کا تعلق باہر کی دنیا سے منقطع ہو گیا۔ مکانوں کی تعمیر میں یہ تصور شامل ہوتا ہے کہ اس میں دوسرے بھی داخل ہوں گے' باہر سے اندر اور اندر سے باہر بھی دیکھا جائے گا اس میں رہتے ہوئے بات چیت بھی کی جائے گی۔ اوائل اسلام میں مکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں جو تصورات ملتے ہیں ان میں بھی مہمان نوازی اور لوگوں سے ملنے جلنے کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ہاں' اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل ہونے کی کبھی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بات بظاہر متضاد سی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر حرمت کا تصور عورت تک محدود کر دیا جائے تو اس میں بھی تضاد نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے کوئی عورت شادی کے بعد دوسرے لوگوں کی نظروں کے لئے ممنوعہ بن گئی ہے ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات غلط بھی نہیں ہے اس لئے کہ کسی عورت کو دیکھنے یا اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے چند شرائط کی بہرحال پابندی کرنا پڑتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے حرمت ایک ایسا لفظ ہے جسے عام مسجد سے لے کر خانہ کعبہ اور مسجد نبوی تک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عام مسلمان اپنے مکان کی حرمت کے لئے جو جذبہ رکھتے ہیں اگر انہیں خانۂ خدا اور مسجدِ نبویؐ تک توسیع دے دی جائے تو احترام کے درجہ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام اس معاملے میں مقامیت کا قائل نہیں ہے۔ یہ حرمت کسی ایک مقام سے ماورا ہو جاتی ہے۔ اب اسے اس طرح دیکھئے کہ عام مساجد' خانۂ کعبہ

اور مسجد نبوی میں کسی کے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ چنانچہ جب اس حوالے سے "حرم" یا حرام کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد بھی یہ ہوتا ہے کہ چند شرائط کے ساتھ ان میں داخل ہونے کی عام اجازت ہے۔

عرب مسلمان ممالک یا مصر میں حرمت عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور شرف مردوں کے ساتھ۔ یعنی مرد کا شرف یہ ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو تحفظ فراہم کرے اور گھر کے اندر رہنے والی خواتین کی ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمسائیگی اور مہمان نوازی کا بھی خیال رکھیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے میں اس بات کا لحاظ رکھیں کہ کوئی بات عورتوں کو "عار" محسوس نہ ہو اور کوئی فضیحتہ نہ ہو جائے۔ (یہ دونوں لفظ اردو میں بھی انہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں) مرد کی بے عزتی اور بدنامی اس کی بیٹی کی شادی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ برادری میں بھی اس پر لعن طعن ہو سکتی ہے۔

اسی طرح عورت کا کوئی کام' کوئی لباس یا اس کی بات چیت بھی خاندان کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر عورت دوسروں کے سامنے مرد کی سبکی کرے' یا بے شرمی والا لباس پہنے' تو بھی شوہر اور پورے خاندان کی بدنامی ہوتی ہے۔ کسی لڑکی کی بے حیائی اس کی اپنی بہنوں اور اس کی اپنی شادی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اگر مجبوراً کسی بدنام عورت سے شادی کر لے تو یہ بدنامی اس کی بیٹیوں کو بھی متأثر کرتی ہے۔

یہ نظریات اور یہ عقائد ایسے ہیں جن کی وجہ عورت اپنی عافیت اسی میں محسوس کرتی ہے کہ وہ گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی بند رہے' اپنی ساری زندگی امور خانہ داری تک ہی محدود رکھے اور گھر کے باہر لوگوں سے کم میل جول رکھے۔ عام طور پر مرد نسبتاً گھر سے باہر زیادہ اختیارات رکھتا ہے لیکن اگر وہ دولت مند اور اثرورسوخ والا نہ ہو تو اسے بھی اپنے رشتے داروں' دوستوں' ساتھیوں اور سرکاری محکموں کے ساتھ روز مرہ کے تعلقات میں بے شمار پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مرد بھی بہت کم کسی دوسرے کے گھر میں جاتا ہے۔ اسے دوسروں کے گھر کی حرمت اور اس کے گھر والوں کے شرف کا خیال رکھنا پڑتا

ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ گھر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مرد کو مکمل بالا دستی اور کامل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ باہر اسے جن پابندیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں وہ ان کی پروا نہیں کرتا ـــــ عرب میں مرد کو گھر کا "رب" کہا جاتا ہے جو خدا کی صفت بھی ہے [پاکستان میں شوہر مجازی خدا ہوتا ہے) لیکن اس کے باوجود مرد کو اپنی بالادستی گھریلو سلطنت کے ضوابط کے تابع کرنا پڑتی ہے۔اس سلطنت میں حکمرانی ماں، بیوی، بہنوں اور بیٹیوں کی ہوتی ہے۔ گھر کے سارے اخراجات عام طور پر عورت کے ہاتھ میں ہی ہوتے ہیں۔

عورت اپنے کسی لفظ، کسی عمل یا کسی جسمانی حرکت سے مرد کی اس بالادستی کو چیلنج بھی کر سکتی ہے۔ اس سے عورت اپنی نظر میں باعزت اور بالادست ہو جاتی ہے اور مرد سب کے سامنے اپنی سبکی محسوس کرتا ہے۔ یہ کام عورت اس طرح کرتی ہے کہ وہ مرد کے دوستوں کی پوری طرح خاطر مدارت نہیں کرتی، سب کے سامنے وہ مرد کے کردار پر نکتہ چینی کرتی ہے یا اس کی مردانگی پر حرف زنی کرتی یا پھر سب کے سامنے شکایت کرتی ہے کہ وہ گھر کا خرچہ نہیں دیتا۔ ظاہر ہے اس سے شوہر کی عزت کم ہوتی ہے اور عورت اپنی برتری کا احساس کرتی ہے۔ لیکن یہ باتیں ہیں خطرناک۔ اس پر مار بھی پڑ سکتی ہے اور طلاق کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ یہ صرف عرب معاشرے میں ممکن ہے پاکستانی معاشرے میں کسی اور کے سامنے مرد کی برائی طلاق پر منتج ہوتی ہے۔

عام عمارتوں کو حرمت اور شرف بخشنے کے لئے جو تقریبات منعقد کی جاتی ہیں ان میں نئے مکان کا افتتاح، کسی دوسرے مکان میں منتقل ہونے کی خوشی، یا پھر شادی بیاہ کی تقریبات شامل ہیں، شمالی افریقہ اور بحر روم کے علاقوں میں قاعدہ یہ ہے کہ جب مکان کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اس میں کھجوریں، اناج، آٹا، نمک اور کبھی کبھی چاندی سونا رکھا جاتا ہے۔ جب پہلی دیوار اٹھائی جاتی ہے، یا چھت ڈالی جاتی ہے، اس وقت صدقہ دیا جاتا ہے یا پھر مکان مکمل ہونے پر بکرا یا مرغ ذبح کیا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر دیوار میں قرآن رکھنے کا رواج بھی ہے۔ عورتیں

جب پہلی بار مکان میں داخل ہوتی ہیں تو اپنے ساتھ چاول' پکانے کا تیل' یا روٹی لے کر داخل ہوتی ہیں۔ گھر کا سربراہ داخل ہونے سے پہلے سفید چقندر کے پتے دہلیز پر رکھتا ہے۔ وہ پہلا قدم ان پتوں پر رکھتا ہے۔ مصر میں اسے "سبز قدم" کہا جاتا ہے (اردو والا سبز قدم اس کے متضاد ہوتا ہے) یہ ساری چیزیں شگون کے لئے ہوتی ہیں اور علامتی معنی رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے ان کا تعلق عقائد سے ہے۔

تبرک کے لئے مکان میں پہلے قرآن بھی داخل کیا جاتا ہے۔ مکان میں رہائش اختیار کرنے کے بعد سب سے پہلے قرآن خوانی کرائی جاتی ہے۔ (یہ قاعدہ پاکستان میں بھی رائج ہے)

یہاں مکان بنانے کا مطلب صرف رہائش کے لئے جگہ مہیا کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس مکان میں شادیاں کرنا' بچے پیدا کرنا اور اپنے دینی فرائض ادا کرنا بھی ہوتا ہے۔ مکان اور عورت کے باہمی رشتے کا اظہار ان دونوں کی حرمت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس طرح کوئی غیر مرد کسی گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی غیر مرد کسی عورت کے ساتھ تعلق نہیں رکھ سکتا حتیٰ کہ کوئی ایسی صورت حال بھی پیدا نہیں ہونے دی جاتی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے ساتھ کسی گھر میں داخل ہوتا دیکھا جائے۔ اس قربت کا اظہار صرف شادی کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ دونوں کی بدنامی ہو جاتی ہے۔

گھروں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ عورت گھر سے باہر کبھی کبھی ہی نظر آتی ہے۔ یہ پابندی اس کی اپنی ذات کو باہر آنے سے بھی روکتی ہے۔ مصر میں کہا جاتا ہے "شادی عورت کے لئے حفاظتی پردہ ہوتی ہے۔" مکان کے اندر جو تقریبات ہوتی ہیں ان میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ وہاں بھی عورت زیادہ نظر نہ آئے۔ اس وقت عورتوں کے لئے مکان کا ایک حصہ مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ وہ مکان کے وسطی حصے میں بٹھائی جاتی ہیں اور مردوں کو دروازہ کے قریب بٹھایا جاتا ہے جہاں سے وہ رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے مکانوں کی تعمیر اس طرح کی جاتی ہے کہ اس علیحدگی اور پردہ کا اہتمام آسانی سے ہو سکے۔

گھر میں غسل خانہ کو ناپاک جگہ تصور کیا جاتا ہے۔ چونکہ غسل خانے میں نہایا دھویا جاتا ہے اور ناپاکی دور کی جاتی ہے اس لئے وہاں قرآن یا قرآنی آیات کا لے جانا ممنوع ہے۔ اللہ کے کلام کو کسی ناپاک جگہ پر نہیں لے جایا جا سکتا۔ غسل خانے کے اندر بلند آواز میں قرآنی آیات پڑھنا بھی ممنوع ہے۔

عورتوں کے لئے چونکہ گھر کا مرکز باورچی خانہ ہوتا ہے اس لئے اسے مکان کے ایسے حصے میں بنایا جاتا ہے جو باہر سے آنے والوں کی نظروں سے دور رہے۔ وہاں مرد مہمانوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سارا خاندان باورچی خانہ میں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ مرد مہمانوں کی خاطر تواضع بیٹھنے کے کمرے میں کی جاتی ہے۔ مہمانوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لڑکے لے کر جاتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے عام طور پر یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔

صرف شادی یا موت کے موقع پر ہی پورا گھر باہر کے لوگوں کے لئے کھولا جاتا ہے۔ اس میں بھی عورتوں اور مردوں کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ عام حالات میں پردہ والے علاقے کا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ مہمانوں کو ادھر نہیں جانے دیا جاتا۔

جو مہمان قریبی عزیز نہیں ہوتے ان کے لئے لازم ہے کہ پہلے آہستہ سے دروازہ پر دستک دیں پھر انتظار کریں۔ انتظار کرتے ہوئے وہ اس طرح ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہوں کہ دروازہ کھلنے پر گھر کے اندر ان کی نظر نہ پڑے۔ مسلمان چار دیواری کے احترام کے لئے قرآن و حدیث کی پابندی کرتے ہیں چنانچہ گھر میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اندر رکھا جاتا ہے۔ کسی گھر کا احترام کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے۔

کوئی مہمان جب اندر داخل ہو جاتا ہے تو احترام کے دوسرے اصولوں کی پابندی شروع ہو جاتی ہے۔ عورتیں تو زنانہ حصے میں چلی جاتی ہیں۔ اور مرد مردان خانے میں۔ مرد مہمان زنانہ حصے کی طرف نظر نہیں کرتے۔ اگر مہمان کسی ایسی جگہ ہوں جہاں عورتیں بھی سامنے ہوں تو عورتیں ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتی ہیں۔

جو خاندان ایک ہی کمرے کے مکان میں رہتے ہیں ان چھوٹی سی جگہ پر کئی خاندان رہتے ہیں ان کے لئے ان اصولوں کی پابندی کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی ایسی جگہ مقرر کرلی جاتی ہے جو صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ یا کمرے کے بیچ میں پردہ ڈال لیا جاتا ہے۔ اس طرح عورتیں الگ ہو جاتی ہیں۔ مرد تو باہر کافی ہاؤس یا ہوٹل وغیرہ میں جا بیٹھتے ہیں لیکن عورتیں گھروں کے اندر ہی رہتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مکان کی حرمت کا خیال نہ رکھا جائے یعنی حرمت کی پابندی کو توڑا جائے تو کیا ہوتا ہے؟ مصر کی حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس خلاف وزی کا ارتکاب عورت کی طرف سے ہو تو اس میں اسے طلاق بھی ہو سکتی ہے۔ اگر مکان کی بے حرمتی اس طرح ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قتل یا موت ہو جائے تو پھر مکان کی حرمت بحال کرنے کے لئے مختلف مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں یہ بھی تصور ہے کہ مکان میں جن بھی آ جاتے ہیں یا وبا پھیل جاتی ہے اور اس مکان کے لوگ متاثر ہوتے ہیں یا اس گھر والوں کو غربت اور افلاس سے نجات نہیں ملتی تو اس کے لئے نحوست دور کرنے کی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔

یورپی مستشرقین عام طور پر اس بات کو زیادہ اچھالتے ہیں کہ مصر کے مکانوں میں مردانہ اور زنانہ حصوں کی تقسیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور عورتیں عام طور پر مردوں سے الگ ہی رہتی ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچوں، بوڑھوں اور نوکروں پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ کھلے عام، مکان کے ہر حصے میں جا سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مصر میں زنانہ حصے میں جسے "حریم" کہا جاتا ہے کوئی غیر مرد داخل نہیں ہو سکتا لیکن عزیز و اقارب کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ پھر صحن ایک ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں کئی خاندان اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

مکانوں کی تعمیر میں مردانہ اور زنانہ حصے کی تخصیص (جو برصغیر پاک وہ ہند کے قدیم مکانوں میں بھی موجود ہے) گھروں کے اندر رہنے والی عورتوں کی زندگی کو یکسانیت، بیزاری اور اکتاہٹ کے سیاہ کمبل میں ہی ہمیشہ لپیٹے رہتی ہے۔ اس لئے تاریخ قاہرہ کے مصنف اسٹینلے لین پول کی اس بات سے بہرحال اتفاق کرنا

پڑے گا کہ "گھروں کے رہنے والے اداس اور یکسانیت سے بھری زندگی گزارتے ہیں۔ بس خوش قسمتی یہ ہے کہ انہیں (اپنی زندگی میں) اس کمی کا شعور نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کی بادشاہی اور رؤسا کی تاریخ پر بھی غور کیا جائے تو محلوں میں زنان خانے اور مردان خانے الگ الگ ملتے ہیں۔ زنانہ محل میں بیگمات' خادمائیں اور کبھی کبھی محل سرا داخل ہو سکتے تھے۔

مردانہ محل میں خواتین کے داخلے کی روایت بہت کم ملتی ہے۔ آج بھی نوابوں کے خاندانوں میں زنان خانے اور مردان خانے کے درمیان ایک سرنگ جیسی دالان ملتی ہے۔ آج کے نواب خاندانوں میں بھی خواتین کو علم ہی نہیں ہوتا کہ مردان خانے میں کون آیا اور کون گیا۔

فن تعمیر میں عورت کے وجود اور جسم کے حصوں کو جس طرح گنبدوں اور محرابوں کی شکل میں استعمال کیا گیا ہے یہ عکاسی عورت کے وجود کے اس توازن کا اظہار ہے کہ جس کے باعث وہ دنیا میں ایک نئے وجود کو جنم دے سکتی ہے اور نو ماہ تک مسلسل ایک باقاعدہ وزن کو اپنے رحم کے اندر محفوظ رکھ کر روزمرہ کے تمام امور سرانجام دے سکتی ہے۔

لاہور کے اندرون شہر میں

عورت مرد ــــ الگ الگ دائرے

☆...... ڈاکٹر انیتا ایم وائز

آپ جب اندرون شہر کی گلیوں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلی نظر میں وہ مردوں کی دنیا دکھائی دیتی ہے باہر سے کوئی بھی آنے والا اسے یہی سمجھتا ہے تیرہ قدیم دروازوں میں گھری یہ آبادی ڈھائی لاکھ انسانوں کی بستی ہے۔ یہاں گلیوں بازاروں' دکانوں اور گھروں کے تھڑوں اور چبوتروں پر آپ کو مرد ہی مرد نظر آئیں گے۔ وہ چائے پی رہے ہوں گے' لسی پی رہے ہوں گے' خالی بیٹھے گپے ہانک رہے ہوں گے یا گھر کے لئے سودا سلف لے جا رہے ہوں گے۔ یہاں ہر چیز نظر آئے گی ایک نظر نہیں آئے گی تو عورت۔

یہاں عورت اور مرد جس طرح اپنے اپنے دائروں میں رہتے ہیں اس سے فاطمہ مرینسی کی (مراکشی محقق) یاد آجاتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "مسلمان عورتوں کے لئے جو دائرہ مقرر کیا جاتا ہے وہ عورت کے لئے ایک خاص تصور کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تصور ہے عورت اور اس کے ذریعہ خاندان کی عزت و عصمت کی حفاظت کرنا۔ اس سے محسوس ہوتا ہے جیسے عورت اور خاندان دونوں ہر وقت خطرے میں ہیں۔ عورت پردے میں رہتی ہے اس طرح وہ مرد کے دائرے سے خارج ہوجاتی ہے۔ یہاں ابھی تک اس عورت کو بے شرم سمجھا جاتا ہے۔ جو روزگار کے لئے گھر سے باہر جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص ایک دوسرے پر نظر رکھتا ہے۔

اندرون شہر عورت اور مرد کے جو دائرے مقرر ہیں وہ لاہور شہر کے دوسرے علاقوں سے مختلف ہیں۔ دوسرے علاقوں میں بڑے بڑے بنگلے ہیں جو باغیچوں اور اونچی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر بنگلے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہی خاندان رہتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے اور کھانے پینے کے کام اپنے لان میں کئے جاتے ہیں یا بنگلوں سے باہر کئے جاتے ہیں۔ یہاں

کوئی ایک دوسرے پر نظر نہیں رکھتا۔

لیکن اندرون شہر کی زندگی میں ایسا ممکن نہیں۔ وہاں کی عورتیں عام طور پر اپنے گھروں کے اندر ہی بند رہتی ہیں اور ان کی سوشل زندگی بھی اندرون شہر تک ہی محدود رہتی ہے۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں انہیں اپنے گھر کے قریب ہی مل جاتی ہیں۔ شادی بیاہ میں بھی انہیں کہیں دور نہیں جانا پڑتا کیونکہ سارے رشتے دار قریب قریب ہی رہتے ہیں۔ لڑکیاں قریب کے سکولوں میں ہی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر بھی نزدیک ہی ہوتے ہیں اور اگر پیر کے مزار پر جانا پڑے تو وہ بھی زیادہ دور نہیں ہوتا۔ حضرت داتا گنج بخش کا مزار بھاٹی دروازہ کے قریب ہی ہے۔ یہاں کی عورتوں نے بتایا کہ وہ اکثر مزار پر حاضری دیتی ہیں۔ اس طرح عورت کی گھریلو اور سوشل زندگی اس دائرہ میں گھومتی رہتی ہے۔ گنجان آبادی بذات خود سوشل کنٹرول کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔ جو عورت اپنے کوچے کے حفاظتی دائرے سے باہر نکلنے کی خواہش رکھتی ہے وہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔

عورت کو گھر کی چار دیواری میں بند رکھنے سے عورت کی پیداواری صلاحیتوں پر بھی بہت اثر پڑا ہے۔ اس آبادی میں عام سماجی زندگی کی طرح کام کرنا، خرید و فروخت کرنا، اور معیشت کے پیداواری عمل میں حصہ لینا مرد کے دائرے میں ہی آتا ہے۔ مردم شماری اور شہری آبادیوں میں معاشی سرگرمیوں سے متعلق جو سرکاری اعداد و شمار ملتے ہیں ان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً 1981ء کی مردم شماری میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کی عورتوں میں سے صرف 5.6 فیصد ہی کوئی روزگار کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں 72.4 فیصد مرد کام کرتے ہیں۔ تمام پاکستان اور پنجاب میں بھی صرف ساڑھے تین فیصد عورتیں ایسی ہیں جو کوئی ایسا کام کرتی ہیں جس میں انہیں کوئی معاوضہ ملے۔ لاہور کی 1981ء کی مردم شماری کے مطابق صرف چار فیصد عورتیں کام کر رہی ہیں یا کام کی تلاش میں ہیں۔ اندرون شہر کے 15 وارڈوں میں جو عورتیں رہتی ہیں ان کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ 1981ء میں اس علاقے کی جو دو لاکھ آبادی تھی اس میں 46.6 فیصد عورتیں تھیں اور ان میں صرف بارہ فیصد ہی خواندہ تھیں۔

لیکن میں نے اندرون شہر جو ریسرچ کی ہے اس سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ وہاں کی عورتیں بہت کم آمدنی کا کام کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی بھی تردید ہوتی ہے کہ یہ عورتیں کام کرنا نہیں چاہتیں۔ انہیں زندہ رہنے کے لئے اس قسم کے کام کرنا پڑتے ہیں اور وہ کرتی بھی ہیں یہ اور بات ہے کہ کئی وجوہ کی بنا پر ان کے کام پر کسی کی توجہ نہیں جاتی یا اسے تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ وہ عورتیں خود بھی اسے محسوس نہیں کرتیں۔

غریب عورتوں کے لئے گھر سے باہر جو کام روایتی طور پر مخصوص کر دیئے گئے ہیں وہ جمعدارنی' نوکرانی' دائی یا اسی قسم کے کام ہیں۔ اب جو عورتیں کام کرتی ہیں وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی عورتوں کی تعداد ہمیشہ کافی رہی ہے جو اپنے گھروں میں کچھ نہ کچھ بناتی رہتی ہیں۔ تاہم اب عورتیں نئے قسم کے کاموں میں زیادہ مصروف ہوگئی ہیں پھر بھی ان کاموں میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے' ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور انہیں جو معاوضہ ملتا ہے وہ مشکل سے ہی ان کی غربت کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔

عورتوں کی محنت جس طرح یہاں سب کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے وہ اس علاقے تک ہی محدود نہیں ہے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں یہی صورت حال ہے۔ تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں عورتیں جن شعبوں میں کام کرتی ہیں وہ معیشت کے اہم شعبے نہیں ہوتے۔ انہیں مردوں کی محنت کے دائرے سے الگ ہی رکھا جاتا ہے اس کا اطلاق لاہور کے اندرون شہر پر بھی کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں کی عورت تیسری دنیا کی عورتوں کے مقابلے میں ایک اور محرومی کا شکار ہے۔ یہ تیسری دنیا کی عورتوں کی طرح سڑکوں پر چھابڑی لگا کر چیزیں نہیں بیچ سکتی۔ اور نہ گلی کوچے میں آواز لگا سکتی ہے۔ یہ جو بھی کام کرتی ہے وہ گھر کے اندر ہی کرتی ہے۔ یہ عام طور پر وہی کام کرتی ہے جو مرد بازار میں کرتے ہیں لیکن یہ گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ دوسرے اسے معاوضہ بھی کم ملتا ہے۔

ماریہ مائیز نے ہندوستان کے شہر نرساپور میں جو ریسرچ کی ہے اس میں اس نے بتایا ہے کہ عورت کے ساتھ خانہ دار خاتون کا تصور ایسا منتھی ہوگیا ہے کہ اس کی معاشی سرگرمیوں کو خاطر میں ہی نہیں لایا جاتا۔ نرساپور اور لاہور کے

اندرون شہر میں عورتیں جو کام کرتی ہیں وہ کسی کو نظر نہیں آتا حتیٰ کہ سرکاری اعداد و شمار میں بھی کہیں اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ مردوں کا طبقہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ لیکن مائیز کا قول ہے کہ نرساپور میں غیرپیداواری کام خاص طور پر تجارت مردوں کے ہاتھ میں جا رہے ہیں اور پیداواری عمل عورت کے پاس آ رہا ہے۔"

اس کے برعکس لاہور میں غیرپیداواری کاموں پر تو مردوں کا قبضہ ہے ہی وہ چھوٹی موٹی دست کاریوں اور دوسرے کاموں میں بھی حصہ بٹاتے ہیں عورتیں اور مرد عملاً ایک ہی جیسا کام کرتے ہیں فرق صرف جگہ کا ہے کہ وہ کہاں کام کرتے ہیں اور انہیں معاوضہ کہاں ملتا ہے؟ مرد بازار میں دکانوں میں کام کرتے ہیں وہاں وہ حجام کی دکان یا کھانے پینے کی دکانوں پر بھی اکٹھے ہوسکتے ہیں۔ لیکن عورت اپنے چھوٹے سے دائرہ کے اندر' اپنی چار دیواری میں ہی کام کرتی ہے۔ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کی بھی حفاظت کرتی ہے اور روزی بھی کماتی ہے۔

ہم نے یونہی ایک سو عورتوں سے ملاقات کی تو انہوں نے بتایا کہ وہ یا تو کوئی کام کرتی ہیں یا کام کرنا چاہتی ہیں اور انہیں کام نہیں ملتا۔ سب سے زیادہ ہنر جو عورتوں کو آتا ہے وہ کپڑے سینا اور کڑھائی کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ فیصد عورتوں نے اعلیٰ تعلیم کو "ہنر" قرار دیا۔ تعلیم کو ہنر اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بعد عورتیں پڑھانے کی ملازمت کرلیتی ہیں یا پرائیویٹ ٹیوشن کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ یہ ہنر صرف عورتوں کی اجارہ داری میں ہی نہیں ہیں۔ تاہم مرد جب یہ کام کرتا ہے تو معاشرے پیداواری عمل میں باقاعدہ شریک ہوجاتا ہے' عورت کو یہ رعایت حاصل نہیں ہے وہ پھر بھی مرد کی غلام ہی رہتی ہے۔ اس کی آمدنی میں کوئی پائیداری نہیں ہوتی۔

اس قسم کے کاموں کے علاوہ باقی عورتیں جو کل آبادی کا نصف ہیں' چھوٹی دستکاریوں میں مشغول رہتی ہیں یہاں بھی عورتیں وہی کام کرتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔ جوتوں کے تلے بناتی ہیں' شادیوں یا مزاروں کے لئے پھولوں یا تلے کے ہار اور سہرے بناتی ہیں' پلاسٹک کے کھلونے بناتی ہیں' سموسے اور پکوڑے تلتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عورتیں اسی کام سے مرد کے مقابلے میں ستر فیصد سے بھی کم پیسے کماتی ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کی بنائی ہوئی ان چیزوں کا انحصار بیچ کے اس آدمی پر ہوتا ہے جو انہیں چیزیں لا کر دیتا ہے اور پھر تیار مال اٹھا کر لے

جاتا ہے۔ بازار میں فروخت کرنے کی ذمہ داری اس بیچ کے آدمی کی ہوتی ہے۔ عورتیں اس آدمی سے (جو ان کے پاس عام طور پر اپنی بیوی کو بھیجتا ہے) معاوضہ یا قیمت بڑھانے کی بات بھی نہیں کرسکتیں کیونکہ وہ انہیں کام دینا بند کردے گا اور ان کے خاندان کی عزت اور ان کی آمدنی دونوں کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ایک نوجوان عورت سلمہ ستارے کا کام کرتی ہے۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ مل کر تین دن میں آٹھ سے دس تک گلے بنالیتی ہے اور اس سے وہ 64 سے 80 روپے تک کمالیتی ہے۔ یہ رقم وہ اپنی ماں کو دے دیتی ہے جو گھر کا خرچ چلاتی ہے۔ ایک بار ان بہنوں نے زیادہ معاوضہ کا مطالبہ کردیا تو بیچ کے آدمی نے جو کام لے کر آتا تھا کام دینا ہی بند کر دیا۔ آخر ایک پڑوسی نے ان کی صلح کرائی اور پرانے معاوضہ پر ہی اس نے پھر کام دینا شروع کیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن بازاروں میں یہ سامان فروخت ہوتا ہے عورتیں وہاں کبھی نہیں جاتیں۔ مثلاً ایک عورت گھر میں سموسے اور پکوڑے بناتی ہے جو اس کی باپ بھائی بازار میں بیچتے ہیں۔ مگر اس عورت نے آج تک وہ دکان نہیں دیکھی جہاں وہ بیچے جاتے ہیں حالانکہ وہ گھر سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ اس کی ماں مرچکی ہے اور اس کی جگہ اس نے لے لی ہے۔ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں بھی کرانی پڑی ہیں۔ وہ گھر کا سارا حساب کتاب رکھتی ہے۔ وہ صبح کو سورج نکلنے کے ساتھ اٹھتی ہے۔ سارے گھر کی صفائی کرتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے کھانا بناتی ہے پھر دکان کے لئے سموسے اور پکوڑے بناتی ہے مگر جب اس سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ کوئی کام بھی کرتی ہے تو کہنے لگی میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتی جس سے میری آمدنی ہوتی ہو۔ اب اس کے بھائیوں کی شادی ہوچکی ہے تو اس کی اپنی حیثیت خاصی مسئلہ بن گئی ہے۔ بھرے پرے خاندان میں وہ صرف اس وجہ سے وقعت رکھتی ہے کہ سموسے بناکر دکان پر بھیجتی ہے۔ اگر وہ یہ کام بند کردے یا خاندان کے افراد الگ الگ ہوجائیں تو پھر اس کا کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

جو عورتیں پڑھاتی ہیں وہ نسبتاً زیادہ آزاد ہوتی ہیں۔ انہیں کپڑے سینے والی، کڑھائی کرنے والی یا دوسرے چھوٹا موٹا کام کرنے والی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ٹیوشن پڑھانے کا جہاں تک سوال ہے

اس میں بھی عورتیں دوسروں کے رحم و کرم پر ہی ہوتی ہیں کہ وہ کتنا دیتے ہیں۔ ایک استانی نے مجھے بتایا کہ تعلیم کے پیشے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہی اسے یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنے کوچے سے باہر چلی جاتی ہے اور کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ دوسری عورتوں کو ایسا کوئی اور معزز پیشہ نہیں ملتا' ہم نے دیکھا کہ جن عورتوں سے ہم ملے ان میں سے چالیس فیصد کے قریب نے آٹھویں جماعت تک یا اس سے زیادہ تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ لیکن ان میں سے اکثر کو یہ احساس نہیں تھا کہ تعلیم سے کمائی بھی کی جا سکتی ہے۔

پڑھانے والی عورتوں کے علاوہ چار قسم کی اور عورتیں بھی اپنے گھر سے باہر نکل سکتی تھیں۔ ایک کسی کاروبار کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ حجام کی دکان میں کام کرتی ہے جہاں صرف عورتیں ہی آتی ہیں۔ دوسری دو عورتیں گھوم پھر کر کپڑا بیچتی ہیں یا سبزی فروخت کرتی ہیں اور چوتھی قریب کی ایک فیکٹری میں سائیکلوں کی نمبر پلیٹوں پر پینٹ کرتی ہے۔ وہاں بھی صرف عورتیں ہی کام کرتی ہیں۔ یہ چاروں عورتیں ایسے کام کرتی ہیں جہاں کوئی مرد انہیں نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ کام کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ حجام کی دکان میں کام کرنے والی کا شوہر نشہ کرتا ہے' کاروبار کرنے والی کا شوہر اسے چھوڑ گیا ہے۔ سبزی بیچنے والی بیوہ ہے اور سائیکل کی فیکٹری والی نے شادی بھی نہیں کی بلکہ اپنے چھوٹے بھائی کی پرورش کی ہے۔ جس کے ساتھ اب وہ رہتی ہے۔ میں دوسری غیر شادی شدہ اور بیوہ عورتوں سے بھی ملی۔ ان میں سے کنواری عورت اپنے ماں باپ یا بھائی کے ساتھ رہتی ہیں اور بیوہ اپنی سسرال میں رہتی ہیں۔

مثلاً مسجد وزیر خاں کے پیچھے محلہ بدوگراں میں ایک بیوہ گزشتہ پچیس سال سے پھولوں کے ہار بنا رہی ہے۔ شادی سے پہلے اس کی لڑکیاں بھی اس میں اس کی مدد کرتی رہی ہیں۔ اسے پھول' دھاگہ اور دوسرا سامان فراہم کیا جاتا ہے اور ایک کلو پھولوں پر اسے دس روپے دیئے جاتے ہیں۔ دن میں وہ بیس کلو تک پھولوں کے ہار گوندھ لیتی ہے۔ جو شخص اسے یہ سامان لا کر دیتا ہے اس کے شہر سے باہر باغ ہیں اور مسجد وزیر خاں کے قریب اس کی دکان ہے۔ اس کوچے میں اس کے لئے پانچ عورتیں کام کرتی ہیں۔ دوسرے دکانداروں کے لئے دوسری

عورتیں کام کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہار بنانا بڑا اچھا کام ہے ایک تو خوشبو بہت اچھی لگتی ہے دوسرے وہ کام بھی کرتی جاتی ہے اور دوسری عورتوں سے باتیں بھی کرتی جاتی ہے۔ مزید آمدنی کے لئے کبھی کبھی وہ اخروٹ کی گری بھی نکالتی ہے لیکن یہ کام اسے اچھا نہیں لگتا۔ اس کی زندگی کے بارے میں تمام فیصلے۔ جیسے بچوں کی پڑھائی یا لڑکے لڑکیوں کے بیاہ کا فیصلہ ـــــ اس کے جیٹھ کرتے ہیں۔ وہ سخت پردہ کرتی ہے اور اپنے جیٹھ سے بہت ڈرتی ہے۔ چونکہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے اس لئے تنہائی میں اس سے بات کرنے کے لئے وہ کسی خاص وقت کا انتظار نہیں کرتی۔ بلکہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہی سنتی رہتی ہے۔

عورتوں اور مردوں کے الگ الگ دائروں کے سلسلے میں ایک اور اہم مسئلہ بچوں کی تعلیم کے لئے برابر کے مواقع حاصل ہونے کا ہے۔ لڑکا تو تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی بھی جگہ اور کتنی ہی دور جاسکتا ہے لیکن لڑکی پر بڑی پابندیاں عائد ہیں۔ وہ بہت دور نہیں جاسکتی۔ اس کے کوچے کے قریب تعلیم کی سہولتیں بہت کم ہیں۔ اندرون شہر میں پرائمری سکول تو ہیں لیکن سیکنڈری یا ہائی سکول نہیں ہیں۔ بہت سی لڑکیوں نے مجھے بتایا کہ یہ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں لیکن وہ گھر سے باہر اتنی دور نہیں جاسکتیں اور گھر کا کوئی مرد اتنا فارغ نہیں کہ ان کے ساتھ جاسکے۔ اس کے علاوہ اندرون شہر سلائی کے سرکاری اور پرائیویٹ سکول تو ہیں لیکن ایسا کوئی ادارہ نہیں جو انہیں وہ ہنر سکھا سکے جس سے وہ گھر میں بیٹھ کر ایسی چیزیں بناسکیں جو سلائی سے زیادہ انہیں پیسہ دے سکے۔

اکثر عورتوں نے مجھے بتایا کہ ان کی معاشی سرگرمیوں کی راہ میں سماجی پابندیاں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ سوال اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کماتی ہے اور لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنتی ہے بلکہ اعتراض کی بات یہ بھی ہے کہ عورت کما کر اپنی مرد کو کھلاتی ہے۔ عورتیں کام کرنے کے خلاف نہیں ہیں بس وہ یہ چاہتی ہیں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔ ایک عورت نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا۔

"لوگ تو عورت کا کام کرنا بالکل ہی پسند نہیں کرتے' چاہے وہ لیڈی ڈاکٹر ہو یا استانی وہ کہتے ہیں ماں باپ بیٹی کی کمائی کھاتے ہیں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ عورت کوئی بھی کام کرے اگر اسے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑتا ہے تو خاندان کے لئے بدنامی کا باعث ہے۔ لڑکی اپنے گھر کے اندر کام کرتی ہے تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔"

مختصریات بارے مصنفین

میریلین فرینچ امریکہ کی مشہور ناول نگار اور فیمنیزم کی بڑی فلسفی اور نظریہ ساز۔ آپ کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ غیر افسانوی کئی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں 1993ء میں ان کا نیا ناول "ہمارے باپ" شائع ہو رہا ہے۔

سوزن گریفین برکلے یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔ اکالوجی آپ کا خاص مضمون ہے۔ دنیا بھر میں اپنے منفرد خیالات کی وجہ سے بہت مقبول مصنف ہیں۔

روتھ ہبارڈ ہارورڈ یونیورسٹی میں بیالوجی کی پروفیسر ہیں اور تحقیق کے شعبے میں خواتین کی بیالوجی پر خصوصی طویل مقالے اور کتابیات پر آپ نے کام کیا ہے۔

میری لوئیس جینسن جیوریٹ

فیمنیزم کی نئی تھیوری بنانے والوں میں اہم نام۔ جرمن ماہر تاریخ اور عمرانیات۔ جدید دور میں سیمون ڈی بوا سے بھی زیادہ مقبول نام۔

ڈاکٹر مبارک علی 1976 میں جرمنی سے "مغل دربار" پر ڈاکٹریٹ کیا اپنے منفرد تحقیقی سٹائل کے باعث بہت مقبول تاریخ دان ہیں۔ آج کل گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر ہیں۔

ڈاکٹر فاطمہ مرنیسی مراکشی سوشیالوجسٹ جن کی تعلیم غیر ممالک میں ہوئی۔ عالمی اداروں کے لئے تحقیقی کام کرتی رہی ہیں۔ گزشتہ 4 سالوں میں عورت بطور سربراہ مملکت کے موضوع پر ضخیم کام کیا ہے۔ رباط یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں۔

ڈاکٹر شاہین سردار علی | پشاور یونیورسٹی میں فیکلٹی آف لا میں ایسوسی ایٹس پروفیسر ہیں۔ قانون اور عورت کے موضوع پر متعدد منفرد مقالے لکھ کر اپنی سوچ کو منوا چکی ہیں۔

ڈاکٹر نوال سعدوی | عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر' ناول نگار اور جارح ماہرِ عمرانیات کی حیثیت سے مانی جاتی ہیں۔ اپنی تخلیقات کے باعث جیل بھی گئیں اور مصر میں ان کی کتابیں ضبط بھی کی گئیں۔

ڈاکٹر رفعت حسن | یونیورسٹی آف لوزیویلی میں مذہبی تعلیم کے شعبے کی چیئرپرسن ہیں۔ منفرد پاکستانی محقق جس نے مذہبی علومیات میں شہرت حاصل کی۔

کیرل کوھن | ہارورڈ میڈیکل سکول کے شعبہ نفسیات میں سینئر ریسرچ سکالر ہیں۔ جامعیت اور حقیقت کے موضوع پر ایک کتاب زیر تکمیل ہے۔

میری نیلسن | سوشل سائیکولوجی میں کیلی فورنیا یونیورسٹی پی ایچ ڈی کی۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں ایک ورکر کی حیثیت سے تجربات یکجا کئے۔ پڑھانے اور ان پڑھ لوگوں سے مکالمے کا نیا انداز ایجاد کیا۔

ٹریساڈی لاریٹس | کیلی فورنیا یونیورسٹی میں شعوری تاریخ کے شعبے میں پروفیسر ہیں۔ 5 کتابوں کی مصنف ہیں۔

شعیب ہاشمی | لنڈن سکول آف اکنامکس سے معاشیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ڈرامہ' ان کی فنی درسگاہ اور شوق ہے۔ پاکستان میں تھیٹر اور پوسٹ تھیٹر کے جدید رجحانات کے بانیوں میں ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے ہیں۔

سلیمی ہاشمی | تجریدی خاتون مصور جس نے فلسطین اور پاکستانی عورت پر سنگساری سے کوڑوں تک کی سزاؤں کو مصور کیا۔ نیشنل

کالج آف آرٹس لاہور میں پڑھاتی ہیں۔

ثروت علی — پیشے کے لحاظ سے سرکاری افسر اور شوق تحقیق، تھیٹر اور موسیقی۔ لاہور میں پوسٹنگ ہے۔

ڈاکٹر صبیحہ حفیظ — منی سوٹا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں ویمن سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں پڑھایا ہے۔ چار کتابوں کی مصنف ہیں۔ آج کل منسٹری آف ویمن ڈویلپمنٹ میں ڈائریکٹر ریسرچ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

شیریں پاشا — ٹیلی فلم اور ٹیلی دستاویزی فلم میں بین الاقوامی سطح پر ایک ماہر ڈائریکٹر کے طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کی تحریر میں ان کا تجربہ بولتا ہے کہ وہ 20 برس پاکستان ٹیلی وژن سے منسلک رہی ہیں۔ آج کل لاہور میں دستاویزی فلم کے پرائیویٹ ادارے کی ڈائریکٹر ہیں۔

سکریتا پال کمار — دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر، شاعر، مصور اور محقق ہیں اس مجموعے میں شامل مقالہ ان کی تین سالہ تحقیق انگریزی، ہندی اور اردو افسانے میں جدیدیت کے موضوع پر لکھی گئی کتاب سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر آصف فرخی — افسانہ نگار، تنقید نگار، آغا خاں کمیونٹی میڈیسن کے شعبے میں متعین ڈاکٹر۔ ترجموں، افسانوں، تنقید اور سفرناموں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر عارفہ سیدہ — 1983ء میں امریکہ سے عقلی تاریخ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا۔ ماہر تعلیم، تدریس سے وابستہ ہیں آج کل ایک کالج کی پرنسپل ہیں۔

حنا جیلانی — وکیل، انسانی حقوق کی پاکستان تنظیم کی اہم رکن۔ عورتوں پر ظلم کے خلاف رضاکارانہ طور مقدمات کی پیروی کی ستائش میں کئی بین الاقوامی اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ دو کتابوں کی

مصنف ہیں۔

فریدہ شہید'خاور ممتاز ماہرین معیشت' لاہور شرکت گاہ کی منتظم' وزیراعظم انعام 1989 یافتہ' ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کے مضامین' کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

حمیر ہاشمی ماہرِ نفسیات' نصابی و دیگر تحقیقی کتابوں کے مصنف لاہور میں مقیم ہیں۔

شہلا ہائری ایرانی نژاد خاتون' کیلی فورنیا یونیورسٹی سے ثقافتی عمرانیات پر ڈاکٹریٹ کی۔ آج کل ہارورڈ یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایٹس ہیں۔

ژواں ایڈورڈ کامیو مذہب اور تاریخ کے ماہر' طویل عرصے تک عرب ممالک میں رہے ہیں۔ آج کل کیلی فورنیا یونیورسٹی میں شعبہ مذہبیات سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر انیتا وائز امریکہ کی یونیورسٹی آف آریگون میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ دیواروں کے اندر دیواریں' اندرون لاہور کے بارے میں ان کی تازہ تحقیق حال ہی میں پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔

بارے مترجمین

مسعود اشعر افسانہ نگار' صحافی' 35 برس سے صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے اور تراجم کی 10 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

شفقت تنویر مرزا صحافی' شاعر' محقق' ماہرِ لسانیات' پنجابی زبان و ادب خاص موضوع' 35 برس سے صحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔

کشور ناہید کی کتابیں

فتنہ سامانیٔ دل (مجموعہ)

سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ

بے نام مسافت

لبِ گویا

خیالی شخص سے مقابلہ

خواتین افسانہ نگار (1930-1990)

عورت خواب اور خاک کے درمیان

زیتون

آجاؤ افریقہ

بری عورت کی کتھا

لیلیٰ خالد

عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک

نئے زمانے کی برہن (کشور ناہید پر مضامین)

میں پہلے جنم میں رات تھی

Women Myth & Realities

The Scream of An Illegitimate Voice

(Selection of Poems)

Rs. 400.00

www.sang-e-meel.com